منتخب عالمی کہانیاں

(جلد اوّل)

انتخاب و ترجمہ

محمود احمد قاضی



اکادمی ادبیات پاکستان

منتخب عالمی کہانیاں

منتخب عالمی کہانیاں

انتخاب وترجمہ

محمود احمد قاضی



دارالترجمہ

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ	:	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	:	ڈاکٹر راشد حمید
انتخاب و ترجمہ	:	محمود احمد قاضی
تدوین و طباعت	:	اختر رضا سلیمی
ٹائٹل	:	سجاد احمد
تعداد کتب	:	1000
سن اشاعت	:	2017
مطبع	:	NUST پریس، اسلام آباد
قیمت	:	-/350 روپے

ISBN: 978-969-472-319-8

Selected International Stories

Selected/Translated by
Mehmood Ahmed Qazi

Publisher

Trnaslation Bureau
Pakistan Academy of Letters
Pitras Bukhari Road,
Sector H-8/1, Islamabad.
Email: ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk
Ph: +92-51-9269714, Fax: +92-51-9269719

فہرست

☆☆☆☆

حرف آغاز

اکادمی ادبیات پاکستان کے قیام کا مقصد جہاں ایک طرف پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترویج و اشاعت ہے وہیں یہ بات بھی اس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ بین الاقوامی ادب کو پاکستانی زبانوں خاص طور پر اردو میں ترجمہ کرائے تاکہ ہماری زبانوں کے علمی و ادبی سرمائے میں اضافے کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادبی قارئین دنیا بھر میں تخلیق ہونے والے ادب سے روشناس ہونے کے ساتھ ساتھ استفادہ بھی کر سکیں۔

انھی باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے گذشتہ سال ہم نے پاکستانی زبانوں سے بین الاقوامی زبانوں اور بین الاقوامی زبانوں سے پاکستانی زبانوں میں تراجم کا جو ایک وقیع منصوبہ تیار کیا تھا اس پر تیزی سے کام جاری ہے۔

منتخب عالمی کہانیاں (جلد اول) اس سلسلے کی نویں کتاب ہے۔اس سے قبل ہم اس سلسلے کے تحت **نوبل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں: ۲۰۰۱ تا ۲۰۱۵ء** (انتخاب و ترجمہ: نجم الدین احمد) **Through the Wall Crack** (عطاء الحق قاسمی کے منتخب کالم ،مترجم: عامر رضوی)، **سندھی وائی رکافی** (مرتب: امیر بخاری) ،**ناول کافن** (میلان کنڈیرا،مترجم: ارشد وحید)، **معاصر چینی کہانیاں** (انتخاب و ترجمہ: منیر فیاض) **وبا کے دنوں میں محبت** (گبریل گارشیا مارکیز مترجم: ارشد وحید)،**ای سی او کے رکن ممالک کی منتخب کہانیاں** (انتخاب و ترتیب: اختر رضا سلیمی) اور **التوائے مرگ** (حوزے ساراماگو،مترجم: مبشر احمد میر) شائع کر چکے ہیں جنھیں آپ کی جانب سے بے حد پذیرائی ملی اور انتہائی قلیل عرصے میں ان میں سے بعض کتابوں کے دوسرے ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ممتاز فکشن نگار اور مترجم محمود احمد قاضی صاحب کی ترجمہ کردہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں اکادمی کے سہ ماہی تحدیدے ادبیات میں بھی شائع ہو چکی ہیں جب کہ زیادہ تر انھوں نے اس کتاب کے لیے خصوصی طور پر ترجمہ کی ہیں۔ چوں کہ مترجم خود اردو کے ایک اہم کہانی کار ہیں اس لیے ان کہانیوں کے ترجمے میں بھی ایک تخلیقی شان دکھائی دیتی ہے۔ بعض کہانیوں پر تو مکمل طور پر طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

منتخب عالمی کہانیوں کے سلسلے کی یہ پہلی جلد ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس عنوان کے تحت ہم عالمی ادب سے انتخاب کا سلسلہ جاری رکھیں تا کہ پاکستانی قارئین عالمی ادب سے زیادہ سے زیادہ روشناس ہو سکیں۔

امید ہے کہ آپ کو حسب سابق ہماری یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

اپنی بات

مجھے شروع سے نفاست، سادگی اور پرکاری سے حد درجہ دلچسپی رہی ہے۔ میں نے لچھے دار باتوں، چرب زبانی اور لایعنیت سے بھی روگردانی کی ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسی چیزوں سے ہمیشہ نخوت کی بو ہی آئی ہے۔ میرے اس گریز کی وجہ شاید چیزوں سے؛ اپنی قریب کی اشیا سے مقدور بھر ایسا خالص رابطہ استوار کرنا ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے مجھے زمین کا وہ نمک درکار ہوتا ہے جس کا میں ہمیشہ سے دلدادہ رہا ہوں۔

میں نے آراستہ پیراستہ تحریروں سے اکتا کر (ان سے قطعی طور پر بے زار نہ ہوتے ہوئے) نہایت آسان (مگر اتنی ہی مشکل) اور سادہ چیزوں سے انسیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ویسے ایسی چیزیں آپ سے خود ہی الفت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں)۔ تحریر میں اختصار اور خاکساری کا عنصر بجائے خود ایک خوبی اور حسن بن جاتا ہے۔ ایسے میں بھی، البتہ منظر کی تہہ داری، سلیقہ مندی اور لازمی ہنر مندی ضروری ہوتی ہے۔ اکہرا پن تحریر کی خوبصورتی کو دھندلا دیتا ہے۔ لکھاری صرف سامنے ہی نہ دیکھتا ہو، پرے جو کچھ ہے، اس پر بھی اس کی نظر ہونی چاہیے۔ یوں اس بیان میں جو تھوڑی سی خشکی، ترشی اور کھردرا پن بھی نمایاں ہو اٹھتا ہے، تو اس سے ہمیں بدکنا نہیں چاہیے کہ زندگی کو خود اپنی آنکھ سے ایک دوسری سطح پر دیکھنا (یعنی زندگی جیسی ہے ویسے ہی اسے دیکھنا، دکھانا نہیں بل کہ اسے کیسا ہونا چاہیے، اس کا بھی تذکرہ ضروری ہوتا ہے) ہی تو ایک لکھنے والے کا اصل منصب ہوتا ہے۔ وہ ہے کہ پیچھے نہیں اور نہیں کے آگے ہے میں سے گزرتا اپنا راستہ بناتا ہے۔ وہ لفظوں کی ذات پات اور چھوت چھات سے اپنا پیچھا چھڑاتا بالآخر لکھت کے ایک ایسے منطقۂ بہاریہ میں داخل ہو جاتا ہے جدھر کے کچھ بول بھی اس کی راہ

میں آسکتے ہیں۔جزاس سے بھی اس کا ٹکراؤ ہوسکتا ہے۔زندگی ایسے ہی مجموعۂ اضداد کا نام ہے۔یہ سیدھی لکیر ہرگز نہیں۔اس میں خاصی کجی ہے۔ٹیڑھ ہے۔نرالا اور انوکھا پن ہے۔خوبی ہے۔حسن ہے۔سیرت ہے۔صورت ہے۔چومکھی جنگ ہے۔حمایت ہے۔علاحدگی ہے۔نفرت اور محبت ہے۔دیوانگی ہے۔فتور ہے۔فتنہ ہے۔حقیقت کو مجاز کی دھند میں سے ہی ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ایسے میں ہمیں چیزوں کے کھوکھلے پن سے خود کو بچانا ہوتا ہے۔یہ پرہیزی ہنر ہمارے لیے ناگریز ہوتا ہے۔چناؤ کا ہی تو مسئلہ ہمیں درپیش رہتا ہے اور یہیں سے ہم اپنی راہ اختیار کرنے پر خود کو تیار پاتے ہیں۔اسٹائل بھی یہی سے جنم لیتا ہے مگر لفظی دہشت گردی اور علم کی دھاک بٹھانے کے نقطۂ نظر سے نہیں۔ایسے ہی،اپنے اردگرد کے لکھنے والوں سے میری دوستی رہی ہے اور ایسے ہی وہ باہر کے لوگ میرے ساتھی بنے جنھوں نے کہ اخلاص کو اپنے سامنے رکھا۔

گارشیا لاطینی امریکہ کے ایک چھوٹے سے ملک کا باشندہ تھا اور اس سے بڑھ کر وہ وہاں کے چھوٹے سے منظرنامے سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔وہ اپنی پیشہ ورانہ صحافتی اقدار سے سرخرو ہوتا ہوا قلم کا مزدور رہا اس نے ساری زندگی اپنے اسی آدرش،لوکیل اور ایسے ہی مواد کو استعمال کیا۔اس نے اپنے پانیوں کا ذکر کیا،جن کا کہ وہ تارو تھا کیوں کہ جو چیز آپ کے برتاؤ اور برتنے میں شامل رہی ہو آپ کو اس سے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔آپ اس کے ساتھ اور وہ چیز آپ کے ساتھ،ہمیشہ انصاف کرتی ہوئی محسوس ہوگی۔اس کا برتاؤ آپ کے ساتھ مربیانہ نہیں،مشفقانہ،دوستانہ اور محبّ و محبی والا ہوگا۔نجیب محفوظ نے خود کو ہمیشہ قاہرہ اور اس کے قرب و جوار (یہاں میں نے مضافات کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا کہ ادب میں مضافات نہیں ہوتے) تک محدود رکھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے ان گلی کوچوں سے باہر آ کر انھیں نظرانداز کر کے،دوسری اجنبی سرزمینوں کی تفاصیل میں اپنے آپ کو کھپا دے گا،انھیں بیان کرے گا تو ان سے انصاف نہ کر پائے گا اور پھر اس طرح ایک جعلی پن سا اس کی تحریروں میں نمودار ہوگا جیسے کہ پیشہ ور نام نہاد سفرنامہ لکھنے والوں کی تحریروں میں در آتا ہے۔وہ ساری زندگی میں میں ہی کرتے رہ جاتے ہیں (خیال رہے کہ یہاں تخلیقی فنکاروں،جینوئن لکھاریوں کی بات نہیں ہو رہی) نجیب

کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے مجھے اب بھی اکثر قاہرہ کے بازار میں یوسف کے خریداروں کا ہجوم نظر آجاتا ہے۔ ناموری یوں ہی نہیں ملتی، اس کے لیے آپ کو پتا پانی کرنا پڑتا ہے۔ کچھ اچھا حاصل کرنے کے لیے، بہت سارا نفع بخش توشہ تج دینا پڑتا ہے۔

لاطینی امریکی لکھاریوں کے بعد، اس بار اپنے دیس سے باہر، جن لکھاریوں سے میرا واسطہ پڑا ہے بل کہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جن تحریروں سے میری جان کاری ہوئی ہے وہ زیادہ تر زندہ رہنے والی لکھتیں ہیں۔ مختلف منطقۂ ہائے زمین سے متعلقہ ذائقے آپ کے سامنے ہیں۔ جو لوگ محض لفظ گری کو ہی اپنا ادبی ایمان سمجھ بیٹھے ہیں، یہ تحریریں ان کے لیے آئی اوپنر ہوسکتی ہیں۔ وہ دیکھیں کہ یہ مخلص تحریریں کیسے کیسے گلاب کھلاتی نظر آتی ہیں۔ ملاچی ملاچی وائٹیکر (جسے کیتھرین منسفیلڈ کے پائے کی لکھاری کہا گیا اور جس نے 1939 میں از خود لکھنے سے باقاعدہ ریٹائرمنٹ لے لی تھی) کا میوزک باکس ایک کسک، ایک چھلتر بن کر آپ کو تنگ کرے گا۔ (بالکل ایسے ہی جب آپ کونتزیلز کی کہانی ''نمک کی روٹی'' سے ہوگزریں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ بھوک کیسے مثبت آدابِ زندگی اور خاص طور پر محبت کو بھی نگلتے ہوئے نہیں ہچکچاتی) جو افسانہ یا کہانی تنگ نہ کرے۔ ایک بار پھر نہ پڑھنے پر اکسائے بھلا کوئی لکھت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کتاب میں چند ایسی چیزیں ضرور پڑھنے کو مل جائیں گی، جو آپ کے اندر ایک عجیب طرح کی اکساہٹ کو جنم دیں گی۔ جھنجوڑنے جیسی کیفیت اگر نہ بھی پیدا ہو تو بھی یہ تحریریں آپ سے چند لازمی سوالات ضرور کرتی نظر آئیں گی اور یہی ان کی تہذیبی خوبی ہوگی۔ ترجمہ میرے نزدیک ایک زمین کے خارج سے دوسری اجنبی زمین کے دل میں اترنے کے مترادف ہے۔

محمود احمد قاضی

لوئیسا ویلن زیولا

رات کا گھوڑا

دروازے کی گھنٹی بجی۔ پہلے تین چھوٹی گھنٹیاں اور پھر ایک زیادہ بڑی گھنٹی۔ یہ اشارہ تھا اور میں تھوڑا سا ڈری اور ناراض سی ہو کر اٹھ بیٹھی۔ یہ وہ لوگ بھی ہو سکتے تھے اور تب دوبارہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ رات کے ان بے کرم لمحات میں یہ ایک پھندا بھی ہو سکتا تھا۔

وہ تیزی سے اندر آیا اور اس نے مجھے گلے لگانے سے پہلے، اپنے پیچھے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اپنے رویے میں اتنا محتاط تھا کہ اس نے سب سے پہلے، اپنے اور میرے آخری درجے کے حامل حفاظتی نظام کو چیک کیا۔ پھر اس نے مجھے بھینچنے کے انداز میں نہیں، بس ایسے ہی بغیر کوئی الفاظ ادا کیے ہوئے، اپنے بازوؤں میں لے کر ہماری اس نئی ملاقات کے تمام تر جذبات کو انڈ جانے دیا۔ اس نے اسی انداز میں مجھے اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے آہستہ آہستہ سے چومنے کے انداز میں سب کچھ کہہ دیا۔ میں سوچتی ہوں کہ اسے کبھی الفاظ میں اتنا یقین نہیں رہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھا اور چوما چاٹی کی شکل میں تمام پیغامات مجھ تک پہنچا رہا تھا۔

آخر کار ہم دونوں نے کسی بھی فوکس کے بغیر ایک دوسرے سے آنکھیں نہ ملاتے ہوئے سر سے پاؤں تک، ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے، پیچھے کی طرف قدم بڑھائے اور میں ان تمام مہینوں کی کسی حیرانی کے باوجود، مگر اس کو ظاہر کیے بغیر بہ مشکل اسے ہیلو کہہ پائی، جب کہ مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ تب کہاں پر ہو سکتا ہے اور میں اسے یہ کہنے کے قابل ہوئی کہ:

میں سوچتی تھی کہ تم شمال کی جانب لڑنے میں مصروف تھے
میرا خیال تھا شاید تم پکڑے گئے ہو
میرے خیال میں تم کہیں چھپے ہوئے تھے
میری سوچ یہ بھی تھی کہ تمھیں اذیت دینے کے بعد مار دیا گیا ہے

کئی طریقوں سے اسے بتاتے ہوئے، میں اس کے متعلق سوچ رہی تھی، میں نے اس کے

متعلق محسوس کرنے اور سوچنے کو ترک نہ کیا۔ جیسے یہ کہ مجھے نظر انداز کیا گیا تھا اور ادھر وہ تھا ویسا ہی اچھا، وہی محتاط ملامتی، ویسا ہی اپنے عمل کا ماہر۔

''خاموش، شکلیتا! تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم نہ جان پاؤ کہ میں کہاں تھا۔''

تب اس نے اپنا خزانہ، طاقتور اشارے (سراغ) وغیرہ کی شکل میں، مجھ پر عیاں کیا جو بعض اوقات وہ مجھ سے چھپا جاتا تھا۔ کچاکا کی ایک بوتل اور گال کوسٹا کا ریکارڈ۔ وہ ہرازیل میں کیا کرتا پھر رہا تھا؟ وہ آگے کیا کرنے جارہا تھا؟ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہوئے، کیا چیز اسے واپس لے آئی تھی؟ جب کہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے سوالات کرنے بند کر دیے۔ (خاموش، شکلیتا۔ اس نے کہا) وہ کہہ رہا تھا، شکلیتا ادھر آؤ اور میں نے فکرمند نہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے، اس کو دوبارہ پا لینے کی خوشی میں سما جانے کو ترجیح دی۔ آنے والے کل کو ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور وہ دن جو اس کے بعد آنے والے تھے۔

کچاکا ایک اچھی شراب ہے۔ یہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے تمام صحیح راستوں پر حرکت کرتی ہے اور تب ان کونوں تک جا کر رک جاتی ہے، جنھیں گرم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گال کوسٹا کی آواز میں تپش ہے۔ وہ ہمیں اپنی آواز کے حصار میں لے لیتی ہے اور ہم کسی قدر رقص کرتے ہوئے اور قدرے تیرتے ہوئے بستر پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہم لیٹے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھوں کی گہرائی میں اُتر کر ایک دوسرے کو دیکھے جاتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے فی الحال خالص احساسات کو اپنے اندر سرایت کرنے کی اجازت نہ دیتے ہوئے، چوما چاٹی کو جاری رکھتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو، دوبارہ سے دریافت کرنے اور پہچاننے کی کوشش جاری رکھتے ہیں۔

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہوں: ''مبیٹو'' مجھے معلوم ہے کہ یہ اس کا اصل نام نہیں ہے۔ لیکن بس یہی ایک نام ہے، جس کے حوالے سے، میں اسے اونچی آواز میں پکار سکتی ہوں۔ وہ جواب دیتا ہے: ''ہم کسی اور موقع پر ایسا کریں گے شکلیتا۔ لیکن اس وقت ہمیں باتیں نہیں کرنا چاہییں۔'' چلو ایسے ہی ٹھیک ہے۔ یہی بہتر ہے اگر وہ اس بات چیت کا آغاز نہیں کرتا کہ ایک دن شاید ہم ایسا کر ہی پائیں گے تا کہ ہم دونوں اس وقت، بالکل اکیلے جو معجزاتی لمحات پانے والے تھے، ان کو ضائع نہ ہونے دیں۔

اچانک گال سٹا ریکارڈ پلیئر کے اندر گانے لگتی ہے ''A noite eu so teu cavalo''

میں آہستگی سے اس کا ترجمہ کرتی ہوں: ''آج کی رات میں تمھارا گھوڑا ہوں۔'' تا کہ اسے اپنے سحر

میں گرفتار کرتے ہوئے، دوسری چیزوں کے متعلق، سوچنے سے روک دوں۔ میکمبا کی طرح یہ ایک صوفیانہ نغمہ ہے۔ وہ کوئی جو بے خودی کی، اس حالت میں ہے۔ اس کا کہنا ہے: یہ اس روح کا گھوڑا ہے، جو اس پر سواری کر رہی ہے۔ یہ اس کی زینت ہے۔

''شکیتا! تم ہمیشہ ہی مخفی عقیدے اور جادو کے حامل خیالات کی رو میں بہہ نکلتی ہو۔ تم صحیح طور پر جانتی ہو کہ وہ روح کے بارے میں بات نہیں کر رہی ہے۔ اگر آج کی رات تم میرا گھوڑا ہو تو اس لیے کیوں کہ میں تم پر سوار ہوں۔ اس طرح۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔ ایسے۔ اور بس۔''

یہ سب کچھ لمبے عرصے والا، گہرا، بے آہنگ اور اتنی پیار بھری سپردگی والا تھا کہ ہم دونوں آخر میں تھک گئے تھے۔ میں اس کے اوپر پڑے ہوئے سو گئی۔

آج کی رات میں تمھارا گھوڑا ہوں۔

میں ایک گہرے کنوئیں میں ہلکورے لے رہی تھی کہ اس شیطانی فون نے مجھے باہر کھینچ لیا۔ جاگنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے، میں سوچتی ہوئی فون تک آئی کہ یہ بیٹو ہوگا، یقیناً، کیوں کہ وہ اس وقت بستر میں میرے ساتھ نہیں تھا، یقیناً، اپنی اسی عادت کو اپنائے ہوئے کہ وہ مجھ سے ایک لفظ بھی کہے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے مجھے نیند کی حالت میں چھوڑ جاتا تھا۔ میرے تحفظ کے لیے، وہ کہتا ہے۔

لائن کی دوسری طرف، ایک آواز تھی، میرے خیال میں آندرے جیسی، کوئی ایک وہ جسے ہم آندرے کہہ کر بلاتے تھے۔ اس نے مجھے بتانا شروع کیا۔ ''انھوں نے دریا کے دوسرے کنارے کے قریب بیٹو کو مردہ حالت میں بہتا ہوا پایا۔ لگتا ہے کہ انھوں نے چھرے سے وار کر کے اسے زندہ حالت میں ہی ادھر پھینک دیا۔ وہ پانی میں چھ دن رہنے کی وجہ سے پھولا ہوا اور مسخ شدہ حالت میں تھا لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ یہ وہی تھا۔''

''نہیں، یہ بیٹو نہیں ہو سکتا۔'' میں بے احتیاطی کے ساتھ چلائی۔

اچانک آواز آندرے جیسی نہ رہی۔ میں نے اسے غیر شخصی اور اجنبی محسوس کیا۔

''کیا تمھارا یہ خیال ہے؟''

''کون بول رہا ہے۔ میں نے تب ہی یہ پوچھنے کا سوچا تھا لیکن عین اسی لمحے فون بند ہو گیا۔

دس یا شاید پندرہ منٹ؟ پتا نہیں کتنی دیر تک میں احمقوں کی طرح فون کو گھورتی رہی تھی کہ پولیس آ گئی۔ مجھے ان کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ لیکن پھر دوبارہ، میں ایسا کیوں نہیں سوچ سکتی تھی؟ ان

کے ہاتھ مجھے ٹٹول رہے تھے۔ان کی آوازیں مجھے ڈرا رہی تھیں اور میری بے عزتی کر رہی تھیں۔گھر کی تلاشی لی گئی۔انھوں نے ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔لیکن میں پہلے ہی سے جانتی تھی۔سو مجھے اس سے کیا لینا دینا تھا کہ انھوں نے ہر ٹوٹ جانے والی چیز کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور میرے ڈریسر کو بھی توڑ پھوڑ دیا تھا۔

انھیں کچھ بھی نہ ملا۔میری واحد ملکیت میرا ایک خواب تھا اور وہ اس طرح مجھے میرے خوابوں سے محروم نہیں کر سکتے تھے۔اس رات والا میرا خواب جب بیٹو ادھر میرے پاس تھا اور ہم ایک دوسرے کی محبت میں مدغم تھے۔میں نے خواب دیکھا،اس کا ایک ایک جزو دیکھا۔مجھے پکا یقین تھا کہ میں نے اس کو،اس کی ساری تفصیلات حتیٰ کہ اس کے تمام تر خصائص کے ساتھ دیکھا تھا۔اور خواب پولیس کا مسئلہ نہیں ہوتے۔

انھیں حقیقت چاہیے ہوتی ہے یعنی انھیں ٹھوس حقائق کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسی کوئی چیز میں انھیں بالکل بھی فراہم نہیں کر سکتی تھی۔

وہ کہاں ہے،تم نے اسے دیکھا ہے؟ وہ یہاں تھا تمھارے ساتھ۔وہ کہاں چلا گیا؟ بولو ،نہیں تو بعد میں تمھیں افسوس ہو گا۔ہم نے سُنا،تم گا رہی تھیں۔کُتیا ہمیں معلوم ہے وہ تمھیں ملنے آیا تھا، وہ کہاں ہے،اور کہاں چھپا ہے؟ وہ شہر میں ہی ہے،شاباش،اگل دو۔ہم جانتے ہیں وہ تمھارے حصول کے لیے آیا تھا۔

میں نے مہینوں سے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔میں نے اس کی طرف سے کچھ نہیں سنا۔وہ بھاگ گیا اور انڈر گراونڈ ہو گیا۔مجھے کیا پتہ کہ وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گیا یا کسی اور ملک میں ہے۔میں کیسے جان سکتی ہوں۔اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔مجھے اس سے نفرت ہے۔مجھے کچھ معلوم نہیں۔

(چلو شروع کرو،اپنے سگریٹوں سے مجھے جلاؤ،مجھے اپنی خواہش کے مطابق تم سب ٹھوکریں مارو،مجھے دھمکاؤ،آگے بڑھو،مجھ پر چوہے چھوڑ و،جو مجھے اندر اور باہر سے کھانے لگیں۔میرے ناخن اُکھاڑو،کرو جیسے تم چاہتے ہو۔کیا میں اس کے لیے صلح کرلوں؟ کیا میں تمھیں بتادوں کہ وہ یہاں میرے ساتھ تھا۔جب ایک ہزار سال پہلے اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا؟)

میں انھیں اپنے خوابوں کے متعلق بتانے والی نہیں ہوں۔وہ کیوں پروا کریں؟ میں نے اس نام نہاد بیٹو کو چھ ماہ سے زیادہ عرصے سے نہیں دیکھا اور مجھے اس سے محبت تھی۔وہ شخص بس غائب ہو گیا۔

میں اسے صرف اپنے خوابوں میں دیکھتی ہوں اور یہ بُرے خواب ہوتے ہیں جو کہ اکثر ڈراؤنے خواب بن جاتے ہیں ۔

بیٹو، تم اب جانتے ہو، اگر یہ سچ ہے کہ انھوں نے تمھیں ماردیا ہے اور تم جہاں کہیں پہ بھی ہو۔ بیٹو میں تمھاری رات کا گھوڑا ہوں اور جہاں کہیں بھی تم چاہو گے، میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ میں جیل میں ہوں، بیٹو، اب جب کہ میں جیل میں ہوں، میں جانتی ہوں کہ اس رات میں نے تمھارا خواب دیکھا تھا۔ یہ محض ایک خواب تھا۔ اور اگر کسی خودروموقع کی وجہ سے، وہاں میرے گھر میں گال کو سٹار کا ریکارڈ اور کچا کا کی آدھی بوتل موجود تھی تو میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں اپنی ناموجودی میں اُن کے لیے وصیت کروں گی۔

☆☆☆☆

ریمنڈ کارور

موٹا

میں اپنی دوست ریٹا کے ساتھ بیٹھا کافی اور سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اور میں اسے اس کے متعلق بتا رہا ہوں۔

جو کچھ میں نے اسے بتایا ہے وہ حسب ذیل ہے:

یہ ایک سُت روبدھ کی شام ہے تب ہرب نے اس موٹے شخص کو، میرے کیفے میں لا بٹھایا۔
یہ ان تمام موٹوں سے زیادہ موٹا ہے، جنھیں میں نے آج تک دیکھا ہے۔ ویسے یہ دیکھنے میں اچھا لگتا ہے اور اس نے لباس بھی عمدہ پہن رکھا ہے۔ اس سے متعلق ہر چیز سائز میں بڑی ہے لیکن یہ اس کی انگلیاں ہیں، جنھیں میں نے اپنی یاد میں اچھی طرح محفوظ کر رکھا ہے۔ جب میں اس عمر رسیدہ جوڑے کو دیکھتے ہوئے اس کی میز کے پاس رکتا ہوں، تو میں اس کی انگلیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ وہ لمبی، موٹی اور چکنی انگلیاں ہیں اور ان کا سائز ایک نارمل شخص سے تین گنا زیادہ ہے۔

میں دوسری میزوں کی طرف جاتا ہوں۔ ان میں چار لوگوں کی؛ یعنی تاجر پیشہ لوگوں کی، ایک ٹکڑی ہے جو اپنی مطلوبہ چیزوں کی شدت سے طالب ہے۔ چار لوگ اور بھی ہیں، ان میں تین مرد اور ایک عورت شامل ہے اور وہ بوڑھا جوڑا۔ لینڈر نے موٹے آدمی کو پانی لا کر دے دیا ہے اور میں اس تک پہنچنے سے پہلے، اسے وافر وقت دینا چاہتا ہوں تا کہ وہ اپنا ذہن بنا لے۔

شام بخیر، کیا میں آپ کے لیے کچھ لاؤں؟ میں کہتا ہوں۔

ریٹا، وہ بڑا تھا میرا مطلب بہت بڑا۔

شام بخیر، اس نے کہا: ہاں۔ میرا خیال ہے ہم کچھ منگوانے کے لیے اب تیار ہیں۔

تم نے جانا کہ اس کے کہنے کا یہ کیسا عجیب انداز ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ زیادہ تر پھنکارنے جیسی آواز نکالتا ہے۔

میرا خیال ہے ہمیں سبز سلاد سے آغاز کرنا چاہیے۔ اور اس کے بعد سوپ کا ایک پیالہ اور

اس کے ساتھ روٹی اور مکھن بھی ۔اگر ممکن ہو تو میمنے کا قیمہ بھی ہونا چاہیےاور کریم کے ساتھ تنور کے پکے آلو بھی ۔میٹھی چیز کے بارے میں ہم بعد میں سوچیں گے ۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے مینو پکڑا دیتا ہے ۔

اوخدایا، ریٹا۔کیاانگلیاں تھیں ۔

میں کچن کی طرف جاتا ہوں اور روڈی کو آرڈر کے بارے میں بتاتا ہوں ۔ وہ منہ بناتا ہے ۔تم روڈی کو جانتی ہو۔کام کرتے وقت وہ ایسا ہی دکھتا ہے ۔

جب میں کچن سے برآمد ہوتا ہوں تو مارگو، میں نے تمھیں مارگو کے بارے میں بتا رکھا ہے۔وہی جو روڈی کے تعاقب میں رہتا ہے مارگو مجھ سے کہتا ہے تمھارا یہ موٹا دوست کون ہے؟ وہ حقیقتاً موٹا ہے ۔

اب یہ اسی کے متعلق ہے ۔ میں سوچتا ہوں یہ یقیناً اسی کے متعلق ہے ۔

جب میں سیزر سلاد، اس کی میز پر لاتا ہوں تو وہ مجھے روٹی پر مکھن لگا کر ایک طرف رکھتے ہوئے ،میری ہر حرکت کو بغور جانچتا ہے۔اس سارے وقت میں وہ پھنکارنے جیسی آوازنکالتا رہتا ہے ۔ میں خود کو کسی اور طرف مگن پاتا ہوں ۔ میں اس کا پانی والا گلاس گرا دیتا ہوں ۔

مجھے افسوس ہے ۔ میں کہتا ہوں ۔ جب آپ کسی کام میں جلدی کر رہے ہوں تو تب ایسا ہو جاتا ہے ۔بہر حال مجھے افسوس ہے۔سب کچھ ٹھیک ہے ناں؟ میں ابھی لڑکے کو صفائی کے لیے کہہ دیتا ہوں ۔

ارے کوئی بات نہیں ۔ وہ کہتا ہے ۔سب ٹھیک ہے ۔ وہ پھنکارتا ہے ۔فکر نہ کرو ۔ہم نے برا نہیں مانا ۔وہ مسکراتا ہےاور جب میں لینڈر کی طرف جارہا ہوتا ہوں تو وہ ہوا میں ہاتھ لہراتا ہےاور جب میں اس کی میز پر سلاد لاتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ اس آدمی نے تب تک ساری روٹیاں اور مکھن کھالیا ہوتا ہے ۔

تھوڑی دیر بعد، جب میں اس کے لیے اور روٹی لاتا ہوں، تب تک وہ سلاد ختم کر چکا ہوتا ہے ۔تم سیزر سلاد کے سائز سے متعلق تو جانتی ہی ہو؟

تم بہت اچھے ہو ۔وہ کہتا ہے ۔روٹی بہت مزے دار ہے ۔

شکریہ ۔ میں کہتا ہوں ۔

یہ بہت اچھی ہے ۔ وہ کہتا ہے ۔اور ہم ایسا ہی سمجھتے ہیں ۔ہمیں اس روٹی جیسا مزہ کبھی نہیں آیا ۔

آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟ میں اس سے پوچھتا ہوں ۔ مجھے یقین ہے ،اس سے پہلے میں نے آپ کو نہیں دیکھا وہ ایسا شخص نہیں ہے، جسے آپ بھول جائیں ۔ریٹا آہستگی سے ہنستی ہے ۔

ڈینوزوہ کہتا ہے ۔

میں اس موضوع سے متعلق اور کچھ نہیں کہتا ۔حالاں کہ میں متجسس ہوں ۔

جناب ،آپ کا سوپ چند منٹوں میں آپ تک پہنچ جائے گا ۔یہ کہتے ہوئے ، میں ان چار تاجر پیشہ لوگوں کی جانب بڑھ جاتا ہوں، جو اپنے آرڈر کے سلسلے میں نہایت پر جوش ہیں ۔

جب میں اس کا سوپ سَرو کرتا ہوں تو روٹی غائب ہو چکی ہوتی ہے ۔ وہ روٹی کا آخری ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال رہا ہوتا ہے ۔

یقین کرو ہم ہر وقت ایسا کچھ نہیں کھاتے ۔وہ کہتے ہوئے پھنکارتا ہے ۔ مجھے توقع ہے آپ اس بات کو نظر انداز کر دیں گے ۔

مہربانی کر کے آپ کسی چیز کا خیال نہ کریں ۔ میں خوش خوراک آدمی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں ۔

میں نہیں جانتا کہ آپ اس سب کو کیا کہیں گے ۔وہ پھنکارتا ہے ۔وہ اپنے نیپکن کو آراستہ کرتا ہے ۔پھر وہ اپنا چمچ اٹھاتا ہے ۔

اوہ میرے خدایا ۔وہ بہت موٹا ہے ۔لینڈر کہتا ہے ۔

اسے اس پر اختیار نہیں ۔سو اپنا منہ بند رکھو ۔ میں کہتا ہوں ۔

میں مزید مکھن اور روٹی ایک ٹوکری میں رکھ کر لاتا ہوں ۔سوپ کیسا تھا ؟ میں پوچھتا ہوں ۔

شکریہ ۔۔۔۔اچھا، بہت اچھا ۔ وہ اپنے ہونٹ پونچھتا ہے اور اپنی ٹھوڑی کو تھپتھپاتا ہے ۔کیا تمھارے خیال میں ادھر کچھ گرمی سی محسوس ہو رہی ہے یا مجھے ہی لگ رہی ہے ۔وہ کہتا ہے ۔

نہیں ۔یہاں گرمی ہو رہی ہے ۔ میں کہتا ہوں ۔

ہو سکتا ہے ہم اپنا کوٹ اتار دیں ۔وہ کہتا ہے ۔

ٹھیک ہے آپ ایسا ہی کریں ۔آدمی کو سہولت میں ہونا چاہیے ۔ میں کہتا ہوں ۔

یہ صحیح ہے ۔یہ بالکل ، بالکل صحیح ہے ۔وہ کہتا ہے ۔

لیکن میں تھوڑی دیر بعد ،اسے دیکھتا ہوں تو بھی اس نے اپنا کوٹ پہن رکھا ہوتا ہے ۔

میری بڑی پارٹیاں اس وقت فارغ ہو چکتی ہیں اور وہ بوڑھا جوڑا بھی جا چکا ہوتا ہے ۔جگہ

خالی ہو رہی ہوتی ہے۔ عین اسی وقت میں اس موٹے شخص کو قیمہ اور تنور میں پکے آلو سَرو کر رہا ہوتا ہوں۔ مزید روٹی اور مکھن کے ساتھ۔ اب وہی ایک ہے، جو ادھر رہ گیا ہے۔

میں آلوؤں پر مزید کھٹّی کریم انڈیلتا ہوں۔ میں اس کے لیے مزید روٹی اور مکھن لاتا ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہے ناں؟ میں کہتا ہوں۔

بہت عمدہ، وہ کہتا ہے اور پھنکارتا ہے۔ شان دار، شکریہ، وہ کہتے ہوئے پھر پھنکارتا ہے۔

آپ اپنے ڈنر سے لطف اندوز ہوئے۔ میں کہتا ہوں۔ میں اس کے چینی دان کا ڈھکن اٹھاتا ہوں اور اس میں جھانکتا ہوں۔ میں جب تک وہاں سے ٹل نہیں جاتا وہ سر ہلاتے ہوئے مجھے دیکھتا رہتا ہے۔

میں جانتا ہوں، میں کسی چیز کا متلاشی تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ کس چیز کا۔

وہ کھانے کا ڈرم کیا کر رہا ہے؟ وہ تو جسم سے تمھاری ٹانگیں علاحدہ کر دینے پر تُلا ہے، ہیریٹ نے کہا۔ تم ہیریٹ کو جانتی ہی ہو۔

میٹھے میں۔ میں موٹے آدمی سے کہتا ہوں، ہمارے پاس گرین لینڑن اسپیشل ہے جو کہ چٹنی والا پڈنگ کیک ہے۔ یا پھر ہمارے پاس چیز کیک ہے اور یا پھر ونیلا آئس کریم یا اناس کا شربت ہے۔

کہیں ہم آپ کا زیادہ وقت تو نہیں لے رہے؟ وہ پھنکارتے ہوئے کسی قدر فکرمندی کے ساتھ کہتا ہے۔

بالکل نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ بے شک نہیں۔ آپ اپنا وقت لیں۔ جب تک آپ کسی فیصلے پر پہنچتے ہیں تب تک میں آپ کے لیے کافی لے کر آتا ہوں۔

ہم آپ کے ساتھ ایمان داری برتیں گے۔ وہ کہتا ہے اور کرسی پر پہلو بدلتا ہے۔ ہم اسپیشل کو ہی پسند کریں گے لیکن ساتھ ہی ہمیں ونیلا آئس کریم ڈش بھی چاہیے ہوگی۔ جس میں قطرہ بھر چاکلیٹ سیرپ بھی ہو۔ اگر آپ کی عنایت ہو تو۔ ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔

میں کچن کی طرف جاتا ہوں تاکہ اس کے میٹھے کی فرمائش کو خود سے پورا ہوتے دیکھ سکوں۔

روڈی اور ہیریٹ کہتے ہیں۔ تم اس موٹے آدمی کو یہاں کسی سرکس سے لے آئے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟ روڈی نے اپنا ایپرن اور ہیٹ اتار دیا ہے۔ اگر تم سمجھ سکو کہ میرا کہنے کا کیا مطلب ہے۔ روڈی، وہ موٹا ہے۔ میں کہتا ہوں لیکن یہ مکمل کہانی نہیں ہے۔

روڈی قہقہہ لگاتا ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ میٹھی چیز سے رغبت رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

بہتر ہے روڈی کہ تم دیکھتے رہو۔ جون، جو اس لمحے کچن میں داخل ہوتا ہے، کہتا ہے۔

روڈی، جون سے کہتا ہے۔ میں حسد میں مبتلا ہو رہا ہوں۔

میں اسپیشل کو موٹے آدمی کے سامنے رکھتا ہوں اور ونیلا آئس کریم کا پیالہ بھی کہ جس کے ایک طرف چاکلیٹ سیرپ ہے۔

شکریہ، وہ کہتا ہے۔

ہم آپ کو ویلکم کرتے ہیں، میں ایک خاص قسم کے تاثر کے ساتھ کہتا ہوں۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں ہم نے آج تک ایسا کھانا نہیں کھایا۔ وہ کہتا ہے۔

میں کھاتا ہوں، کھاتا ہوں اور کھائے چلا جاتا ہوں ۔ میں کہتا ہوں ۔ میں مزید لینا چاہوں گا نہیں، وہ کہتا ہے۔ اگر ہمارا کوئی چناؤ ہو۔ لیکن یہاں تو مرضی کی تو بات ہی نہیں ہے۔ تب وہ اپنا چمچ اٹھاتا ہے اور کھانے لگتا ہے۔

اس کے علاوہ کیا؟ ریٹا میرا سگریٹ سلگاتے ہوئے اور کرسی کو میز کے قریب لاتے ہوئے کہتی ہے۔

کہانی بہت دلچسپ ہوتی جا رہی ہے اب۔ ریٹا کہتی ہے۔

بس یہی سب کچھ ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ وہ اپنا میٹھا کھاتا ہے۔ پھر وہ چلا جاتا ہے۔ اور تب ہم گھر کی طرف لوٹتے ہیں۔ میں اور روڈی۔

ایک موٹا، روڈی اپنے جسم کو پھیلاتے ہوئے کہتا ہے اور ایسا وہ اس وقت کرتا ہے، جب وہ تھکا ہوا ہو۔ تب وہ ہنستا ہے اور پھر ٹی وی دیکھنے لگتا ہے۔

میں چائے کے لیے پانی ابلنے کو رکھتا ہوں اور نہاتا ہوں۔ میں اپنے مرکز پر اپنا ہاتھ رکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اس وقت کیا ہوگا، جب میرے بچے ہوں گے اور ان میں سے، ایک ایسا ہی ہوگا، بہت موٹا۔

میں چائے دانی میں پانی ڈالتا ہوں، پیالیوں کو ترتیب دیتا ہوں، چینی دان رکھتا ہوں۔ آدھی آدھی سفید ٹکیہ اور ٹرے روڈی کی جانب لے جاتا ہوں۔ جیسے کہ وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ روڈی کہتا ہے۔ میں ایک موٹے شخص کو جانتا ہوں، موٹے لوگوں کے ایک جوڑے کو، اصلی موٹے لوگ، جب کہ

میں ایک بچہ تھا۔ وہ گول مٹول تھے، بخدا مجھے ان کا نام یاد نہیں۔ مونا، بس یہی ایک نام تھا جو اس بچے کا تھا۔ ہم اسے مونا کہہ کر بلاتے تھے۔ مونا لڑکا، جو میرے ہمسائے میں رہتا تھا۔ وہ ہمسایہ تھا۔ دوسرا مونا کچھ عرصے بعد آیا۔ اس کا نام والی تھا۔ سب اسے والی کہتے تھے سوائے استادوں کے۔ والی اور مونا۔ کاش میرے پاس ان کی تصاویر ہوتیں۔ روڈی کہتا ہے۔

میں کہنے کے لیے کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ اس لیے ہم نے چائے پی اور جلد ہی میں بستر کی طرف بڑھ گیا۔ روڈی بھی اٹھتا ہے۔ ٹی وی بند کر دیتا ہے۔ سامنے والا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اور اپنے بٹنوں کو کھولنا شروع کرتا ہے۔

میں بیڈ پر جاتا ہوں اور خود کو بالکل اس کے کنارے کے قریب کر لیتا ہوں اور الٹا ہو جاتا ہوں۔ لیکن فوراً ہی جب وہ لائٹ بند کر کے بستر پر آتا ہے تو روڈی شروع ہو جاتا ہے۔ میں کمر کے بل ہو جاتا ہوں اور توقف کرتا ہوں حالاں کہ یہ میری مرضی کے خلاف تھا۔ لیکن یہی وہ نکتہ ہے۔ جب وہ مجھ پر آتا ہے تو اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں موٹا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بے تحاشا موٹا ہوں اتنا موٹا کہ روڈی میرے نزدیک نہایت مختصر سا ہو جاتا ہے، جیسے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہو۔

یہ ایک مزاحیہ کہانی ہے، ریٹا کہتی ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ نہیں جانتی کہ اس سے کیا مطلب اخذ کرے۔

میں غمزدہ ہو اٹھتا ہوں۔ لیکن میں اسے مزید کچھ نہیں بتاتا۔ میں پہلے ہی اسے بہت کچھ بتا چکا ہوں۔

وہ وہاں بیٹھی ہے انتظار میں۔ اس کی نازک انگلیاں اپنے بالوں کو سہلاتی ہیں۔ انتظار کس چیز کا؟ میں جاننا چاہوں گا۔

یہ اگست ہے۔

میری زندگی بدلنے کو ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں۔

☆☆☆☆

گائی ڈیون پورٹ

ہیل سلاسی کی جنازہ گاڑی

عین تین بجے ہیل سلاسی کی جنازہ گاڑی دیوائل سے روانہ ہوئی اتنی سست روی کے ساتھ کہ پرنس البرٹ میں اپنی چھتریوں کے ساتھ شرفا، جس پلیٹ فارم سے پرے کھڑے تھے، وہاں سے ہم خاموشی کے ساتھ پھسلتے رہے۔ لیڈیز جنھوں نے، پکچر ہیٹ پہن رکھے تھے، انھوں نے منہ پر رومال رکھے ہوئے تھے اور پورٹرز نیلی ڈانگری پہنے ہوئے مستعد کھڑے تھے۔ ایک براس بینڈ نے "A" میں سٹین فورڈ بجایا۔

ہم نے اور کنڈکٹر نے گیس ورکس پر رفتار پکڑی اور گارڈ نے ڈبے کے قریب پاسپورٹوں کو دیکھتے ہوئے اور ٹکٹوں کو پنچ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیا۔ ہم میں سے زیادہ تر نے اپنے ہاتھ موڑ کر اپنی جھولیوں میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ادیس ابابا کے ٹھنڈے آراستہ درختوں، سپاہیوں کے ننگے پاؤں پر پینٹ کیے گئے، سفید پاپوشوں اور گھنٹیوں والے اونٹوں کے بارے میں سوچا جو جھلسے ہوئے حاشیوں والی پگڑیاں دانا کل کے پار سے لائے تھے۔

ہم صاف ستھرے فارموں، سٹوروں، زیتون کے جھنڈوں اور انگور کے باغوں کے پاس سے گزرے۔ جب گارڈز اور کنڈکٹرز اگلے ڈبے میں چلے گئے تو ہم نے خود کو آسودگی میں پایا اور ہم باتیں کرنے لگے۔

وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ چالیس سال تک سویا رہا؟ میرے پیچھے موجود ایک عورت نے اپنے ساتھی سے کہا، جس نے جواب دیا کہ ایسا ان کی فیملی میں ہے۔

یہ یہودی۔۔۔ ایک موٹے آدمی نے گاڑی میں اعلانیہ انداز میں کہا۔

سالوں بعد، جب میں جیمز جائس کو ہیل سلاسی کی جنازہ گاڑی کے سنجیدہ سفر کے بارے میں بتا رہا تھا تو وہ حیران رہ گیا کہ میں کسی دوسرے ملک میں بھی رہا تھا۔

میرے خدا، کیا گاڑی تھی۔ کیا وقت تھا۔ اس نے کہا۔ میں وہاں تھا۔ مجھے وہ لوگ یاد ہیں جو اس گاڑی میں تھے۔ جیمز جائس وہاں تھا۔ میں وہاں تھا۔ سفیر تھے، ساربون اور آکسفورڈ کے پروفیسر

تھے،کم از کم ایک چینی فیلڈ مارشل بھی تھا اور پرنسیا کا سارا اسٹاف بھی وہاں پر موجود تھا۔
جیمز جائس اور میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ 1936 کی دنیا آج کی دنیا سے بہت مختلف تھی۔
میں جانتا تھا کہ ابلیس بھی گاڑی پر سوار ہے۔ میں نے اسے لیفٹیننٹ کی مسلی ہوئی یونی فارم میں دیکھا،اس کا سر باریک ریشمی پٹی سے ڈھکا ہوا تھا۔اس کی چھوٹی کرائکس ڈی گرمی اس کی سَیم براون بیلٹ کے نیچے موجود تھی۔وہ بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا،اس کے چوڑے ہاتھ اس کے گھٹنوں پر تھے۔اس کی ٹھوڑی فخریہ انداز میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔
پنس نیز میں ایک چھوٹے سے قد کے داڑھی والے شخص نے ضرور دیکھا ہوگا کہ میں کس خوف سے ابلیس کو دیکھ رہا تھا کیوں کہ اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور اس نے آکر اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا تھا۔اس آدمی کے قریب مت جاؤ۔اس نے نرمی سے میرے کان میں کہا۔وہ کہتا ہے کہ وہ ایک قیصر ہے۔اس زخمی شاعر کے لیے جو ہمدردی میں نے محسوس کی وہ چھوٹے فارموں کے قریب سے گزرتے ہوئے،ان کی افسردگی سے بھی جھلک رہی تھی۔ہم نے گایوں کو دیکھا جو چراگاہ سے گھر کی طرف ہانکی جا رہی تھیں۔خانہ بدوش اپنے شام کے الاؤ کے گرد دو زانو بیٹھے تھے،سپاہی ایک جھنڈے کے پیچھے مارچ کر رہے تھے اور وہاں وہ ڈرم بجانے والا بھی تھا جس کا منہ کھلا ہوا تھا۔
ایک بار ہم نے ہارمونیم کے خوش کن سُروں کو سنا لیکن ہم صرف کوئلے کی کان سے نکلتے ایک بڑے پہیے کو ہی دیکھ سکے۔
ابلیس وقتاً فوقتاً بالکل ایک جرمن جیسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کے سر پر،جس پر پٹی بندھی تھی، اچار کے مرکب کے دھبے تھے۔اس کی پھولی سی مونچھوں اور اس کی بھلی آنکھوں میں جنونی نظم وضبط کی لپک کو دیکھا جا سکتا تھا۔وہ گلامی،ولہلم تھا،شکلوں کا بگڑنا اور بدلنا ہمیشہ بڑھنا نہیں ہوتا،سایوں میں ایک قیدی روشنی چھپی ہوتی ہے جیسے کہ سنسان کمرے میں ایک ہیولہ نما سایہ،انگوروں کے سبزے میں سرخی، سرخ ترین شراب میں سبزہ۔
ہم ایک ایسے شہر کے قریب سے گزرے جہاں لکڑی کے بنے ہوئے گھروں کے چھجوں پر بیلیں لٹک رہی تھیں اور وہاں جھنڈ کی طرح چائنا بیری کے درخت تھے اور وہاں عورتیں اپنے ہاتھوں میں قینچیاں اور بالٹیاں لیے کھڑی تھیں۔ میں نے ایک چھوٹی لڑکی کو لیمپ ہاتھ میں لیے کھڑے ہوئے دیکھا،بنجو کی موسیقی کی ایک پرانی نیگرو شکل،تنکوں کا ہیٹ پہنے ہوئے ایک خچر۔گاڑی کے انجن اور محافظ

والے کمرے سے چوتھے نمبر کے سونے والے کمرے میں داخل ہوا جائے تو دائیں طرف والے کالے نیلے پیلے کمپارٹمنٹ کی کچن ٹیبل پر جائس بیٹھا دکھتا تھا۔اس کی آنکھیں اس کے عینک کے شیشوں کی وجہ سے اس گولڈفش کی طرح خوب پھیلی ہوئی لگ رہی تھیں، جو پوری دنیا میں آگے پیچھے ہوتی ہوئی تیر رہی ہو۔اس کے پیچھے ایک سنک تھا اور ایک پیچ دار ٹونٹی کے پاس پڑا تھوڑا سا صابن۔اور ایک کھڑکی تھی جس پر لیس سے مزین آدھے پردے تھے، جو پرانے ہونے کی وجہ سے پیلے ہو رہے تھے۔دیوار پر ایک ارغوانی رنگ کا مقدس دل تھا، ایک گلاب، ملمع کا پتر، اسی کی دہائی کی پوسٹ کارڈ پکچر کے ذریعے دکھائی جانے والی عریاں خوب صورت عورت، جس کا ایک ہاتھ کلچے کی شکل والے بالوں کے گچھے پر تھا، اس کا دوسرا ہاتھ انگلیوں سمیت اس کے گڑھے دار گھٹنے پر پوری طرح سے پھیلا ہوا تھا اور وہاں صاف ستھرے انداز میں ایک اخبار کی شہ سرخی کو کلپ کیا گیا تھا۔"فیتی کے مسز کرلی کا کہنا ہے کہ ایک متحدہ آئرلینڈ اور Trieste اٹلی کی ملکیت ہیں۔"

وہ جانوروں کو تبلیغ کرتے ہوئے آرفیوس کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔۔۔ایک اداس سے ستار کے تار بجے، میں نے اسے کہتے ہوئے سنا اور شان وشوکت والی چال کے ساتھ ایک بارہ سنگھا آیا، وہ اپنے سینگوں کی شاخوں والے درخت کے ساتھ، شان دار لگ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک کاہن جیسی تمکنت تھی۔

اس نے اشانتی کی سرخ گائے کے اوپر آرفیوس کو ظاہر کیا، جس کے نیچے یوری ڈائس زمین کے اندر درختوں کی جڑوں میں سے ہو کر آ رہی تھی۔شیطانی صفت والا مٹی کا بنا ہوا، ایک تمباکو سے بھرا چھوٹا پائپ، سرخ ڈبیا والی ایک اتالین ماچس کی تیلی سے سلگایا گیا۔اس پر ایک بیضوی مالا بنی ہوئی تھی اور اس پر زیتون اور گندم سے بنی، بادشاہ امبرتو کی تصویر چسپاں تھی۔پائپ پیتے ہوئے اس نے اپنے گھٹنے کو تھپتھپایا۔اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔کنگ امبرتو ویلس کو یئز رے فلپ کی طرح دکھائی دیا۔

جائس کہتا ہے میری بیوی پیرس میں مسلسل گالوے کی تلاش میں لگی رہتی ہے۔وہاں آرفیوس کے پاس ایک چوہیا آئی، جس کے بچوں کی جھول، اس کے منہ میں تھی، تھاروویکس کے پتے کو چباتے ہوئے، جمائی لیتا ہوا ایک چیتا، اپنے پنجوں کے بل چلتے ہوئے بھیڑیوں کا ایک جوڑا۔جائس کی انگلیاں انگشتریوں سے بھری پڑی تھیں، سائز میں کافی بڑے قطروں کے چھینٹے اس کی آنکھوں کے عدسے میں نظر آئے۔اس نے زمین پر رہتے ہوئے، بید جیسے درخت کے مڑے ہوئے پتوں کے بارے

میں بات کی، اس وقت تک جب تک کہ ان کا رخ نیچے چین کی طرف نہیں ہو گیا۔تخلیق کے بارے میں اس نے کہا کہ ہمیں شعر کی نفاست (عمدگی) کی وجہ سے،اس کے بارے میں کوئی خاص پتا نہیں۔لیبو کا کان پتنگے کے پر، پر پھیلا ہوا ہے جیسے سمندری خرگوش کی گول رگیں۔خدا عظیم ہے۔اس کے علاوہ ایک نڈے کی اناٹومی کا منشور ایک قسم کا مڈ پائی ہے اوران کے سارے فریموں میں چمنی میں جو شان دار تصویریں ہیں وہ کسی مرغی کے نقش پا کی طرح ہیں۔

ہماری ٹرین بلیو اورڈ مونٹ پا سے جا رہی تھی جو بارسلونا میں تھا۔

کیسے ایک عورت کیک بنانے کے لیے اس کے مواد کو پھینٹتی ہے۔جائس کہہ رہا تھا بادشاہ کے گالوے کے سفید گھوڑے جھاگ سے آلودہ دانتوں کو بھینچتے ہوئے اور جنوری کے موسم والے بحر اوقیانوس میں چٹان سے بجلی کے کڑاکے کی طرح ٹکراتے ہوئے ہوگر ے کو گھاس والی سطح زمین پر مارتے ہوئے، دھول، آسمان اور باغ یہ سب کیسے لگتے تھے۔توانائی ایک ایسی دوڑ ہے جو غار اور عوامی گھر تک ہر جگہ یکے بعد دیگرے ہو رہی ہے۔ازبن اپنی ایال میں کنگھی کرنے کے لیے اپنے ہیٹ میں ایک آئینہ رکھتا تھا۔اسکنڈے نیو یا کا ارل شیشے میں سے اپنے نیلے دانت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔اس نے فری آ کو بازنطینی شان وشوکت کے لیے چالیس گلہریوں کا کچا چڑا دیا تھا۔

ابلیس گارڈ کو اپنا پاسپورٹ دکھا رہا تھا جو کہ کنڈکٹر کے ساتھ چلا آیا تھا۔کنڈکٹر اور گارڈ نے ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشی کی۔ابلیس نے ریک سے اپنا ہیٹ اٹھایا اور پہن لیا۔وہ سامان کے ڈھیر کے اوپر بیٹھ گیا۔

اس نے کہا: "Je ne suis pas Balzac"

ہم برنڈریزئم کی پیلی چھتوں سے اور گوداموں کے پاس سے گزرے

Ni Michel Larionoff

جائس کہہ رہا تھا۔وہیل مچھلی؛ جیلی فش، والرسوں، بحری حیوانوں اور سیپ کی مچھلیوں کو ایک کیمیائی عمل سے گزرتے ہوئے سمندر میں دیکھ رہی تھی۔الو زیتون کے جھنڈ سے اور قمری؛ سیبوں میں سے دیکھ رہی ہے اور سب کے لیے وہ کہتا ہے "Il'ny a que Ihomme qurest immowde."ٹرین میں کہیں پر یہودا کا شیر، راس میکونن کا بیٹا راس تفاری بھی لیٹا ہوا تھا۔اس کے نیزہ برداروں نے اتالین کارپوڈی ارماتا کے مسلح ڈبوں پر اچھل کر ان کے دانتوں کو بجاتے ہوئے حملہ کر دیا تھا۔

اس کے چیتوں کا خود اپنا ڈپہ تھا۔

جب ہم ایک لمبا موڑ مڑے تو میں دیکھ سکتا تھا کہ ہمارا انجن ایتھوپیا کے شاہی معیار کی نمائندگی کرر ہا تھا۔

وہاں سرخ، پیلی اور سبز تین دھاریوں پر مبنی پانچ کونوں والے ستارۂ داؤدی کے بینر پر کراس والا تاج پہنے ہوئے ایک شیر بنا ہوا تھا۔ وہاں پر قبطی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ ہم دائمتن ساحل سمندر کی ویران اور کٹی پھٹی پہاڑیوں کے قریب سے گزرے یہ جگہ ایسے لگ رہی تھی جیسے ایک پرانی دیوار پر بدروؤں کی لکیروں کے دھبے ہوں۔ وہاں ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو چینی تامرکی کالی ریت کے کھسکنے، سرخ چٹان والی ایڈم کی وادیوں کے شجروں کے بارے میں سوچے بغیر، داناکلل کی پہاڑیوں کی ویرانی کو دیکھ رہا ہو۔

وقتاً فوقتاً ہم بور کر دینے والے ہیل سلاسی کے ڈبے سے چند قدیم ہارنوں کے لمبے سُر اور گھنٹی کی سنگ دل قبائلی آواز کو سن سکتے تھے۔

پتنگے، گرد آلود شیشوں، یوکلپٹسوں اور اینٹی بلیماز پر لرز رہے تھے اور ان باڑوں اور دیواروں سے پرے جو باغات ہم دیکھ رہے تھے وہاں پر بھی۔ ایک خواب کی طرح بارسلونا سے باہر ہم نے لا بیلے جارڈینیئرز کو، خود پھولوں کے درمیان، اپنے اصل نشانات کے نظارے اور اپنی بھڑوں اور رفاختاؤں کے ساتھ دیکھا۔ اس کی نیلی لمبی ٹانگوں پر بیٹھا تھا۔ اس کا تتلیوں والا تاج، سرخ سنگ شب کا بکسوا اور اس کے خوبصورت بال تھے۔ وہ جیمز (درخت) کے قریب سُوت سے پانی نکالنے میں مشغول تھی۔

رُوویوئمین، ابلیس نے صاف طور پر کہا، جیسے اس نے ڈبے کو مخاطب کیا ہو۔ اور تبھی لالا رینین اپنے ہیٹ پر ایک پرندہ بٹھائے اور گندم والا کان اپنے دانتوں میں لیے سپین کے لیے روانہ ہوئی۔ گیئر سینٹ لازارے کے باہر، جب اس کی ٹرین نے اسے اور اوٹو دان وینجن کو دیوائل پر بورین کے ساحلوں سے بچ کر اوپر اٹھایا۔ جب ہم سب پراوسٹ کی چھتری کے قریب تر تھے تو جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ انھوں نے لووین کی لائبریری کو جلا دیا۔ اگر انسان خدا کی ہی ایک مثال ہے تو پھر خدا کے نام پر یہ سب کیا تھا؟ مشاقی اور مہارت کے ساتھ اس نے کرسٹل واٹر کو انجیر سے نکالا۔ اس کے مددگار نے، جو شاید اس کا آقا تھا، پتوں کا فرغل پہن رکھا تھا اور ایسا ماسک بھی پہن رکھا تھا، جس نے اس کے سر کو Thoh کا بنا دیا تھا، جس کی چونچ تھی اور جس پر پینٹ کی ہوئی متعین شدہ آنکھیں تھیں۔ ہم Genoa

میں ایسے نقش پا پر تھے جوڑالیوں کی بنا پر بنے تھے۔ قلعے جیسی لمبی دیواریں جیسے کہ پیکنگ کی تھیں، اپنی بلندیوں تک ایسے پوسٹرز سے بھری پڑی تھیں، جن پر کمانی دار انگیاں، بن زانو ہسو لینی، شوؤ یکس، فاشسٹ کلھاڑی اور Giovanezza کی طرف مارچ کرتی ہوئی لڑکیاں اورلڑکے دکھائے گئے تھے۔ وہاں پران سلیٹی رنگ کی دیواروں کے اوپر، درختوں کی شاخوں کے سب سے اوپر والے حصے دکھائے گئے تھے اور ہم میں سے بہت سوں نے اپنے تصور میں ایسے باغوں کو، جن میں مجسمے اور ایسی کھلی چھتیں تھیں، جن میں وہ گھرے ہوئے تھے، دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

ٹرین میں کسی جگہ پر فاتح شیر کی طرح، تلوار پر اپنے ہاتھ رکھے، وہ لیٹا تھا۔ چار نیزہ بردار سرخ رنگ کے بے آستین لبادوں میں ننگے پاؤں اُس کے گرد کھڑے تھے۔ جن کے قریب ایک پادری، جس نے سنہرا ہیٹ پہن رکھا تھا، مسلسل ایک کتاب سے پڑھے جا رہا تھا۔ اگر کوئی شخص ان الفاظ کو سننے کی کوشش کرتا ہے تو اسے، ان میں صبا کا بیان ملتا، جو ہاتھی دانت سے بنی کرسی پر بیٹھی تھی اور جس کے گرد غسل والے دبیز کشن تھے۔ وہ ایک ایسی عورت تھی، جس کا ذہن روشن اور خون سرخ تھا۔ ان میں صنوبروں والے گھر میں موجود سلیمان کا بیان تھا، جو ایسے پتھروں سے بھرے صحرا سے آگے واقع تھا، جس میں سے گزرنے میں چالیس سال کا عرصہ لگتا ہے۔ پادری کے الفاظ کسی میووں کے باغ میں موجود شہد کی مکھیوں اور کسی مقدس شہر میں بجتی گھنٹیوں جیسے تھے۔ وہ پر دار سانپوں، زیرزمین دنیاؤں، ہر پتے پر جمی ہوئی نظر والے جنگلوں، اسی دوران ان لین جہازوں اور درویشوں جیسی جھنجھناہٹ والی اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا۔ جائس کہہ رہا تھا۔ یہ سارا کچھ ایسا ہے جیسے ایک اہل بصیرت شاعر دریائی کنارے کی اونچ نیچ سے بچ کر ہم سے ملاقات کرنے آ رہا ہو۔ باغ میں موجود لیڈی ایسی ہے کہ جیسے اس کے چراغ کی بتی ساری کی ساری کانوں کی طرح ہو۔ اس کی کنوارپنے کی آنکھ میں ایک سانپ ہے، پلکوں پر شبنم اور شبنم کے آئینے میں ایک سیب ہے۔ کیا کوئی اس لوٹی ٹرین پر ایسا شخص موجود ہے جو انجینئر کا نام جانتا ہو؟ بادشاہ کا کونسل جوز چلایا: ''جیمز جانسن سوینی۔''

اس نے کوئین ٹینگ سے منطقہ ایتھوپیا کے گارڈیا سول کے وفاقی پیدل فوج کے سارجنٹوں کے بیچ میں سے، اپنا راستہ بنایا، جنھوں نے موٹا لباس اور اندر سے گودے کی طرح نرم ہلمٹوں کے ساتھ چوغے پہنے ہوئے تھے۔

میں نے انجینئر ایلرڈ سنگ بیل کے بارے میں سوچا، جو بلیو رج میں سٹمپ ہاؤس ماؤنٹین کا

ایک میل لمبا موڑ مڑ کر نیچے آتے ہوئے سیٹی پر، امیزنگ گریس کی دھن بجایا کرتا تھا۔ میں نے موسم بہار کے آغاز میں کھلتے ہوئے چائنا بیری کی تیز میٹھی خوشبو کو یاد کیا۔

جائس نے بانسوں میں ہو کر ڈانس کرتے ہوئے، ایک پیلے لباس والے آرفیوس کا ذکر کیا، جس کے پیچھے چیتے، میکاؤ، زرد رنگ کی گانے والی چڑیا اور شیر آ رہے تھے۔ اور اس نے ایک آرفیوس کو سمندر میں موجود گہری وادی میں بہتے نالے میں آبی سانپوں کے لجلجے مادے، سواستیکا سٹار فش، چھ آنکھوں والی فالودہ مچھلیوں، پر دار بوآ سمندری للیز کومب جیلی سائیڈی پنڈ اس، سرخ کیکڑوں اور چاند کی طرح کی پرانی اشمریوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

"بالکل نہیں،" ابلیس نے بے خیالی سے کہا۔

جائس نے کہا گل مجھے دار چوہیا، سفید ٹانگوں والی رکی چال چلتی ولدلیس Prests Prests edelicatamente، کڑکڑ کرتی مرغیاں، سنجیدہ سؤر سیٹیاں بجاتے تا بیر۔

La Belle Jardiniere ہم نے اسے دیکھا وہ میڈ رڈ میں پھول، کارن میری گولڈ، سوراخ دار تنکے، عظیم پہاڑی گھاس پھوس اور سفید جنگلی Campions بیچ رہی تھی۔ اوڑیسا میں وہ چڑیوں کی طرح پھڑک رہی تھی۔ جب ہم اس کی کلائیوں سے آگ چھڑاتے ہوئے اٹلانٹا سے گزر رہے تو وہ (سوکھے) اچالیہ میں تھی۔ جائس نے کہا، کیا یہ castellum ہو گا جہاں ایک اندھیرے kerker میں بابلی تالمود پر تبصرہ کرتے ہوئے گراف، اپنے دو جڑواں بچوں کے ساتھ موجود تھا جیسے بوٹس اور آنکھ کے زخم کے ساتھ ایک مکمل خاتون کی طرح اس سرس کی ماں نے اندھیری رات کو روشن کرتے ہوئے اپنا راستہ بنایا۔ اس نے انجیل اینکر کے اوپر کھاڑی میں مورنی کو رکھ دیا تھا اور انھیں اغوا کر لیا جیسے کہ وہ بہوتا تھن اور ستاروں کے سے پستہ قد جھاڑ تند Dawidh کو میٹھا بنا رہے تھے۔ لیکن قصبے کے دھند لانے اور ڈور پوسٹ پر اپنی ایڑھی میں موچ آ جانے سے پہلے نہیں۔ گڈر یے! ابلیس ہمیں چونکاتے ہوئے چیخا۔ Ypres میں کوئی گلہ بان نہیں تھا۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی چرواہا نہیں۔

ہم دیوائل کی طرف واپس آتے ہوئے نارمنڈی کے باغوں کے قریب سے گزر رہے تھے۔

ہمارے آگے، ہمارے پیچھے ٹرین میں کہیں ہیل سلاسی اپنے تابوت میں لیٹا ہوا اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ، اپنے شاہی ڈبے کی چھت میں سے ٹرائی انگلم میں ڈبل سٹار گاما اور جڑواں سورجوں کو دیکھ رہا تھا، جن میں سے ایک اورنج ہے اور دوسرا سبز۔

آشدائت کارتا مہاراجا

وان بیورن اور دیہاتی لڑکی

یہ واقعہ ایمسٹرڈم کی ایک تند ہواؤں سے لدی خزاں زدہ شام کو پیش آیا۔ میں راستہ بھول گیا تھا اور مجھے والیرس سٹریٹ کا پتہ پوچھنا پڑا۔ میں اس شخص کے جواب پر حیران رہ گیا کیوں کہ اس نے میرے سوال کا جواب انڈونیشین زبان ہی میں دیا تھا۔

''اس طرف جناب۔'' وہ اتنا مہذب شخص ثابت ہوا کہ اس گلی کا راستہ بتاتے ہوئے وہ اخلاقاً میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ جگہ، اس جگہ سے، جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی، قریب ہی تھی۔

وہ تھا تو ڈچ مگر اس کا قد قدرے چھوٹا تھا۔ تند ہوا کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے بار بار اس کے ہاتھ اپنے پیٹ کی طرف بڑھتے تھے۔ اس کے پیٹ کی طرح اس کا اوورکوٹ بھی خاصا گندا اور پرانا تھا۔ اگر چہ میں اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن اس کے دھیمے لہجے اور آواز کی نرمی نے میرے دل کے گوشے میں اس کے لیے پسندیدگی کا تاثر پیدا کر دیا تھا۔

میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے بتایا کہ انقلاب کے زمانے میں وہ انڈونیشیا ہی میں تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی اور یوں ہم نے آئندہ ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

تین دن بعد، ایک سہ پہر کو، یہی ہماری ملاقات کا طے شدہ وقت تھا، میں نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس نے خود آ کر دروازہ کھولا اور پھر ہم فوراً ہی تیسرے فلور پر جانے کے لیے بوسیدہ سی سیڑھیاں طے کرنے لگے، جہاں وہ ایک ایسے کمرے میں رہتا تھا، جو ایک تنہا شخص کی ضروریات زندگی کے لیے کافی تھا۔ اور یقیناً یہ ایک نہایت سادہ سا کمرہ تھا، مفلسی کی بہترین تصویر، جس میں صرف تین کرسیاں، ایک میز، ایک ڈریسر اور ایک دیوان تھا، جو شاید بیٹھنے اور سونے کے مقاصد بیک وقت پورے کرتا تھا۔ یہ سب چیزیں نہایت خستہ حالت میں تھیں۔ کمرے کا سارا ماحول بے ترتیبی کا مظہر تھا: کتابیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ شطرنج کے مہرے اسی حالت میں میز پر پڑے تھے، جس حالت میں انھیں پچھلی بار ختم ہونے والی بازی کے وقت چھوڑا گیا تھا۔ کھڑکی کے قریب ایزل پر ایک

نامکمل تصویر موجود تھی اور نیچے فرش پر پینٹ کی ٹیوبیں اور برش وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔

''اچھا تو آپ مصوری کرتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

''بس وقت گزارنے کا ایک مشغلہ ہے۔''اس نے کونے میں پڑی کرسی کو کھینچتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

اب اس کمرے کی روشنی میں، میں نے اسے دیکھا تو اس کے متعلق پہلی ہی ملاقات پر قائم ہونے والا میرا تاثر بالکل صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ بے شک وہ عام لوگوں سے ہٹ کر دوستانہ اور بہت غیر روایتی رویے کا حامل ایک شخص تھا۔ وہ ایزل کے ایک طرف پڑی اپنی مکمل کی گئی پینٹنگز کے ڈھیر میں سے ایک ایک کر کے، مجھے تصویریں دکھاتا رہا۔ اس کی تصویروں کا سٹائل خاصا متنوع تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ تصویروں کے ذریعے، اپنی شخصیت کے اظہار کو پانے کے لیے، وہ ابھی تک مختلف قسم کے تجربات میں لگا ہوا تھا۔ ایزل پر موجود تصویر میں ایک پہاڑ کے دامن میں دھان کے کھیتوں کا لینڈ سیکپ نظر آ رہا تھا۔

''ایک خوب صورت ملک ۔۔۔'' اس نے تقریباً پچکی ہوئی ایک پینٹ ٹیوب اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر نہایت گلوگیر آواز میں، اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک مغربی جاوا کے خوب صورت پہاڑی ماحول کو نہیں بھولا۔

''اے کاش میں پھر ایک بار وہاں جا سکوں ۔۔۔ کیا میں پھر کبھی ان اونچے خوب صورت پہاڑوں کی ڈھلانوں پر موجود، چائے کے باغات میں گھوم پھر سکوں گا؟ کیا میں دوبارہ اپنا مخصوص رنگین لباس پہنے ہوئے، ان سادہ دیہاتی لڑکیوں کے گیت اور قہقہے سن سکوں گا؟ کیا میں انھیں چائے کی پتیاں چنتے ہوئے دیکھ سکوں گا اور کیا وہاں کے جنگلوں کی فرحت بخش ٹھنڈی ہوا میں، ایک بار پھر سانس لے سکوں گا؟''

وہ پرانی یادوں کی شدت سے مغلوب ہو کر جذبات کے سمندر میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

''کیوں نہیں ۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے۔''

وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا کسی قدر اداس لگ رہا تھا۔

''میں اس خوب صورت دیہی علاقے کو اس طرح پسند کرتا ہوں، جیسے وہ میری جنم بھومی ہو ۔۔۔ یہ بات ہے تو عجیب لیکن میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

''اچھا ۔۔۔ وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سب کچھ محض اس لیے نہیں کہ وہاں کے پہاڑی سلسلے بہت شان دار ہیں کیوں کہ آپ

جانتے ہی ہیں کہ سوئزرلینڈ کے پہاڑی مناظر بھی غیر معمولی طور پر خوب صورت ہیں مگر پھر بھی ان میں وہ خاص بات کہاں جو انڈونیشیا کے پہاڑی علاقے میں ہے۔"

میں مسکرایا کہ شاید وہ مجھے بنانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔

"سچی بات یہ ہے"، وہ کہتا چلا گیا، "اصل میں مجھے وہاں کے سادہ اور مخلص لوگوں سے محبت ہے ۔۔۔ یہ وہ احساس ہے جو وہاں کی ہر چیز کو خوب صورت بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صحرا ہی لے لیں ۔۔۔ کیا یہ بنجر ویران اور فضول سی جگہ محبت میں بھیگے ہوئے شخص کے لیے ایک نخلستان کی طرح نہیں ہو سکتی؟"

اس نے اپنے بیٹھنے کا انداز بدلتے ہوئے اپنی کہانی جاری رکھی اور مجھے بتایا کہ: "انقلاب کے وقت وہ ڈچ امپیریل آرمی میں ایک سارجنٹ تھا اور اسے ایک خاص عرصے کی قید کی سزا ہوئی تھی اور پھر بعد میں وہ اپنے ملک لوٹ آیا تھا' وہ اس لیے کہ اس نے ان معصوم لوگوں پر خواہ مخواہ گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا، جن کا جرم محض یہ تھا کہ وہ آزادی سے جینے کی خواہش رکھتے تھے۔"

"سگریٹ لیں"، اس نے اپنا بیان منقطع کرتے ہوئے کہا، "میں خود سگریٹ نہیں پیتا' میں تو بس اس کا عادی ہوں۔" اس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب سے ایک پائپ نکالتے ہوئے کہا۔ وہ ایش ٹرے لانے کے لیے ڈریسر کے پاس گیا اور پھر گویا ہوا: "میں اس ایک واقعہ کو تو بالکل ہی برداشت نہ کر سکا وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔ بنڈونگ کی ڈاگو سٹریٹ میں ایک شام کو میں نے سپاہیوں کو سائیکل پر وہاں سے گزرتے ہوئے، ایک لڑکے کو روکتے دیکھا۔ بغیر کسی وجہ کے انھوں نے اس بے چارے کو پکڑ کر سڑک کے کنارے گرا دیا اور پھر اسے بجلی کے کھمبے کے ساتھ سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا اور پھر اچانک سپاہیوں میں سے ایک نے اپنی تلوار نکالی اور اس لڑکے کے جسم کو، اس بے دردی اور شدت سے چیر کر رکھ دیا کہ تلوار کے کھمبے کے ساتھ ٹکرانے سے چنگاریاں سی برآمد ہوئیں۔ ذرا سوچو بغیر کسی وجہ سے اس بے چارے لڑکے کو صرف اس لیے مار دیا گیا کہ اس کا تعلق اس قوم کے ساتھ تھا، جو آزادی کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔ صرف چند لمحوں میں وہ لڑکا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا۔"

وان بیورن (کہ یہی اس کا نام تھا) نے یہ کہانی خاصی بدمزگی مگر نہایت سکون سے سنائی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ پائپ کے تمباکو کی راکھ فرش پر گراتا رہا۔ پھر گھنٹی بج اٹھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور ایک لمحے بعد ایک اجنبی اندر آ گیا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کے نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس ایک انڈونیشین تھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا چھوٹی سی ناک اور ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں والا شخص تھا، جو بڑی

بے چینی سے مسلسل حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔اس کا سر آدھا گنجا تھا،جس سے اس کی پیشانی کی اونچائی غیر معمولی دکھائی دیتی تھی۔وہ اپنی حرکات وسکنات سے نروس اور جعلی سا دکھائی دیتا تھا، جیسے وہ اپنے آپ کو کسی شک وشبہ سے بالاتر رکھنے کی کوشش میں نہایت بھونڈی اداکاری کررہا ہو۔اس نے وان بیورن کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا اور مجھ سے علیک سلیک کیے بغیر،جتنی تیزی سے آیا تھا،اتنی ہی تیزی سے واپس چلا گیا۔

"ایک پرانا ملاقاتی"۔۔۔۔وان بیورن نے مجھے دوبارہ بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے بتایا:"وہ صرف دو دن پہلے انڈونیشیا سے آیا ہے،اصل میں، میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

اس وقت سے لے کر میں نے اس شخص کو وان بیورن کے گھر پر کئی موقعوں پر دیکھا۔میں حیران ہوتا تھا کہ اس شخص کا رویہ اتنا عجیب اور پراسرار کیوں تھا۔اس کا انداز دوستانہ نہیں تھا۔

ایک سہ پہر کو وان بیورن نے یہ کہہ کر ایک بار پھر مجھے اپنے گھر بلایا کہ اس کے پاس میٹھی شیری کی ایک بوتل بھی ہے جو مجھے بہت پسند تھی۔اس کی بنائی ہوئی نئی تصویر بہت اچھی تھی حالاں کہ یہ وان گاگ کی محض نقل تھی۔

اس نے شیری کے گلاس بھرتے ہوئے کہا:"آپ اس علاقے کو جانتے ہیں؟"

"بے شک"، میں نے جواب دیا"، یہ"جی پاناس" ضلع ہے بہت بڑے گیدھی آتش فشاں کے پیچھے۔"

"ہاں میں بھی اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔میرے عزیز آپ کی صحت کے لیے۔"اس نے اپنا شیری کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بالکل یہی الفاظ آپ کے لیے۔"میں نے جواب دیا۔ہم پینے لگے۔

"آپ یقیناً یہاں کے رہنے والوں کے بارے میں جانتے ہوں گے؟"

"نہیں۔۔۔۔میں نے تو بس یا کار کے ذریعے بنڈونگ جاتے ہوئے ایک نظر اس علاقے کو دیکھا ہے۔بس ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں۔"

"آزادی کے بعد اب ان لوگوں کی زندگی کیسی ہے؟"

"بہت اچھی۔"میں نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔۔۔۔"ایک لمحے اس نے کچھ سوچا اور پھر پوچھا:

''اچھی سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

میں نے فوراً جواب نہ دیا تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں وہاں کے کچھ لوگوں کو جانتا ہوں۔۔۔۔مثلاً کسان مزدور اور چائے چننے والے۔کیا آپ کے خیال میں، وہاں کے درخت اگانے والے کارکنوں کی تنخواہیں ان کی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ ان میں سے بہت سے غذا کی کمی کا شکار ہیں۔اس طرح کی خبر تو آدمی کو خاموش نہیں رہنے دیتی۔۔۔۔ہے نا؟''

میں ابھی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''ارے یہ اس وقت کون آن مرا۔'' وان بیورن نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔

اس نے دروازہ کھولا اور کسی کو اندر آنے کے لیے نہ کہا بلکہ خود دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے، اس کے قدموں کی آواز بتدریج کم ہوتی گئی اور تھوڑی دیر بعد خاموشی سی چھا گئی اور پھر سیڑھیوں کے نیچے سے تندوتیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں حیرت زدہ رہ گیا۔۔۔کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟

''وہ بہت بے شرم ہے۔'' وان بیورن کمرے میں داخل ہوتے وقت بڑبڑا رہا تھا۔''ایک شخص جس کا اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ جو بے کردار اور بے اصول ہے۔''

میں نے اسے بھڑاس نکالنے دی۔ یہ واضح تھا کہ جس شخص کے متعلق وہ ایسے کلمات ادا کر رہا تھا، وہ اس کا وہی عمدہ لباس پہننے والا مشکوک انڈونیشین ملاقاتی تھا۔

''دیکھیں آپ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہیں گے۔''۔۔۔۔میں 1974 میں انڈونیشیا میں پہلے نام نہاد ڈچ پولیس ایکشن کے تھوڑی دیر بعد اسے جنوبی بنیٹن ضلع میں ملا تھا۔انھی دنوں ایک ہفتے پہلے، میں اسے بھولا نہیں۔ہاں ایک ہفتے پیشتر جب مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا وہ مجھے کسی ''خدمت'' کے بارے میں بتانے آیا تھا جو کہ اس نے اپنے لوگوں کے لیے سرانجام دی تھی۔''

جب اس نے اپنی بات ختم کی تو صرف اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ لفظ ''خدمت'' طنزیہ طور پر ادا کر رہا تھا۔

''ایک پورا گاؤں راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔اور وہ تمام پندرہ گوریلا سپاہی جو کہ ایک لانگ مارچ کے بعد کسی تانگے میں جتے ہوئے گھوڑے کی طرح تھک کر چور ہو چکے تھے ڈچ آرمی کا تر نوالہ بن

گئے ۔گھیراؤ بہت صحیح تھا اور حملہ بالکل اچانک ہوا تھا۔کوئی بھی نہ بچ سکا تمام کے تمام مارے گئے ۔یہ تھی اس آدمی کی ''خدمت'' جو اس نے اپنے ہم وطنوں کے لیے سرانجام دی۔''

یہ سب کچھ کہتے ہوئے وان بیورن سکون سے نہیں بیٹھا رہا وہ کھڑکی کی طرف گیا پائپ کو اس کھڑکی کی سل پر خالی کر کے وہ شیری کے گلاس بھرنے کے لیے ڈریسر کی طرف بڑھا اور پھر اپنی کرسی کی طرف واپس آ کر، وہ اس کی سیٹ پر اپنا دایاں پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اور کیا آپ کو معلوم ہے''، اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا،''ایک اور موقع پر وہ مجھے یہ بتانے آیا کہ اسے اس کی ''خدمت'' کے عوض، انعام کے طور پر، ایک اچھی پوزیشن دلانے کا وعدہ کیا گیا تھا' میں بہ مشکل ہی اس کی باتوں کا یقین کرتا تھا مگر اس کی کہانیوں مجھے بری لگتی تھیں' 'اور ان الفاظ کے ساتھ ہی وان بیورن نے نہایت شدت سے پائپ پینا شروع کر دیا حالاں کہ اپنی باتوں کے دوران میں اس نے بہت کم پائپ اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔

میں نے اس سے آج کے تازہ واقعے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا:

''کل اتفاق سے لیڈز پلین کے نزدیک ایک چھوٹے سے کیفے میں میری اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔معمول کے مطابق وہ اپنے کارناموں خصوصاً عورتوں کے بارے میں اپنے تعلقات کے افسانے سنا سنا کر بور کرتا رہا۔میں اس حد تک اس سے نالاں ہو گیا کہ میں نے برملا اس سے کہہ دیا کہ میرے نزدیک اس کی وقعت ایک پیسے جتنی بھی نہیں۔ظاہر ہے کہ وہ ناراض ہو گیا تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج وہ مجھے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ اگرچہ میں اسے بہت معمولی اور گھٹیا آدمی سمجھتا ہوں لیکن دوسرے لوگوں کے نزدیک وہ ایک معزز اور قابلِ فخر شخصیت ہے۔اس مقصد کے لیے اس نے مجھے ایک ٹیلی گرام دکھایا جو اس نے ابھی ابھی جکارتہ سے وصول کیا تھا۔کتنی بدقسمتی کی بات ہے!''

وہ کس بات پر فخر کر رہا تھا؟'' میں نے کسی قدر محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اسے اس ٹیلی گرام کا فخر تھا جو اسے ملا تھا۔''

''لیکن کیوں؟''

''آپ یقین نہیں کریں گے۔۔۔۔یہ ٹیلی گرام اس کی سیاسی پارٹی کی طرف سے بھیجا گیا تھا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ آئندہ ہونے والے الیکشن میں اسے پارلیمنٹ کی سیٹ کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا ہے۔''

''کیا؟''

''کیا آپ یقین کر سکتے ہیں؟''

میں نے حیرت زدہ ہو کر اپنا سر ہلایا۔کچھ دیر اپنے خیالات میں گم رہ کر وان بیورن پھر بولا:

''ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہمارا ملک ان جیسے لوگوں کی وجہ سے آنے والی تباہی سے محفوظ رہے گا۔۔آپ کے ہم وطنوں کی مسرتوں کی خاطر........اور''اس نے اپنے خیالات میں ایک بار پھر کھونے کے بعد کہا:''خاص طور پر میرے ننھے بچے کے لیے''

میں یہ سن کر ششدر رہ گیا۔

''آپ کا لڑکا؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔''

''ہاں میرا لڑکا۔۔۔۔میرا بچہ!''

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ ایک بچے کے باپ ہیں؟''

''ہاں میں ننھے جوزف کا باپ ہوں۔وہاں اسے یوسف کہہ کر بلایا جاتا تھا۔میری دعا ہے کہ وہ زندہ ہو۔۔۔۔''اور جب وہ پھر ڈریسر کی جانب گلاس بھرنے کے لیے گیا تو میں ابھی تک حیران تھا۔

وہ کہنے لگا:''اس کی ماں کا نام ستی تھا۔۔۔۔نہایت اچھی دیہاتی لڑکی۔۔۔۔اپنے برتاؤ میں نہایت سادہ اور مخلص۔۔۔۔اور اپنی معصومیت کے لحاظ سے نہایت خوش باش۔جیسے اس طرف کی اکثر پہاڑنیں ہوتی ہیں یعنی ان پڑھ نوجوان عورتیں۔وہ چائے کے باغ میں کام کر کے اپنی روزی کماتی تھی۔لیکن بدقسمتی سے جب میں ڈچ جیل میں پڑا تھا وہ ایک بم کا شکار ہو گئی۔''

''ماری گئی؟''

''ہاں اسے ایک کتے کی طرح مار دیا گیا۔اس کو دشمن کا ساتھی ہونے اور جاسوسی کرنے کے الزام میں یہ سزا دی گئی۔''

وان بیورن نے اپنا گلاس ختم کیا اور غالباً ایک بار پھر ان میٹھی اور تلخ یادوں میں کچھ لمحوں کے لیے کھو گیا''''لیکن حقیقت میں''،اس کی آواز اب غم اور جذبات سے بھاری ہو چلی تھی۔''کیا اس دیہاتی عورت کو انقلاب اور سیاست کے معنی آتے تھے؟وہ اتنی سادہ تھی کہ وہ کسی جرم میں شریک ہو ہی نہیں سکتی تھی۔وہ پارلیمنٹ کی سیٹ کی امیدوار بھی نہیں تھی۔کیا وہ تھی؟ لیکن ہاں۔میں بھول رہا ہوں' میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔اس کا ایک بچہ تھا اور وہ میرا بچہ تھا۔۔۔۔ایک دشمن کا بچہ۔۔۔۔''

ملاچی وائیکر

میوزک باکس

ایک عورت اور ایک چھوٹا لڑکا ایک گاؤں کی گول پتھر سے بنی ہوئی ڈھلوان گلی میں جا رہے تھے۔ مسلسل تین میل تک چلتے رہنے کے بعد انھیں ایک ایسے شہر میں پہنچنا تھا، جہاں انھیں ایک مکان کی تلاش تھی۔ انھوں نے اس کا پتا شام کے اخبار کے، ایک اشتہار کے ذریعے معلوم کیا تھا۔

عورت تقریباً پانچ فٹ قد کی چھوٹی سی نوجوان عورت تھی۔ اس کے پاؤں چھوٹے تھے اور ان پر اسے بہت فخر تھا چھوٹے لڑکے کی آنکھیں بڑی بڑی سی تھیں، جن کا رنگ ہلکا براؤن تھا اور کچھ سوچتی ہوئی اور خوفزدہ سی لگتی تھیں۔ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ دونوں کے چہروں پر خوشی اور سنجیدگی کے ملے جلے تاثرات تھے..............انھیں کوئی خاص چیز خریدنا تھی۔

عورت کے خاوند کو تھیک سٹون مارفیٹ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کی عمر اپنی بیوی سے زیادہ تھی اور وہ پتھر کی کان میں پتھروں کی کاٹ چھانٹ کرنے پر ملازم تھا۔ اس کے بالوں کا رنگ ریت جیسا تھا کیوں کہ وہ سات دنوں میں ایک دن یعنی ہفتے کے روز ہی شیو بناتا تھا۔ اس لیے اس کی داڑھی اور قلموں کے بال خاصے بڑھے ہوئے اور چمک دار معلوم ہوتے تھے۔ اس کا چہرہ دھوپ کی حدت کی بنا پر سرخ سا لگتا تھا۔ وہ کھلے ہڈ پیر کا آدمی تھا مگر اس کے جسم پر گوشت کم تھا اور اس کی آواز خاصی درشت تھی، جس میں ایک طرح کی غراہٹ بھی شامل تھی اور اس کا بیٹا اس کی آواز سے ڈرتا تھا۔

اس کی بیوی نے اسے کبھی اس کے اصل نام یعنی تھیک سٹون کے حوالے سے نہیں پکارا تھا۔ نام لے کر پکارنا اس کے نزدیک اچھی حرکت نہ تھی، اس لیے وہ اسے منے کے ابا کہہ کر پکارتی تھی۔ شادی کے ابتدائی ایام میں تو وہ صرف ''وہ'' کہہ کر بلاتی تھی یا اگر ''وہ'' ذرا دور ہوتا تو اسے ''میرے مالک'' کہہ کر بلاتی لیکن وہ میرے مالک کہنے سے اکثر کتراتی تھی کیوں کہ حقیقت میں وہ اس کا آقا ہی تو تھا۔ جب اس کا بچہ پیدا ہوا تو اس نے سکھ کا سانس لیا کہ اب وہ زیادہ بہتر طریقے سے اسے اپنا شوہر کہہ سکتی تھی۔

جب اس کا بچہ، جس کا نام اس نے ہنری رکھا تھا، باتیں کرنے کے قابل ہوا تو وہ بھی اس

شخص کو ''ابا'' ہی کہہ کر پکارنے لگا۔ یہ خاندان مکانوں کی قطار کے آخری مکان میں رہتا تھا۔ جہاں کچی سڑک پتھر کی کانوں تک چلی گئی تھی اور اس سے آگے بنجر میدان تک........جب کبھی وہ چھوٹا لڑکا، بچوں کا کوئی عجیب وغریب کھیل کھیل رہا ہوتا اور اس کی نظر اس کیم شحیم آدمی پر پڑتی، جو اپنی لمبی ٹانگوں اور اپنے کھردرے کپڑے کی پتلون کو اِدھر اُدھر حرکت دیتا ہوا آرہا ہوتا تو وہ اپنی ماں کی طرف یہ کہتے ہوئے دوڑتا۔اماں......ابا آگئے! ہنری ابا کا لفظ ادا کرتے ہوئے ہمیشہ ہی ہچکچاہٹ سی محسوس کرتا تھا۔

اس گھر میں اس آدمی کی عدم موجودگی کی صورت میں خاموشی اور سکون رہتا تھا کیوں کہ یہ شخص جب گھر میں ہوتا تو ایک بڑی کرسی میں، جس کی لکڑی کی پشت پر بکری کی کھال منڈھی ہوئی تھی اپنے جسم کو پھیلائے پڑا رہتا اور اپنے بیٹے کی طرف ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا کرتا وہ اپنے اس اظہار سے محسوس کراتا کہ اسے، اس خاموشی اور آنکھوں میں ایک طرح کا سوال سا لیے ہوئے بچے کے بجائے موٹا تازہ ہر وقت شور مچاتا ہوا بچہ پسند تھا۔

لیکن ان باتوں کے متعلق سوچنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی کیوں کہ دنیا میں اس کے علاوہ بھی کچھ اور دلچسپیاں تھیں ....ہر سوموار دھونے دھلانے کا دن تھا۔ ہنری جب بہت چھوٹا سا بچہ تھا تو اس وقت اس کی ماں اسے، اس تہہ خانے میں، جو مکان کے بڑے کمرے کے نیچے تھا، ساتھ لے جاتی اس کمرے میں پڑی اینٹوں کے بنے ہوئے چولہے پر تانبے کا وہ برتن تھا، جس میں کپڑوں کے دھونے کے لیے پانی گرم کیا جاتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی جلنے والی لکڑیاں، کچھ کوئلوں اور کوک کی مدد سے آگ جلاتی اور تھوڑی ہی دیر میں بہت سا صابن ملا پانی گرم ہو جاتا اور جب وہ کچھ بڑا ہو گیا تو وہ اسے ایک بالٹی میں تھوڑا سا پانی ڈال دیتی اور کچھ نہ کچھ اسے بھی دھونے کے لیے دے دیتی۔ مثلاً: دھبوں والے سرخ رومالوں میں سے ایک، جس میں اس کا باپ اپنا کھانا باندھ کر لے جاتا تھا، یا پھر اس کی اپنی ہی آسمانی رنگ کی سرخ لائنوں والی قمیص دے دیتی۔ اور وہ پتھر یلے فرش پر نیچے جھک کر کپڑوں کو ملنے لگتا اور کبھی کبھی اس چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا، جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ جب تھک جاتا تو اپنی ماں کو لکڑی کے بڑے ٹب پر جھکے ہوئے دیکھا کرتا، جس میں وہ کپڑوں کو خوب دھوئے ہوئے باہر نکالتی اور پھر زیادہ بہتر طور پر صاف ہونے کے لیے کپڑے دھونے والے برتن میں ڈال دیتی تھی۔

وہ اپنی ماں سے زیادہ دور رہنا کبھی پسند نہیں کرتا۔ وہی ایک ایسی ہستی تھی، جس کے ساتھ اس کو لگاؤ تھا۔ اس کے قرب وجوار میں اس کے کئی ہم جولی رہتے تھے مگر وہ اپنی عمر کے، ان لڑکوں کے ساتھ

کھیلنا پسند نہیں کرتا تھا ۔ ہر اتوار کو اس کی ماں اسے چھوٹے پتھروں سے بنے ہوئے گرجا میں لے جاتی وہاں وہ لکڑی کی بنی ہوئی ایسی نشستوں پر بیٹھتے، جن پر لمبی جھالر والا اونی کپڑا پڑا ہوتا تھا۔ یہ نشستیں کچھ ایسی پھسلواں سی تھیں کہ بعض اوقات، ان پر رکھا ہوا اونی کپڑا بغیر کوئی آواز پیدا کیے فرش پر پھسل جاتا ۔

گرجے میں ہر چیز مسرت بخشتی تھی ۔ وہاں ایک بڑا سا ہنڈ ولوں والا فانوس لٹکا رہتا تھا۔ ان ہنڈ ولوں کو بانس کے سرے پر لگی، ایک موم بتی کے ذریعے جلایا جاتا تھا۔ یہ کبھی کبھار اس وقت روشن کیا جاتا تھا، جب گرجے میں اتنا اندھیرا محسوس ہوتا تھا کہ پادری لوگوں کو دیکھنے میں دقت محسوس کرتا تھا۔ وہاں ایک منبر بھی تھا، جس کے دونوں اطراف میں سیڑھیاں بنی تھیں تاکہ مبلغ منبر کی سیڑھیوں کی ایک طرف سے چڑھ کر دوسری طرف سے نیچے اتر جائے ۔ ہاں اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو................لیکن وہاں سب سے اچھی چیز، وہاں کی موسیقی تھی ۔

گرجے میں ان کے پاس، بس صرف ایک ہارمونیم ہی تھا اور ایک مہربان چہرے والی بوڑھی عورت اسے بجاتی تھی ۔ وہ اجتماع کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتی تھی کیوں کہ اس میں خود آگاہی کی حس ہی نہ تھی ۔ وہ گول سٹول پر جھک جاتی، جس کے کناروں پر، اس کے سکرٹ کی بھاری چھنٹیں پھیل جاتیں ۔ اس کے پاؤں پیڈلوں پر مستقل دباؤ ڈالتے وہ دھونکنی میں ہوا بھرنے کے لیے ایک یا دوبار، انھیں حرکت میں لاتی اور موسیقی ہر طرف پھیل جاتی ۔

ماں اور اس کا بچہ دونوں ہی اسے پسند کرتے تھے ۔ وہ اونچی آواز سے حمد گاتے ۔ تقریباً ایک ہی گیت تھا جو وہ اکثر گاتے تھے اور ہارمونیم ان کی آواز کے ساتھ ہاہاہا کی آواز شامل کرتا تھا۔

ایک بار گرجے میں چائے کی دعوت تھی اور اس میں وہ موجود تھا نشستوں کو اب کے گھومنے والی لکڑی کی پشت سے ترتیب دیا گیا۔ گوشت سے بھرا برتن، سینڈوچ، مٹھائی اور کیک چھوٹے بڑے اور نئے یا پرانے میز پوشوں پر رکھے تھے جو عاریتاً حاصل کیے گئے تھے۔ ایک اونچی جگہ پر تانبے کا سماوار پڑا تھا اور منبر کے اوپر لوگوں کے عین ہاتھوں کے سامنے چائے کے بڑے بڑے پیالے موجود تھے کسی نے گانا شروع کیا۔

''اے خدا............آ ہمیں اپنی قربت سے نواز''

اور کتنی دیر تک لوگوں نے اس گانے کو جاری رکھا۔

اور چھوٹا لڑکا اس دن خوشی سے اتنا مغلوب رہا تھا کہ گھر پر صحیح طور پر ناشتہ بھی نہ کر سکا تھا نہ ہی کھانا کھا سکا تھا وہ اس کو صدیوں پر بھاری محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کھانے کو کچھ جلد ملے ۔ اس تمام

عرصے میں جب لوگ اکٹھے رہے تھے اور گاتے رہے تھے۔ وہ اس سینڈوچ کی جانب تکے جا رہا تھا۔ جس کو اس نے اپنے دل ہی دل میں کھانے کے لیے چن لیا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب عبادت ختم ہوئی کھچڑی داڑھی والا ایک بوڑھا جھکا اور اس کے سینڈوچ پر جھپٹ پڑا۔ اور اس لیے وہ لڑکا ایک دم بہت غمگین اور بد دل سا ہو گیا اور بہت دیر تک تو اس نے کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔

اگر چہ چائے کی یہ دعوت کچھ اتنی خوش گوار نہ رہی تھی مگر اس کے بعد کے حالات نے اس شام کی کیفیت کو بدل دیا۔ چائے کی دعوت والے دن گرجے کے اندر واقع لباس وغیرہ رکھنے والے کمرے میں ہارمونیم رکھ دیا گیا تا کہ لوگوں کے لیے ہال میں زیادہ سے زیادہ جگہ کی سہولت ہو.......... وہاں اس چھوٹے لڑکے نے اسے (ہارمونیم) کو دیکھ لیا لڑکے نے سب کی نظریں بچا کر اس کے ڈھکنے کو کھولنا چاہا اور اسے یہ کھلا ہوا مل گیا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی KEYS پر رکھا تو اس کا دل، اس کے سینے میں زور سے اُچھلا.......... اس نے ان کو چھو کر بہت اچھا محسوس کیا اس نے بغیر پشت کی ایک کرسی، اس کے قریب کھینچی یہ ان کرسیوں میں سے ایک تھی جو اس کمرے کی روشنی کرنے والی جگہ تک پہنچنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور پھر وہ ان خاموش KEYS کو حرکت دینے کے لیے نیچے بیٹھ گیا۔ جلد ہی اس نے کوشش کی اور پیڈلوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ جب اس نے ہوا داخل ہونے کی ہلکی آواز سنی تو اس میں موسیقی بلند ہوئی .... کافی اونچی آواز تھی مگر اس کمرے میں ہر طرف پڑے کوٹوں اور ہیٹوں نے اس آواز کو اسی کمرے تک محدود رکھا جب کہ باہر سب لوگ آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ لمبے قد کی صاف ستھری عورتیں، جنھوں نے سفید ایپرن پہن رکھے تھے اور جن کے ماتھے پر گھنگھریالے بال گرے ہوئے تھے، لمبی میزوں کی صفائی میں لگی ہوئی تھیں۔ اس میں کچھ مزید ہمت پیدا ہوئی اور پھر اچانک ہی اس کے ہاتھ کے نیچے سے ایک دھن برآمد ہوئی یعنی "TOILING ON! HA,HA,HA HA" اس نے خوف اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بہت کوشش کی مگر وہ اس ایک لائن کے آگے کوئی دھن برآمد کرنے میں ناکام رہا۔

"موسیقی".............. وہ بڑبڑایا اور پھر اپنی ماں کی تلاش میں کرسی سے کودا.......... وہ برتن وغیرہ دھونے میں دوسروں کی مدد کر رہی تھی۔ وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے سکرٹ کا دامن کھینچنے لگا۔ ایک دوسری عورت نے اس پر جھک کر کہا "باہر جاؤ۔ یہاں بچوں کو آنے کی اجازت نہیں۔" وہ وہاں سے نہ ٹلا اور بڑی بے صبری سے اپنی ماں کی توجہ کا منتظر رہا۔ حتیٰ کہ اس کی ماں اس کی

طرف متوجہ ہوئی۔اس نے کہا:''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔اس نے ہاتھ میں پکڑا برتن صاف کرنے والا کپڑا نیچے رکھ کر اس اجنبی عورت کی طرف مسکراتے ہوئے معذرت کے انداز میں دیکھا اور کہا:''ہنری شاید کہیں باہر جانا چاہتا ہے۔'' جتنی دیر تک وہ ہال کمرے میں خوش گپیاں کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان رہا، خاموش رہا۔پھر اس نے کہا:''ماں میرے ساتھ آؤ میں تمھیں ہارمونیم بجا کر دکھاتا ہوں۔'' چوری چھپے وہ لباس والے کمرے میں چلے گئے اور انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔لڑکا جس کی آنکھوں میں خوشی سے گلابی رنگ چھلک آیا تھا، بولا:''لو سنو۔''

اس نے اپنے پاؤں کو نیچے دبایا اور نہایت اعتماد کے ساتھ وہ دھن بجائی یعنی''Toiling on''والی اس کی ماں چھوٹی سی لڑکی کی طرح اس کے قریب ہو گئی۔

اس نے کہا''ذرا ٹھہرو۔۔۔۔دوسری لائن کے لیے تو کوشش کرو۔''

اور پھر اچانک نہایت معجزانہ طور پر انھوں نے دوسری لائن کو پا لیا وہ بہت زیادہ خوش ہوئے جوں جوں آواز بلند ہوتی گئی ان کی خوشی بھی بڑھتی گئی اور جب ہارمونیم بجانے والی عورت مس اطلس نے دروازہ کھولا تو وہ دونوں مجرموں کی طرح وہیں جم گئے۔ایسی حالت میں کہ ان میں سے ایک اٹھنے کی کوشش میں تھا تو دوسرا وہیں بیٹھا تھا۔

مس اطلس نے قدرے درشت لہجے میں کہا:''تمھیں اس کو نہیں چھونا چاہیے تھا۔''

اس نے اسے بند کر کے تالا لگا دیا وہ اس کی طرف دیکھتے رہے اور کوئی لفظ کہے بغیر خاموشی سے وہاں سے کھسک لیے۔۔۔۔لیکن اس کے بعد گھر میں اب ان کے سامنے ایک نیا موضوع تھا۔وہ سینکڑوں مرتبہ اس واقع کا ذکر کرتے اور کبھی نہ تھکتے۔پھر ایک دن چھوٹے لڑکے نے کہا:'' کاش ہمارے پاس بھی موسیقی کا کوئی آلہ ہوتا۔''

اس کی ماں نے اس وقت تنور میں سے آخری روٹی اُتاری تھی اور اسے روٹی پکانے والے تختے کے آخری سرے پر رکھا تھا۔اس نے تنور میں سے روٹی اتارنے والا نیم گرم کپڑا ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور سوچنے لگی۔لڑکے نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا کیوں کہ وہ بھی مسکرا رہی تھی لیکن پھر غمزدہ سی ہو کر کہنے لگی:''تمھارا باپ ایسی کوئی چیز گھر میں لانے کی اجازت نہیں دے گا۔۔۔۔کیوں کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا۔''

لیکن اس کے بعد وہ پھر خوش ہو گئی کیوں کہ ان دونوں نے ایک خفیہ فیصلہ کر لیا تھا۔اس نے ہارمونیم کے لیے بچت کرنے اور پھر اسے خریدنے کا ارادہ کر لیا۔چوں کہ اس کے پاس زیادہ پیسے نہیں

تھے،اس لیے بچت کرنا بہت ہی مشکل تھا مگر اسے،اس کے لیے کوشش کرنا تھی حتیٰ کہ پیسہ پیسہ کر کے ایک چھوٹی سی رقم جمع ہوگئی۔

دومرتبہ تو لڑکے کے باپ پر اُن کا راز فاش ہوتے ہوتے رہا۔ایک بار تو اس وقت جب وہ موم بتی جلانے والے فلیتے کو اس کے مخصوص برتن میں تلاش کر رہا تھا اور دوسری بار اس وقت جب وہ اپنی کوئی چیز چھپا کر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا_______ لیکن خوش قسمتی سے وہ ان پیسوں تک نہ پہنچ پایا_______ بڑی بے چینی کے ساتھ تقریباً روزانہ ہی اپنی ماں سے دریافت کرتا۔

''کیا ابھی ہم خریدنے کے قابل نہیں ہوئے؟''

آخر کار اس کی ماں کو وہ سبزی فروش مل گیا، جو ہر جمعرات کو پیسوں ٹکوں کو شلنگوں میں تبدیل کرنے کو کہا کرتا تھا۔اس کے پاس یہ زیادہ تو نہ تھے مگر اس کا خیال تھا کہ وہ ان کی مدد سے کوئی پرانا باجہ خرید لیں گے، جس پر زیادہ لاگت نہیں آتی اور اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ اسے ہر بار کچھ نہ کچھ ادا کرتی رہے گی، جو کہ اس نے بچا کر رکھا ہوتا کیوں کہ اس نے کباڑیوں کے ہاں ایسے نوٹس پڑھے تھے، جہاں لکھا ہوتا تھا:''ادائیگی ایک ہفتے بعد''

پھر ایک روز خزاں کے موسم کے ابتدائی دنوں کی ایک اداس سہ پہر کو وہ گلی میں نکلے۔جب وہ رمنرڈن فیکٹری کے قریب سے گزرے تو اس کی مشینری کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کر رہی تھی۔مسز مارفیٹ اپنی شادی سے پہلے ایسی ہی ایک فیکٹری میں کام کر چکی تھی اور اب اچانک اس کی آواز،اسے واپس ان دنوں میں لے گئی۔یہیں اس نے اپنی بلوغت کے پہلے خواب دیکھے تھے، جب کہ ان خوابوں میں تھیک سٹون مارفیٹ کا کوئی دخل نہ تھا۔سڑک کے بالکل سامنے ہی ایک دروازہ تھا، جس میں کئی سوراخ تھے۔ اس نے اور لڑکے نے ان سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا وہ ان میں جھانکے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہاں پہیوں پر گھومتے ہوئے پٹوں اور دھول کے سوا کچھ نہ تھا جب تک،ان کے اشتیاق نے اجازت دی وہ جھانکتے رہے، پھر سیدھے ہو کر چلنے لگے۔وہ پُل پر سے گزر کر نیچے وادی میں آگئے اور پھر پہاڑی راستے کی طرف آئے۔مسز مارفیٹ کے ایک ہاتھ میں پیسوں والی تھیلی اور اس اشتہار کا تراشا تھا جو اس نے اخبار میں سے کاٹا تھا اس پر لکھا تھا:''موسیقی کے ہر قسم کے آلات برائے فروخت حاضر ہیں.......جو جی چاہے انتخاب کیجیے۔گلی نمبر ۱۴ لیونارڈ ٹیرس سے رجوع کریں۔''

بہرحال وہ لیونارڈ ٹیرس تک جا پہنچے۔وہاں سڑک اتنی شان دار تھی کہ ماں اور بیٹے نے کافی

دیر تک اپنے آپ میں گلی نمبر ۱۴ تلاش کرنے کی جرأت نہ پائی وہاں تین منزلوں والے بڑے بڑے مکان تھے، جن کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ ہر مکان کے سامنے رنگ دار ریلنگ والے باغیچے تھے۔ انھوں نے سوچا ان عمارتوں میں نہ جانے کیسے لوگ رہتے ہوں گے۔ انھیں محسوس ہوا وہ یقیناً کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ جب وہ وہاں سے آئے تو ایک بوڑھا آدمی اپنے کوٹ کے اوپر والے بٹنوں کو بند کرتا ہوا اور لرزتی ہوئی آواز سے بڑبڑاتا ہوا، ان کے قریب سے گزرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھٹا پرانا وائلن کا ڈبہ تھا۔ جب تک وہ کونے کی طرف مڑ نہ گیا وہ اسے دیکھتے رہے، پھر انھوں نے گلی نمبر ۱۴ کی عمارت کا دروازہ کھولا اور داخلے کے راستے کی طرف بڑھے اور دستک دی۔

ان کے سامنے ایک بڑا سا دروازہ تھا، جس کا دستہ عنبریں رنگ کا تھا۔ ہنری دستے کی طرف دیکھنے لگا وہ اس کی خوب صورتی سے اتنا متاثر ہوا کہ یہاں اپنے آنے کا مقصد ہی بھول گیا۔ یہ دروازہ ایک چوکور ہال میں کھلتا تھا۔ اس کے آگے ایک اور دروازہ، پھر اس کے آگے ایک گزرگاہ تھی۔ ایک کالی مونچھوں والا دُبلا پتلا اور لمبا آدمی، ان کی دستک کے جواب میں نمودار ہوا۔

مسز مارفیٹ نے پہلے اس شخص کی واسکٹ کی طرف دیکھا، پھر اپنے چھوٹے پاؤں کی طرف، لیکن کوئی لفظ اس کے منہ سے نہ نکلا۔ چھوٹے لڑکے نے جُرأت کر کے کہا۔

"جناب کیا آپ کے پاس۔۔۔۔"

اس نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر پھر اپنی ہی آواز کو، زیادہ اونچی محسوس کرتے ہوئے، وہ چپ ہو گیا۔

بھاری آواز میں اس آدمی نے کہا: "آگے آ جاؤ۔"

وہ دونوں چوکور ہال تک آگے بڑھ گئے مگر پھر ٹھہر گئے۔

اس آدمی نے ویسی ہی بھاری اور دھیمی آواز سے کہا: "میرے پیچھے چلے آؤ۔"

اور وہ دونوں اس کے پیچھے بغیر قالین کے فرش والے بڑے کمرے میں پہنچ گئے۔

"معاف کیجیے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ انھیں اس کمرے میں چھوڑ گیا۔

وہ کمرے کے قدرے اندھیرے حصے میں سارنگیوں، بربطوں، پیانوں اور دوسری طرح کی شکل کے موسیقی کے آلات میں گھر کر بالکل خاموش اور ساکت کھڑے رہے۔ حتیٰ کہ اس شخص کے واپس لوٹنے تک، انھوں نے اپنے سانس بھی روک کے رکھے۔ چھوٹے لڑکے نے اس وقت بہت فخر محسوس کیا، جب اس کی ماں نے براہِ راست اس شخص کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہارمونیم کی کیا قیمت ہے؟''

اور یہ کہتے ہوئے وہ کسی قدر مسکرائی بھی تھی، ایسی مسکراہٹ، جس میں خوف بھی شامل تھا۔ لڑکے نے اس وقت اسے بہت خوب صورت محسوس کیا جوں ہی اس نے قیمت سنی، وہ مڑی اورلڑکے کو زبردستی اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی، دروازے کی طرف بڑھی لیکن دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس آدمی نے اُن کا راستہ روک لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان سے باتیں کرنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بغیر کچھ خریدے ہی یہاں سے چلے جائیں۔

اس نے ان کو چھوٹا سا زرد رنگ کا مربع ڈبہ، جس پر سرخ پھول بنے ہوئے تھے، دکھاتے ہوئے کہا: ''میرے خیال میں یہ چیز آپ کو پسند آئے گی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ڈبے کو الٹا کر پرانی پیکنگ کے ڈبے پر رکھا۔ چھیدوں والے ایک کاغذ کے بنڈل میں، اسے دھکیلنا اور ہینڈل گھمانا شروع کیا۔ بچہ اور عورت دونوں بہت زیادہ خوشی کے باعث بُت بنے کھڑے رہے۔ اس خوشی کے مقابلے میں ہارمونیم تو کوئی چیز نہیں تھا۔ پہلی دھن جو اس کی بجی وہ تھی'' THE MIN,ISTREL BOY'' اور یہ دھن بہت عرصے پہلے مسز مارفیٹ نے اپنے سکول میں سیکھی تھی۔ اس نے سر کو جنبش دی اور گنگنانا شروع کر دیا اس وقت اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

لڑکے نے سرگوشی کی: ''اماں۔ یہ کیا ہے؟''

''یہ میوزک باکس ہے'' ماں نے جواب دیا: ''اور اگر یہ زیادہ مہنگا نہ ہوا تو ہم اسے خرید لیں گے۔''

اس نے سوچا کہ وہ اسے ہر وقت کچن میں بجایا کریں گے وہ اسے ڈریسر کے ایک کونے پر رکھ دیں گے اور اس کا خوب دھیان رکھیں گے۔ جب بارش کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوگی اور ہوا باہر بنجر میدان میں شور کرے گی، تو یہ ان کی ڈھارس بندھائے گا۔ پھر اس کے بعد جب ہنری سکول گیا ہوگا اور اس کے لیے تنہا گھر پر دن کاٹنا مشکل ہو رہا ہوگا (اور گو کہ سکول گھر سے کچھ زیادہ دور تو تھا ہی نہیں) یہ ہنری کو گھر کی طرف واپس سلامتی کے ساتھ لانے والا مقناطیس ثابت ہوگا۔

اس آدمی نے اپنے ذہن میں قیمت کا تعین کرتے ہوئے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور شک کے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

وہ پانچ شلنگ مانگنا چاہتا تھا مگر قسمت آزمائی کے لیے اس نے ایک شلنگ اور بڑھا دیا۔ کمرے کے کونے میں پڑے وائلن کی ایک تار ٹوٹی تو ان سب کا انہماک بھی ٹوٹ گیا۔

اس نے کہا: ''تم اسے چھ شلنگ کے عوض خرید سکتی ہو اور پھر اس کی تو اکیلی دھنیں اس سے زیادہ قیمت کی ہیں۔''

ماں بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا.......... بیٹا پرامید اور ماں خوش تھی پھر ان دونوں نے سانولے رنگ کے، اس شریف آدمی کی طرف دیکھا، جو جمائی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور چند لمحوں کے بعد ایک بار پھر وہ دونوں گلی نمبر ۱۳ کی لوہے کی ریلنگ کے پاس سے ہوتے ہوئے نو، سات پانچ، تین اور گلی نمبر ایک کے قریب سے گزر گئے۔ عورت نے کسی حد تک ڈھانپا ہوا، بڑا باکس یوں اٹھا رکھا تھا جیسے کوئی مقدس چیز ہو۔

وہ گھر اتنی جلدی پہنچ گئے کہ ایک لمحے کی بات محسوس ہوتی تھی۔ باکس نے ڈریسر کے کونے کی جگہ کو صحیح طور پر گھیر لیا۔ اس کے ڈھکنے پر پڑے سرخ پھول اپنی پلکیں جھپکا رہے تھے۔ انھوں نے لباس تبدیل کرنے سے پہلے کئی ایک دھنیں بجائیں۔

بچے کی ماں ہینڈل گھما رہی تھی اور بچہ اس کے پاس متانت کے ساتھ آنکھوں میں سرور سا لیے بیٹھا تھا۔ دونوں ہی خاموش ورماحول میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایک بار ماں نے اونچی اور اعتماد آواز میں کہا۔

''اگلے سال تمھیں ایک ہارمونیم بھی مل جائے گا۔''

حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ یہ بات بالکل ناممکن تھی۔ ویسے بھی اب ہارمونیم کا معاملہ کوئی خاص مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اور پھر اچانک انھوں نے قدموں کی آواز سنی۔

بچے نے مایوسانہ انداز میں کہا: ''ابا آ گئے۔''

اس کے لیے کھانا تیار نہ تھا۔

وہ دونوں خوشی سے تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ اچھل پڑے اور دروازے کی طرف بھاگے۔

بچے نے بڑی جرأت کے ساتھ، اس کے زرد پاجامے کا ایک کونہ پکڑا اور چلایا۔

''ابا۔۔۔۔ابا''

اس آدمی نے پوچھا: ''میری چائے کہاں ہے۔''

اس کی بیوی نے میز پر کچھ چیزیں رکھتے ہوئے کیتلی کو آگ پر رکھا اور کہا۔

''بس ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا۔''

لڑکے کا باپ کسی بات پر ناراض نظر آتا تھا۔ اس سہ پہر کو وہ ایک شلنگ ہار گیا تھا۔ کبھی کبھار وہ

گھوڑے پر کچھ رقم لگاتا تھا اور سوائے چند موقعوں کے وہ ہر بار ہارتا تھا لیکن ہر مرتبہ وہ پھر اس امید پر داؤ لگاتا تھا کہ شاید اس بار اس کی ساری کی ساری رقم واپس ہو جائے۔ اچانک اس کی نظر میوزک باکس پر پڑی۔

''یہ عجیب وغریب چیز کیا ہے؟ وہ غرایا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے چھوٹے لڑکے نے بسورنا شروع کر دیا۔

بچے نے محسوس کیا کہ اس کا باپ خاصا طاقتور ہے اور وہ اپنی طاقت کو بے دردی سے استعمال میں لائے گا۔ اس کی ماں کی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ چہرے کو چائے دانی کے پیچھے چھپائے کھڑی، کیتلی میں پڑے پانی کے ابلنے کی منتظر تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ اس بچے جیسا تھا، جو سزا پانے کے انتظار میں ہو۔

''ہاں تو مجھے بتاؤ۔۔۔۔ یہ عجیب وغریب چیز کیا ہے؟''

اس نے خاصے گھمنڈ سے یہ کہا تھا۔

وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی۔''یہ۔۔۔۔یہ میوزک باکس ہے''

اس نے بڑی افسردگی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

چھوٹے لڑکے نے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔ پھر ایں ایں کرتے ہوئے، اس نے ڈریسر کے کونے کی طرف سٹول کھینچا۔ اس پر کھڑا ہو گیا اور ہینڈل گھمانا شروع کیا۔

لڑکے کے باپ نے چند لمحوں تک سنا، پھر گہرا غصہ اس کے چہرے پر چھا گیا۔

پھر اس نے اٹھ کر بازو ہوا میں لہراتے ہوئے چلا کر کہا: ''بند کرو اس شور کو'' ۔۔۔۔''ایسی منحوس چیز گھر میں کون لایا ہے۔''

لڑکے نے ہینڈل گھمانا بند کر کے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی چمک غائب ہو گئی اور اس کی سیاہ آنکھوں کے گرد پیلاہٹ پھیل گئی۔ کیتلی پر رکھا ڈھکنا ہلنے لگا لیکن اس کی ماں نے گرم پانی چائے دانی میں نہ انڈیلا۔

''اسے میں لائی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی رنگت بھی لڑکے کی طرح سفید ہو گئی۔

وہ آدمی بولا: ''ٹھیک ہے تم اسے واپس کر آؤ۔''

وہ غصے کے ساتھ اس میوزک باکس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے اس چیز نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہو۔ کیتلی سے پانی باہر بہہ کر آگ پر پڑنے لگا اور صرف اسی پانی کی آواز کمرے میں سنی جا سکتی تھی۔

پھر اگلی صبح جیسے ہی وہ آدمی اپنے کام پر روانہ ہوا۔ اس عورت نے خاموشی سے باہر جانے کے

لیےلباس پہننا شروع کیا اس نے بچے کو اوورکوٹ پہنایا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر ہر طرف دھند تھی جب انھوں نے قدم باہر بڑھائے تو وہ کھانسنے لگے۔ وہ ناشتہ بھی نہ کر سکے تھے اور اس سرد صبح کی ہوا میں وہ کانپ رہے تھے۔ عورت ڈھکا ہوا میوزک باکس اٹھا کر جانے کو تیار تھی۔ وہ اتنی چلائی تھی کہ تھک گئی تھی اور ایسا ہی لڑکے نے بھی کیا تھا۔ انھوں نے دوبارہ میوزک باکس کو گھر میں رکھنے کی اجازت چاہی تھی اور اس چیز کا بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس وقت نہیں بجائیں گے جب وہ یعنی لڑکے کا باپ گھر پر موجود ہوگا۔

مگر اس نے صرف اتنا کہا: ''بس اسے واپس لے جاؤ۔''

وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کی بیوی اور اس کا بچہ موسیقی سے دل بہلائیں۔

وہ دونوں آہستگی سے چلنے لگے، جیسے باکس بہت ہی بھاری ہو۔ لڑکے کی ماں شرمندہ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کس طرح وہ واپس اس سانولے رنگ کے شخص کے پاس جائے۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ اس کی رقم واپس نہیں کرے گا۔ یہاں صرف ایک ہی بات اس کے حق میں تھی کہ اس نے اپنے خاوند کو نہیں بتایا تھا کہ اس کی کوئی قیمت بھی دی گئی تھی۔ بے شک اس کے لیے اس کے پاس وقت بھی نہ تھا کیوں کہ اس سارے وقت میں جب اس کا شوہر اس پر چیخ چلا رہا تھا تو اس کا لڑکا اس کے لباس کے ساتھ خاموشی سے چمٹا رہا تھا۔ وہ کئی بار سانس لینے کے لیے رکے اور آخر کار ایک بار پھر وہ سینٹ لیونارڈ یئرس پر موجود تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں دھند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مڑے تڑے پتوں والے درختوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے اور پیدل چلنے کا راستہ ایسا چکنا تھا کہ بہت مرتبہ وہ تقریباً گرتے گرتے بچے۔

جب لڑکے کی ماں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ دروازے پر دستک دی تو لڑکے نے عنبریں رنگ کے دستے کی نمی کو پونچھا تا کہ وہ اسے زیادہ اچھی طرح سے دیکھ سکے۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اسے گھما دیا اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے دروازہ اس کے پیچھے کھل گیا۔۔۔۔ وہاں کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔۔۔۔ وہ اپنی ماں کی طرف مڑا اور اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نہایت عاجزی سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔ اپنے ہاتھ سے دروازے کو دھکیل کر کھولتے ہوئے، اس عورت نے نہایت احتیاط کے ساتھ اس پارسل کو چھوٹے چوکور ہال کے فرش پر رکھ دیا اور پھر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔۔ اور کچھ ہی دیر بعد دو، وجود دھند میں غائب ہو گئے۔۔۔۔!!

☆☆☆☆

پیڈرو جوآن سوتو

کبوتر لوگ

''عورتوں، گھوڑوں اور کبوتروں کے بغیر اُس بادل پر سوار سورج پر چڑھتے ہوئے جب وہ بغیر کسی بُو کے بڑی تعداد میں ٹین کے ڈبے جلاتے ہیں تو وہ لوگوں کے (بغیر) میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

کسی شخص کے لیے بنایا گیا اور بیچا گیا سوٹ پہنے ہوئے جو کہ اُسے پورا آسکے (جو کہ اُس کے لیے نہیں تھا) اُس نے کھڑکی میں سے کبوتروں کو راستے کے آر پار چھجے کے نچلے کنارے پر منڈلاتے ہوئے دیکھا۔

''یا اُن دروازوں اور کھڑکیوں کے قریب جو ہمیشہ پروں کی طرح کھلی ہوئی ملتی ہیں۔''

اپنے ہاتھوں کو فضا میں لہراتے ہوئے، اُس نے کبوتروں کی طرح شور مچایا اور تبھی اُس نے اپنے پیچھے آواز سنی: ''میرے بچے، میرے بچے۔''

وہ اکتائی ہوئی عورت، جس کی آنکھوں میں سختی تھی، میز کے قریب (جس کے نیچے ایک کمزور سا سوٹ کیس پڑا تھا، جسے ایک رسی سے باندھا گیا تھا۔ یہ رسی اُس کی واحد چابی تھی) ایک کرسی میں کسی بھوکی اور بھلا دی گئی، بلی کی طرح دھنسی ہوئی تھی۔

''نہیں۔'' وہ بولا۔

ہلکا سا اشارا کرتے ہوئے، عورت نے کرسی کو میز سے پرے دھکیلا اور الماری کی طرف بڑھی۔ اُس نے روٹی کا وہ ٹکڑا، جو چاول کے ڈبوں پر کھلا پڑا تھا، لیا اور اُس شخص کی طرف آئی جو ابھی تک اشاراتی اظہار کرتے ہوئے منہ سے آوازیں نکال رہا تھا۔

''ایک کبوتر کی طرح۔''

''پاپ! شور مت کرو۔''

اُس عورت کی طرف توجہ دیے بغیر، کھڑکی کی سِل پر روٹی کے ٹکڑے کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

اُس نے زبان کو حرکت دینا بند کر دیا۔

''لوگوں کے بغیر میرا مذاق اڑایا جانا۔''

"A Pasiar a la palaza" اُس نے کہا۔
"ہاں، ہارٹینیا تمھیں سیر پر لے جانے کے لیے آ رہی ہے۔"
"وہ پلازا۔"
"نہیں پلازا اِس طرف نہیں۔ وہ اُسے وہاں سے لے گئے ہیں۔ وہ اُڑ کر چلا گیا۔"
اُس نے منہ پھُلا لیا۔ اُس نے دوبارہ کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کو سنا۔
"نہیں یہ کبوتر نہیں تھے۔" وہ بولی، "یہ ایک شیطانی شر تھا۔"
"اوہ۔"
"تم پاپا ڈایوس سے پلازا واپس لانے کی دعا مانگو۔"
اُس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "پاپا ڈایوس ۔۔۔ "Trai la plaza y el rio"
"نہیں نہیں" وہ بولی، "گھٹنوں کے بل جھک جاؤ اور پاپا ڈایوس سے منہ کھولے بغیر بات کرو۔"
وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کھڑکی کے سامنے جھک گیا اور اُس نے چھتوں کے اوپر سے باہر کی جانب دیکھا۔
"میں ایک کبوتر بننا چاہتا ہوں۔"
عورت نے ہفتے والے دن کی اس صبح کو، مردوں کی کاہلی اور مارکیٹ کی طرف سے آتی جاتی عورتوں کی پھرتی کو دیکھا۔
آہستہ سے غمگین انداز میں سر پر بوجھ اُٹھا کر، اُس کا توازن برقرار رکھنے والی عورت کی طرح، وہ اُس کمرے کی طرف بڑھی جہاں اُس کی بیٹی آئینے کے سامنے بیٹھی، ڈیسک کے اوپر اپنے بالوں سے پنیں نکالتی ہوئی اُن کا ڈھیر لگاتی جا رہی تھی۔
"ہارٹینیا، اسے آج مت لے جاؤ۔"
نوجوان عورت نے ترچھی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔
"ماما، اب اس قصے کو تم دوبارہ مت چھیڑو۔ اُس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ اُس کی بہت اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں گے اور اس پر ہمارا کچھ خرچ بھی نہیں آئے گا۔"
جب یہ پنوں سے آزاد ہو گئے تو اِس کے بال اُس کے کانوں پر گُتھے ہوئے چھلوں کے ڈھیر کی طرح گر گئے۔
"لیکن میں جانتی ہوں کہ کس طرح اُس کی دیکھ بھال کی جانی چاہیے۔ وہ میرا بچہ ہے۔ مجھ

سے بہتر اُسے کون جان سکتا ہے؟''

بارٹینا نے آئینے میں سے اُس دبلے پتلے جسم کی مالکہ کو بغور دیکھا۔

''ماما، تم بوڑھی ہو گئی ہو۔''

ایک بے گوشت ہاتھ آئینے کے سامنے لہرایا۔

''میں ابھی مری نہیں۔ میں اُس کو اب بھی سنبھال سکتی ہوں۔''

''ایسا نہیں ہے۔''

وہ کنگھی کے ذریعے بالوں کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن گھونگر ابھی تک گتھے ہوئے تھے۔

غم کے سمندر میں بھیگے ہوئے الفاظ کے ساتھ ماں نے کہا: "پائپ معصوم ہے۔ وہ ابھی بچہ ہے۔"

بارٹینیا نے کنگھی نیچے رکھ دی۔ اُس نے ڈریسر پر پڑے کھلے بیگ سے پنسل نکال کر اپنی باریک بھنوؤں کو سیاہ کرنا شروع کر دیا۔

''تم اُس کی تیمارداری نہیں کر سکتیں،'' اُس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا، ''تم اس بات کو اچھی طرح سے جانتی ہو۔ اس لیے بہترین چیز یہی ہے کہ۔۔۔۔''

بارٹینیا نے اپنے کندھوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پورٹو ریکو میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہاں یہ کچھ مختلف طرح سے ہو سکتا ہے۔ وہ وہاں باہر جا سکتا ہے کیوں کہ لوگ اُسے پہچانتے ہیں۔ لیکن نیو یارک میں لوگ پرواہ نہیں کرتے اور وہاں آپ کو اپنے پڑوس کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ زندگی مشکل ہے۔ سالہا سال سے میں سلائی مشین سے چمٹی ہوئی ہوں اور میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔''

لپ سٹک تلاش کرتے ہوئے، اس نے اپنی ماں کے چہرے کو آئینے میں منتشر ہوتے ہوئے دیکھا۔

''لیکن کوئی اور رویہ نہیں ہو سکتی۔ وہ وہاں اس کی بہتر طور پر دیکھ بھال کر سکیں گے۔''

''بس یہی کچھ ہے جو تم کہنا چاہتی ہو۔'' ماں نے کہا۔

بارٹینیا نے اپنے میک اپ کے سامان اور کنگھی کو بیگ میں پھینکا اور اسے بند کر دیا۔ وہ اپنے باریک بلاؤز، چمکتے ہونٹوں، سیاہ بھنوؤں اور گتھے ہوئے گونگھروؤں کے ساتھ مڑی۔

''ایک سال بعد ہم یہاں کسی قدر بہتری کے حق دار ہیں۔''

''جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا، اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔''

''لیکن ذرا سوچو کہ اگر وہ یہاں رہا تو ایسا ہو بھی سکتا ہے۔''

اُس نے اپنی ماں کا بازو پکڑ کر اُس کی چھوٹی آستین کو اوپر کھسکاتے ہوئے، اس کی طرف دیکھا۔اوپر کی طرف ڈھیلے بازو پر ایک جامنی دھبّا تھا۔

''وہ تم پر پہلے بھی ہاتھ اُٹھا چکا ہے اور میرے ساتھ وہ ایسا فیکٹری میں کر چکا ہے ۔یہ کوئی آسان بات نہیں ۔پتہ نہیں اُس کے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا ہو جائے ۔جب کہ اس مسئلے میں پہلے ہی ۔۔۔۔''

''اُس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔''

ماں نے اپنی آستین کو نیچے کی طرف کھینچتے ہوئے اور فرش کی طرف دیکھتے ہوئے ، اپنے بازو کو موڑا تا کہ بارٹینیا اُسے اپنی گرفت سے آزاد کر دے۔

''شاید وہ ایسا نہیں چاہتا ہو گا حالاں کہ اُس کا ہاتھ تمھارے گلے پر تھا؟ اگر میں نے وہ بوتل نہ دبوچ لی ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا ۔ہمارے پاس کوئی ایسا شخص نہیں جو کہ اس کے قریب موجود رہے ۔میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں اور تم اُس سے خوف زدہ ہو۔''

ماں نے کاہلی کے ساتھ خود کو اُس سے پرے کرتے ہوئے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا:''وہ بچہ ہے۔''

بارٹینیا نے آنکھوں کو بند کر دیا۔

وہی قصہ پھر سے شروع نہ کر دو۔میں نوجوان ہوں اور میرے آگے میری زندگی پڑی ہے اور اُس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے ۔تم بھی اب تھک چکی ہو اور اگر وہ یہاں نہیں ہو گا تو تم اپنی باقی ماندہ زندگی کو اچھے انداز سے گزار سکو گی اور تم جانتی ہو لیکن تم یہ سب کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتیں کیوں کہ تمھیں خوف ہے کہ ایسا کرنا غلط ہے ۔لیکن میں یہ کہتی ہوں کہ تم تھک چکی ہو اور یہی وجہ ہے تم نے کاغذات پر دستخط کر دیے تھے کیوں کہ تم جانتی ہو کہ اُس جگہ پر وہ اُس کی دیکھ بھال اچھے طریقے سے کریں گے اور تب تم آرام سے بیٹھ کر بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ سکو گی اور جب تمھیں خواہش ہو گی تو تم باہر نکل کر اُنھی کی طرح گھوم پھر سکو گی ۔لیکن تمھارے خیال میں یہ ایک جرم ہے اور میں تمھارے ساتھ ایک جرم کر رہی ہوں اور یوں تم خود کو ایک شہید کی ماں سمجھ رہی ہو اور تم ایک شہید کی ماں ہوتے ہوئے اس بات سے انکار نہیں کر سکتیں کہ تمھیں اپنے اور میرے بارے میں سوچنا چاہیے ۔کیوں کہ جب وہ دس سال کا تھا تو اُس گھوڑے نے اُسے گرا دیا تھا ۔۔۔'' ماں جلدی سے کمرے سے نکل گئی جیسے کہ اُسے وہاں سے نکالا گیا ہو، جیسے کہ کمرے نے خود اُسے باہر دھکیل دیا ہو جب کہ بارٹینیا کہہ رہی تھی:''اور اگلے بیس سال اُس نے بے شعوری کی حالت میں بسر کیے۔۔۔۔''

اُس نے اُس کے پیچھے جائے بغیر مڑ کر اُسے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ڈریسر پر جھک گئی جہاں اُس کی کہنیاں اتنے زور سے ٹکرائیں کہ اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''ہم نے اُن سالوں کو اُس کے ساتھ بسر کیا۔'' اُس نے آئینے میں اپنے چہرے کو ہسپٹر یائی کارنیوال ماسک کے طور پر دیکھا۔

''اور وہاں پرندوں کے بسیرے کی کوئی جگہ نہیں،اور وہاں کتے بھی نہیں اور وہاں گھنٹیاں بھی نہیں ہیں اور دریا سے چھونے والی ہوا بھی نہیں اور سینما کی کوئی گھنٹی نہیں اور یہاں سورج نہیں آتا اور مجھے یہ پسند نہیں۔''

ماں نے کھڑکی کی سِل کے ساتھ لگ کر وہاں دیکھتے اور جھکتے ہوئے کہا: ''شکر ہے۔'' نیچے گلی میں لڑکے ایک جھنڈ کی شکل میں ایک گیند کو ٹھوکر مارتے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

''اور یہاں اندر ٹھنڈ سوتی، بیٹھتی اور چلتی ہے اور مجھے یہ پسند نہیں۔''

''شکر ہے بچے،شکر ہے، کہو،آمین۔''

''آمین۔''

اُس نے اُسے اٹھنے میں مدد دی اور اُس کا ہیٹ اُس کے ہاتھ میں دیا۔ اُس نے دیکھا ہارٹینیا نہایت سنجیدگی سے سرخ آنکھوں کے ساتھ اُن کی طرف آرہی تھی۔

''پائپ،آؤ چلیں۔ماما کو پیار کرنے دو۔''

اُس نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور سوٹ کیس اُٹھانے کے لیے نیچے جھکی۔ماں نے خود کو اُس کی گردن کے قریب کیا۔اُس نے اپنے ہاتھ اُس کے گرد مضبوطی سے جما کر جلی ہوئی سرخی مائل چہرے کی جلد کو، جس کی آج صبح ہی اُس نے شیو کی تھی، انگلیوں سے سہلاتے ہوئے چوم لیا۔

''آؤ چلتے ہیں۔'' ہارٹینیا نے سوٹ کیس اور بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی ماں کے بازوؤں سے بل کھاتے ہوئے نکلا اور جس ہاتھ میں اُس نے ہیٹ پکڑ رکھا تھا،اُسے ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑا۔

''بچے اپنا ہیٹ پہن لو۔'' ماں نے کہا اور اپنی آنکھوں کو جھپکایا تا کہ وہ اُس کے آنسو نہ دیکھ سکے۔

مڑتے ہوئے اُس نے ہیٹ اُٹھا کر اپنے ویزلین سے چپڑے بالوں کے اوپر رکھ لیا۔ وہ ایک کھلونے کی طرح اتنا چھوٹا لگ رہا تھا جیسے کہ وہ اپنے سوٹ کے بچے کھچے مواد کا بدل نظر آنا چاہتا ہو۔

''نہیں، اسے یہیں چھوڑ دو۔'' ہارٹینیا نے کہا۔

پائپ نے منہ بنایا۔ ماں نے اپنی نظریں ہارٹینیا پر جما دیں اور اُس کی ٹھوڑی کانپنے لگی۔

''ٹھیک ہے۔'' ہارٹینیا نے کہا،''تم اسے اپنے ہاتھ میں پکڑلو۔''

وہ دوبارہ دروازے کی طرف گیا اور اُس کی ماں نے تھوڑا سا اُس پر جھک کر اُس کے بازو پکڑ لیے جو کہ اُس کی طرف پھیل جانا چاہتے تھے۔

ہارٹینیا نے اُسے روک دیا۔''ماما، وہ اُس کا پورا خیال رکھیں گے۔''

''میں پسند نہیں کرتی کہ وہ اسے ماریں۔''

''نہیں، وہاں ڈاکٹرز موجود ہیں۔اور تم ۔۔۔۔۔ہر دوسرے ہفتے میں تمھیں وہاں لے جایا کروں گی۔''

اُن دونوں نے کوشش کی کہ اُن کی آوازیں ہموار رہیں۔

''ماما، جا کر لیٹ جاؤ۔''

''اس سے کہو کہ وہ وہاں رکا رہے۔اور ہر چیز کھائے۔''

''ہاں۔''

ہارٹینیا نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ کیا پائپ لینڈنگ پر رکا ہوا تھا؟ وہ ریلنگ پر جھکا ہوا نیچے تھوک رہا تھا اور اپنے تھوک کو نیچے جاتا دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

''ماما، میں جلد ہی گھر لوٹ آؤں گی۔''

ماں اس فضول سی نظر آنے والی کرسی کے پاس کھڑی، اُس جسم میں سے جس نے داخلی راستے کو روک رکھا تھا، اُسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ماما، لیٹ جاؤ۔''

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ اپنے سامنے آپس میں ملے ہوئے اپنے ہاتھوں کے ساتھ اُس وقت تک ساکت رہی جب تک کہ اُس کی چھاتی اور کندھوں نے تشنجی اور نازک انداز میں ہلنا شروع نہیں کر دیا اور جب تک کہ اُس نے ہچکی کی طرز کی سسکیاں نہ لینی شروع کر دی تھیں۔

ہارٹینیا نے دروازہ بند کیا اور پائپ کے ساتھ جلدی سے سیڑھیوں سے نیچے آنے لگی۔جون کے اُس دن کی دوپہر کی بے پناہ شفافیت کا سامنا کرتے ہوئے اُس کے اندر سمندری طوفانوں، گرہنوں اور برف باریوں کی خواہش پیدا ہوئی۔

آگستو روا بستوس

خالی پن

وہ لٹے پٹے تھے اور یوں اندھیرے کے سپرد کر دیے گئے تھے کہ اُن کا کوئی چہرہ ہی نہ تھا۔ وہ جو کسی غیر واضح انسانی تصویری خاکے سے کچھ زیادہ نہیں لگ رہے تھے، ان دونوں کے جسم خود اُن کے اپنے سایوں میں ہی مدغم ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نہایت معصومانہ مفعولیت یا بالکل مطلق لاتعلقی کے ساتھ زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ سست روی سے رینگ رہا تھا۔ دوسرا جھکا ہوا اور بھاری سانسیں لیتا ہوا، اپنے آپ کو جھاڑیوں اور کوڑا کرکٹ کے درمیان سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بعض مواقع پر وہ اپنی سانسیں بحال کرنے کے لیے رک بھی جاتا تھا۔ تب وہ اپنی کمر کو جھکائے ہوئے ، اپنے اوپر لدے بوجھ کو پھر سے مزید کھینچنا شروع کر دیتا۔ ندی کے گندے پانی کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر یہاں کے اُجاڑ پن کی پھپھوندی کے بھبھکوں کی بدبو اور جانوروں کے لئے جیسے فضلے کی بدبو جو کہ گندے موسم کی بنا پر برآمد ہو رہی تھی کو وہ شخص گاہے گاہے اپنے ہاتھوں کی حرکت سے اپنے چہرے سے پرے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اردگرد پھیلے خس و خاشاک سے ٹکراتی دھات اور شیشے کی چاندی جیسی چمک کے درمیان موجود ہوتے ہوئے، ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی یقیناً وہاں کے بھوتوں جیسے یک ساں ارتعاش والے چھوٹے سے گیت کو نہیں سن رہا تھا۔ اور نہ ہی شہر کی اُس خاموش کر دی گئی آواز کو، جو کہ زمین کے نیچے تھرتھراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نہ ہی وہ جو کہ اپنے آپ کو آگے کی طرف گھسیٹ رہا تھا، وہ شاید صرف زمین کے ساتھ سرکتے ہوئے اس جسم کی مدہم اور نرم آواز، کاغذ کے ٹکڑوں کی چرچراہٹ یا اپنے جوتوں سے ٹکرانے والے کاٹھ کباڑ اور ٹین کے خالی ڈبوں کی آواز سن سکتا تھا۔ بعض اوقات اس دوسرے کا کندھا چٹان پر یا سخت ٹہنیوں میں الجھ جاتا تھا۔ وہ کسی قدر غصے بھرے احتجاج کے تحت بڑبڑاتے ہوئے اپنے اوپر لدے بوجھ کو جھٹکا دے کر ڈھیلا کرتا ہے یا اُسے محسوس کرتے ہوئے منہ سے ان جہازی قلیوں جیسی آواز نکالتا ہے، جیسی کہ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے سرکش بوجھ کے تحت کرتے ہیں۔ یہ ظاہری بات تھی کہ اس کا بوجھ بھاری تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس انفعالی مزاحمت کی بنا پر بھی کہ

جو وقتاً فوقتاً رکاوٹوں کے لمحات میں اس کو رکنے پر مجبور کررہی ہوتی ہے اور شاید اس پیچھے کی طرف دھکیلے جانے یا عجلت کی وجہ بھی ، کہ جس کی بنا پر اس کی طاقت آہستہ آہستہ ختم ہو کر جتنی جلدی ممکن ہو، اسے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی طرف لے جانے والی تھی ۔

پہلے پہل یعنی آغاز میں اس نے اسے بازوؤں سے کھینچا تھا۔اگر یہ رات اتنی ابر آلود نہ ہوتی تو کوئی بھی آپس میں جڑے ہوئے ان دو ہاتھوں کو اُلٹے انداز کی مدد کی منفیت کی شکل میں دیکھ سکتا تھا۔ جب وہ جسم پھر کسی چیز میں الجھ گیا تو اس نے اپنی کمر اس کی طرف موڑتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور ان نے نیچی جگہوں میں گرگر کر بوجھ کو کھنچنا شروع کیا۔ دوسرے آدمی کا سر شادمانی سے ادھر ادھر ہو رہا تھا جیسے کہ اسے یہ تبدیلی پسند آئی تھی ۔ جب وہ ناہموار زمین، خس وخاشاک اور کوڑے کے ڈھیروں تک پہنچا تو ایک کار کی قوس بنائی ہوئی روشنی کی چکاچوند ہر طرف پھیل گئی۔ کھینچنے والا شخص اس دوسرے کے پہلو میں لیٹ گیا ۔ایک لمحے کے لیے لگا جیسے ایک مدھم سے انداز میں کھینچے گئے اسکیچ کی طرح چہرہ انھیں مل گیا ہو۔ایک نیلا ڈرا ہوا اور دوسرا گرد سے ڈھکا ہوا، دیکھنے میں دونوں ہی کسی قسم کے احساس سے عاری تھے۔اندھیرے نے اُن دونوں کو دوبارہ نگل لیا۔

وہ اُٹھ بیٹھا اور اس نے تھوڑا سا آگے کی طرف گھسیٹنا شروع کیا لیکن اس وقت تک وہ ایسے مقام تک پہنچ گئے تھے، جہاں کہ جھاڑیاں کچھ زیادہ اونچی تھیں ۔اس نے اسے جہاں تک کہ وہ کر سکتا تھا کوڑے کرکٹ، خشک ٹہنیوں اور خس وخاشاک کا لباس پہنا دیا۔لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ اسے اجاڑ جگہ کی بد بو یا جلد ہی برسنے والی بارش سے محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔وہ رک گیا اس نے اپنا بازو اس کے گیلے ماتھے سے صاف کیا، وہ کھنکارا اور اس نے غصے سے ایک طرف تھوک دیا۔عین اس لمحے ایک نوزائیدہ بچے کے چلانے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔کمزور اور دبی ہوئی یہ آواز اس جھاڑ جھنکار سے یوں برآمد ہوئی جیسے کہ اُس ''دوسرے'' نے کوڑے کرکٹ میں سے ایک نئے پیدا ہونے والے بچے کی طرح رو کر شکایت کرنا شروع کیا ہو۔

وہ وہاں سے بھاگنے ہی والا تھا کہ وہ آسمانی بجلی کی چمک سے مبہوت ہو کر رک گیا۔بجلی کی اس چمک نے لوہے کے اُس عظیم الجثہ پل کو اندھیرے سے اچک کر اس کے بہت نزدیک لا کر رکھ دیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس نے بہت ہی تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا۔اس نے اپنا سر شکست کے انداز میں جھکا دیا۔وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور ارد گرد سونگھتے ہوئے وہ اس مسلسل مگر دبی ہوئی کمزور آواز کی طرف بڑھا۔

ڈھیری کے نزدیک ایک سفید جسامت موجود تھی۔ وہ شخص وہاں کافی دیر رکا رہا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ وہاں سے جانے کے لیے اٹھا۔ اس نے چند ایک غیر متوازن سے قدم اُٹھائے لیکن زیادہ دور نہ جا سکا۔ بچے کے چلانے کی آواز، اس کو پیچھے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس نے بھاری سانسوں کے ساتھ راستے کو طے کرتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے پیچھے آنا شروع کیا۔ وہ اب بھی جھجکتے ہوئے ایک بار پھر جھکا۔ تب اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ بنڈل کا غلاف چرمرایا۔ وہاں اخباری کاغذوں میں لپٹا ایک ننھا سا انسانی وجود مچل رہا تھا۔ اس آدمی نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ آدمی کی حرکت جبلی طور پر غیر واضح اور مبہم سی تھی۔ کسی ایسے شخص کی حرکت جسے معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے لیکن وہ ایسا کرنے سے خود کو روک نہ پا رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ سے سیدھا ہوا جیسے کہ وہ بہت ہی غیر متوقع قسم کے نازک احساسات میں جکڑ لیا گیا ہو، جن سے چھٹکارا پانا، اب اس کے لیے مشکل ہو گیا ہو۔ اس نے اپنی جیکٹ اُتاری اُس نے اسے اُس کانپتی ہوئی گیلی سی مخلوق کا لباس بنا دیا۔

رفتار پکڑتے ہوئے اور تقریباً دوڑتے ہوئے اس نے اس روتے ہوئے بچے کے ساتھ اس کچرے کو پار کیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆☆

مرادسر خانوف

مخطوطہ

میں ترکمان سائنس اکیڈمی کے لیے قدیم مخطوطات اکٹھے کر رہا تھا۔ اپنے اس کام کے ضمن میں ان چرواہوں کی بستی میں جا پہنچا جنھوں نے ''کاراکم'' صحرا کے وسط میں موجود ایک چھوٹی سی گہری وادی میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

چوں کہ یہ ایک قدرتی امر تھا' اس لیے وہاں کے رہنے والے یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کہاں سے آیا تھا اور یہ کہ وہاں میری موجودگی کا کیا مقصد تھا۔ میں نے انھیں اپنے کام کے بارے میں بتایا۔ اجتماعی فارم کے چیئرمین نے، جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا، اتنا بتایا کہ اس کے پڑوسی ولمورت آغا کے پاس وہ چیز موجود تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔

''یہ ایک نایاب چیز ہے۔'' اس نے کہا: ''ولمورت آغا اپنے تمام اثاثے سے زیادہ قیمتی اسے ہی تصور کرتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ ایسی کتاب کو سونے کے صندوق میں رکھنا چاہیے۔''

میں اس کے مالک کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ ولمورت آغا گھر پر ہی تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا، جس کی خوب صورت داڑھی اس کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے تجسس بھرے انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایک شکاری جیسا تھا مگر اس کا انداز دوستانہ تھا۔

''آؤ نوجوان۔ یہاں آتش دان کے قریب بیٹھو۔'' اس نے نرمی سے کہا اور مجھ سے سوالات کرنے لگا۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟'' میں نے اسے بتایا۔

''تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟ تمھارا قبیلہ کہاں ہے؟ تم کیا کرتے ہو؟''

میں نے اختصار کے ساتھ اپنے متعلق بتایا اور گفتگو بڑھاتے ہوئے کہا کہ: ''مجھے اکیڈمی کی طرف سے قدیم مخطوطات کا کھوج لگانے کا کام تفویض کیا گیا ہے۔''

بوڑھے آدمی نے اپنی داڑھی کو تھپکتے ہوئے کہا: ''بہت اچھی بات ہے۔۔۔ بہت ہی اچھی۔''
اس نے مجھ سے مزید سوالات کیے اور پھر اپنی بیوی کی طرف مڑتے ہوئے کہا: ''وہ کتاب لاؤ۔''

بوڑھی عورت خاموشی سے خیمے کی جالی دار دیوار سے لٹکتے ہوئے موٹے کپڑے کے تھیلے کی طرف بڑھ گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ کڑھائی شدہ ریشمی کپڑے میں لپٹی کتاب نکال لی۔ ایک مقدس یادگار کی طرح اس نے نہایت احترام کے ساتھ اُسے اپنے خاوند کے حوالے کر دیا۔

بوڑھے آدمی نے دوبارہ میری طرف غور سے دیکھا۔

''جیسے تم نے بتایا ہے کہ تم خاص اسی مقصد کے لیے آئے ہو تو تم خود محسوس کرو گے کہ یہ کتنا قیمتی خزانہ ہے۔''

بھاری مخطوطہ ایک ایسے بدرنگ سوتی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا' جس پر اب بھی معدوم ہوتے ہوئے قرمزی پھولوں کی باقیات موجود تھیں۔ اس کے ہر صفحے پر سرخ روشنائی میں عربی رسم الخط کی نہایت ہموار سطریں موجود تھیں۔ متن بالکل واضح تھا کیوں کہ نقل کرنے والا اپنے کام سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ہر حرف ایک چھوٹے سے موتی کی طرح تھا۔ کتاب یقینی طور پر کثرت سے پڑھی جا چکی تھی۔ صفحات کے کونے مڑے تڑے اور گندے تھے۔

میں نے چند سطور کا مطالعہ کرتے ہوئے جلدی جلدی ورق گردانی کی۔ یہ یقیناً ایک مخطوطہ تھا جس کی وجہ سے میرے جیسے پیشے سے منسلک لوگ' راتوں کو جاگنے' ایک بستی سے دوسری بستی تک سفر کرنے اور ہزاروں دروازوں پر دستک دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سینکڑوں دور افتادہ مقامات پر خیموں کی خاک چھاننے پر شاید ایسی قیمتی چیز تلاش نہ کر پاتا جیسی کہ اس وقت میرے ہاتھوں میں تھی۔

سب سے اہم کام اپنے جوش کو بوڑھے آدمی سے چھپانا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ اپنی اس چیز کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف تھا۔ اسی لیے وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ ''اس کتاب کا ہر لفظ ایک اونٹنی اور اس کے بچے جیسی قدر کا حامل ہے۔''

میں نے بوڑھے آدمی کا امتحان لینے کی خاطر کئی پیراگراف نہایت اونچی آواز میں پڑھے۔ جب میں چند سطریں پڑھ لیتا تو وہ اپنی یادداشت کے بل بوتے پر اس سے آگے سے بیان کرنا شروع کر دیتا۔

''ہاں تو نوجوان اب تو تمھیں یقیناً پتہ چل گیا ہوگا کہ کیوں یہ کتاب ایک سونے کے صندوق میں رکھے جانے کے قابل ہے؟''

اس نے گائیکی کے انداز میں ایک نظم مجھے سنائی۔۔۔یہ یقیناً اس کی پسندیدہ نظموں میں سے ایک تھی۔

''تم کو یہ کیسی لگی؟''اس نے پرجوش انداز میں پوچھا۔

''جوں جوں تم پڑھتے جاؤ گے تم اس کے اسیر ہوتے چلے جاؤ گے۔''

یہ سب کچھ تو واقعی بہت اچھا تھا لیکن اب مسئلہ تو اس کتاب کو اپنے قبضے میں لینے کا تھا۔بوڑھے آدمی سے اس کا حصول بظاہر ناممکن تھا۔خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کی بیوی اور اس کے پڑوسی اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا' موضوع ہی بدل دیا۔میں نے بوڑھے آدمی سے پوچھا کیا واقعی اس کا قبیلہ آمو دادریا میں فارم کرنے اور وہاں آباد ہونے کا ارادہ رکھتا ہے؟اس نے میرے سوال کا جواب دیا اور کتاب کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔اسے اس انمول خزانے کا مالک ہونے پر بہت فخر تھا اور وہ اسے اپنے سے جدا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میں نے اس مخطوطے کو حاصل کرنے کے طریقہ کار سے متعلق اجتماعی فارم کے چیئر مین سے مشورہ کرنے کا سوچا اور وہاں سے چلا آیا۔

''اس کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔''وہ تو شاید مجھے اس کی نقل کرنے کی اجازت بھی نہیں دے گا۔''

اجتماعی فارم کے چیئر مین نے جواباً کہا:''اگر تمھیں اس کی اتنی شدید ضرورت ہے تو تم خود ہی اس کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکالو میں اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

اسی شام کو میں پھر ولمورت آغا سے ملنے جا پہنچا۔ایک بار پھر اس نے مجھے نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا:''میں جانتا تھا کہ تم پھر آؤ گے۔۔۔۔جو کوئی بھی میرے اس خزانے کو ایک نظر دیکھ لیتا ہے دوبارہ ضرور آتا ہے۔تم اس حوالے سے پہلے شخص نہیں ہو اور تم آخری بھی نہیں ہو گے۔''

''ٹھیک ہے اگر تمھاری خواہش ہے تو اس کا مطالعہ کرلو۔''

میں اپنے دل میں چھپی خواہش کو کسی حد تک آشکار کرنے پر تل گیا۔

''ولمورت آغا!''

''ہاں۔''

''کتنے عرصے سے یہ کتاب تمھارے پاس ہے؟''

''چالیس سال سے۔''

''چالیس سال سے۔۔۔؟''میں نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں بیٹے۔''

''اچھا تو اسی لیے تمھیں اس کی بہت سی شاعری زبانی یاد ہے۔''

''اس کتاب کا ہر لفظ میرے دل پر نقش ہے۔میں سارے کے سارے گیت گا سکتا ہوں۔ ان کی عظمت میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔''

''یہ غیر معمولی بات ہے''میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تمھیں اس کتاب کو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی۔''

بوڑھے آدمی نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔

میں قدرے پریشان سا ہو گیا مگر میں نے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:''تم جو چاہو اس کا معاوضہ مجھ سے لے لو مگر یہ کتاب تم مجھے دے دو۔''

بوڑھے آدمی میں ایک عجیب سی تبدیلی در آئی۔اس کی آنکھیں ایک دم پھیل سی گئیں۔اس کی حالت غیر ہو گئی اور وہ پیلا پڑ گیا۔بوڑھے آدمی نے کتاب اپنی بیوی کے سپرد کرتے ہوئے کہا:''اسے فوراً واپس وہیں رکھ دو۔''

اپنی حالت پر قابو پا کر وہ دوبارہ نرم آواز میں بولا۔

''میرے بچے کیا میں اور میری بیوی نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت نہیں کر دی کہ ہم اسے کبھی اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہیں دیں گے۔''

اور چوں کہ تم مہمان ہو،اس لیے ایک بار پھر میری تم سے درخواست ہے کہ اس بات کو اب نہ دہرانا ۔اگر کسی طرح میں مان بھی جاؤں تو میری بیوی کبھی اسے دینے پر رضامند نہیں ہو گی۔اگر وہ بھی ایسا کرنے پر تیار ہو جائے تو قبیلہ اس سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہو گا۔بدترین قحط کے دور میں بھی جب کہ گھر میں اناج کا ایک دانہ تک نہ تھا' میں اس کتاب کو بیچنے کا خیال بھی دل میں نہیں لایا۔اور پھر اس

کے علاوہ تم نہیں جانتے کہ یہ میرے قبیلے میں کیسے آئی؟''

بوڑھا آدمی خاموش ہو گیا۔تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ اتنی نرمی کے ساتھ گویا ہوا جیسے کہ وہ خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ میں نے اسے کیسے حاصل کیا تھا؟ میں نے یہ بات پہلے کسی کو نہیں بتائی۔۔۔میرے اور میری بیوی کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اس کہانی سے واقف ہوگا۔۔۔''

''پلیز مجھے بتایئے۔۔۔ولمورت آغا۔''میں نے کہا اور ایسا کہتے ہوئے اب مجھے اپنے تجسس کو چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔ولمورت آغا نے اپنا ہاتھ خیمے کی دیوار پر مارتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔

''میں اس وقت ۶۵ سال کا ہوں۔یہ کتاب میرے پاس پچھلے چالیس سال سے ہے۔جس برس میں نے کتاب حاصل کی اس برس کو یخ بستہ سال کہا گیا تھا۔میں ان دنوں چرواہا تھا۔جیسا کہ میں ہمیشہ رہا ہوں اور مجھے اس بات کا کچھ شعور نہیں تھا کہ کتابیں کیسی ہوتی ہیں۔میں نے صرف ان کے بارے میں سن رکھا تھا۔میں شادی کر چکا تھا اور اپنے ذاتی خیمے میں رہائش اختیار کر چکا تھا۔تب میں نے ایک اونٹنی خریدی۔چوں کہ میں اب بال بچوں والا شخص تھا اور میری کچھ ذمہ داریاں تھیں اس لیے میں نے موسم سرما کے لیے کافی مقدار میں اناج ذخیرہ کرنے کے لیے''ارکاچ''جانے کا فیصلہ کیا۔میں نے اپنی اونٹنی پر کچھ اون لادی'تھوڑی سی لکڑی جلا کر کوئلہ حاصل کیا اور چل پڑا۔میں''ارکاچ'' میں کسی کو نہیں جانتا تھا اس لیے جس شخص کے ہاتھ میں نے اون اور کوئلہ بیچا تھا اس کے پاس ٹھہر گیا۔وہ ایک امیر آدمی تھا۔شام کے وقت قبیلے کے لوگ اکٹھا ہونا شروع ہوئے۔ان میں سے ایک اٹھ کھڑا ہو گیا۔اس نے بڑے ٹھاٹھ والا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی داڑھی حکم کے پتے پر موجود شکل جیسی تھی۔اس کا چہرہ بھاری اور سرخ تھا۔لوگوں نے اسے ملاں کہہ کر پکارا۔

تب مہمانوں میں سے ایک نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:'محترم ملاں صاحب' کیا آپ ہمارے لیے کچھ پڑھنا پسند فرمائیں گے؟''

''کسی نے اسے یہ کتاب پکڑا دی لیکن ملاں نے انکار کرتے ہوئے کہا:'ارے بے مغزو! اس کتاب کو ایک پاگل شاعر نے لکھا تھا جس نے مقدس عقیدے کی تضحیک کی تھی۔یہ فرسودہ خیالات' گندگی اور گھن آلود نصیحتوں کا پلندہ ہے۔یہ تو نہیں البتہ ایک اور چیز آپ کے لیے پڑھوں گا اور اس نے اپنے

لبادے سے ایک اور مخطوطہ برآمد کیا۔لیکن لوگ اس کو سننے پر آمادہ نہ ہوئے۔کسی نے اسے تحفہ دینے کا وعدہ کیاتو اس نے پہلے والی کتاب ہی پڑھنے پر رضامندی ظاہر کردی۔وہ آدھی رات تک پڑھتا رہا پھر صبح تک پڑھتا گیا اور میں نے ایک مبہوت شدہ شخص کی طرح اسے سنا۔کتاب نے حیران کردیا تھا۔میرے اندر کچھ ہو رہا تھا۔کافی دیر تک میں سمجھ ہی نہ سکا میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔یہاں ایک شخص تھا جو کاغذات کو الٹ پلٹ رہا تھا اور ان کے ذریعے ایک شخص کو زندگی کی کہانی سنائی جا رہی تھی' لیکن میں جو ہر لفظ کے ساتھ اپنے آپ کو بندھا ہوا پا رہا تھا' مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ میری ہی کہانی مجھے سنا رہا تھا۔الفاظ بے حد واضح اور پرکشش تھے۔میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کتابیں اتنی طاقتور بھی ہوتی ہیں اور زندگی کو اس خوبی سے بیان کرتی ہیں' بندہ چیزوں کو بالکل مختلف انداز میں دیکھنا شروع کردیتا ہے۔میں نے اس طرح سوچا' جیسے آج تم نے سوچا ہے شاید دنیا میں اتنی دولت موجود ہی نہ ہو جو اس کتاب کو خرید سکے کیوں کہ ایسی چیزیں بکاؤ مال نہیں ہوا کرتیں۔میرے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اس کتاب کی کوئی قیمت مقرر ہے اور میرے پاس اتنی رقم موجود ہو تو مجھے اسے ضرور خرید لینا چاہیے۔''

اگلی صبح جیسے ہی میں نے اپنے میزبان کو دیکھا تو کہا: ''پچھلی رات ملاں نے جو کتاب پڑھی تھی اس کی قیمت کیا تھی؟''

وہ ہنس کر کہنے لگا: ''اس کی کوئی مقررہ قیمت تو نہیں ہے کتاب کسی عورت کی شال یا ککلوں سے بھری بوری نہیں ہوتی۔تم آسانی سے اس کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے۔''

وہ پھر ہنس پڑا اور اس نے، اس وقت کمرے میں موجود ایک مہمان کے ساتھ اپنی نظروں کا تبادلہ کیا۔پھر وہ بولا: ''اس کی قیمت ہے ایک اونٹ۔۔۔۔ایک اچھا اونٹ۔''

شاید وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔لیکن میں نے اس کے الفاظ کو سنجیدگی سے لیا اور خوشی سے پھولا نہ سمایا۔فوری طور پر میں نے اسے اپنی اونٹنی دینے کا فیصلہ کرلیا جس پر سوار ہو کر میں ''ارکاچ'' آیا تھا۔

''میرے پاس ایک بہت عمدہ اونٹنی ہے جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہے۔یہ دونوں لے لو اور کتاب دے دو!''

میرے میزبان نے کہا: ''ٹھیک ہے۔۔۔۔اونٹنی چھوڑ جاؤ اور کتاب لے جاؤ۔۔۔خدا تمھارا حامی و ناصر ہو!''

میں نے ایک نظر اونٹنی کی طرف دیکھا کتاب کو اپنی بغل میں دبایا اور واپس گھر کی طرف چل

پڑا۔گھر تک پیدل چلنے میں مجھے تین دن لگے۔

میری بیوی نے جب مجھے آتے ہوئے دیکھا تو چلاتے ہوئے کہا: ''ہماری اونٹنی کہاں ہے؟ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

میں نے کہا: ''زرا دم تو لینے دو۔۔۔۔میں تمھیں بتاتا ہوں۔۔۔۔تم یقیناً سن کر خوش ہو جاؤ گی۔ہمیں اپنی اچھی نسل کی اونٹنی کا اچھا نعم البدل ملا ہے۔پھر میں نے اس کو کتاب دکھائی اور کہا۔''یہاں اس کپڑے کے غلاف کے اندر ہر لفظ ایک اچھی نسل کی اونٹنی سے زیادہ قیمت کا حامل ہے۔''

میری بیوی نے کتاب دیکھی۔اس نے اسے کھول کر دیکھا پھر اس نے اسے ماتھے سے لگایا اور اسے اپنے چہرے سے مس کیا۔اس کے خیال میں یہ ایک مقدس کتاب تھی۔وہ وہاں خاموش کھڑی رہی اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس وقت روئے یا ہنسے؟۔۔۔میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت اونٹنی کے متعلق سوچ رہی تھی، جو ہمارے غریب گھرانے کی آخری امید اور سہارا تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ کیسے اس کتاب کو ملاں نے پڑھا تھا کیسے لوگوں نے اشتیاق سے اسے سنا تھا اور خود میں بھی،اسے سنتے ہوئے جذباتی ہو گیا تھا۔میں نے جو کچھ سنا تھا اور جس نے میری یادداشت پر اپنی چھاپ لگا دی تھی،اس میں سے اسے کچھ کچھ بتایا۔میں نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈتے دیکھے۔

''تم تسلیم کرو گے کہ تم نے ایک بے وقعت چیز کے لیے اپنی اونٹنی گنوا دی۔۔۔۔وہ ہمارے لیے سب کچھ تھی۔''

اپنی بیوی کی بات سن کر اس لمحے مجھے افسوس سا ہوا کہ میں نے کتاب خریدی تھی۔لیکن میں کیا کر سکتا تھا؟ مجھے گاؤں کے سیانے آدمی کے پاس جانے کا مشورہ دیا گیا۔میں نے اسے کتاب کے متعلق بتایا اور اسے کہا کہ وہ مجھے کوئی ایسا شخص ملوا دے جو یہ کتاب پڑھ سکے۔

اس نے حیرانی سے پوچھا: ''تمھیں یہ کیسے ملی؟''

میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ بہت سستی ملی ہے۔

اس نے کندھے اچکائے مسکرایا اور بولا: ''یہ تم نے کوئی عقلمندی نہیں کی۔اگر تمھیں یہ تحفے کے طور پر بھی ملی ہوتی تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔اب اسے پڑھے گا کون؟ وقت گذرتا گیا اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔میری بیوی دن رات بڑبڑاتی رہی۔میں نے لوگوں کے ساتھ بھی مشورہ کیا اور

دوسری بستیوں میں بھی گیا لیکن مجھے کوئی ایسا شخص نہ مل سکا جو اس کتاب کو پڑھ سکتا۔ عام طور پر لوگ کہتے۔

''تم ایک غریب چرواہے ہو۔۔۔تمھارا ایسی چیزوں سے کیا واسطہ؟''

اور میں نے اپنا اعتماد کھونا شروع کر دیا۔ ایک دن میں نے اپنے اس خزانے کو بوری میں ڈالا اور پھر جو چیز میرے ہاتھ لگی میں نے اس کے اوپر بوری میں بھر دی۔ وہاں یہ کتاب ایک سال' دو سال ۔۔۔۔پورے سات سال تک پڑی رہی۔ اور ان سات سالوں میں میری بیوی اپنی اس نسلی اونٹنی کو یاد کر کے روتی رہی جس کے ساتھ اس کا ایک کم سن بچہ بھی تھا اور وہ کہتی کہ:''اب تک اس نے ہمیں تین مزید اونٹ دے دیے ہوتے۔ ہم اس وقت امیر ہوتے۔ ہمارے تمام دکھ دور ہو چکے ہوتے۔''

اور پھر اچانک وہ مجھے جھاڑ پلاتے ہوئے کہتی:''تم کسی ایسے شخص کو تلاش کیوں نہیں کرتے جو اس کتاب کو پڑھ سکے۔''

ایک دن جب ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے تو وہ کہنے لگی:''صرف ملاں اور عامل لوگ پڑھنا جانتے ہیں۔ کیا تمھارے خیال میں ہمیں اپنے بیٹے مورت جان کو کسی ایسے عقلمند آدمی کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجنا چاہیے؟ وہ وہاں پڑھنا سیکھ لے گا تو پھر وہ ہمارے لیے یہ کتاب پڑھ سکے گا۔ عامل اکشی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہمیں اپنے بیٹے کو اس کے پاس بھیجنا چاہیے! ہم اس کے بغیر رہ لیں گے۔ اسے پانچ سال کے اندر لکھنا پڑھنا سیکھ لینا چاہیے!''

میری بیوی کے الفاظ نے میری حوصلہ افزائی کی۔ جہاں تک کتاب کے پڑھے جانے کا سوال تھا تو اس کے لیے میں کسی بھی چیز کے لیے تیار تھا۔ اور اسی طرح میں اپنے بیٹے کو عامل اکشی کے پاس لے گیا۔ میرے بیٹے کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی۔ میں نے عامل اکشی سے کہا۔

''ہم بہت دور سے ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ کیا آپ میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں گے؟ جب تک وہ آپ کے پاس رہے گا، آپ اس کے آقا ہوں گے۔ اگر اسے مارنا پڑے تو اسے ماریں مگر اسے پڑھنا لکھنا ضرور سکھا دیں۔''

عامل نے مجھے امید دلائی۔

اس نے کہا:''تم نے اپنے بیٹے کو یہاں میرے پاس لا کر اچھا کیا۔ جو کوئی میرا نمک چکھ لیتا ہے وہ فہم و ادراک کا مالک بن جاتا ہے' تم دیکھ لو گے کہ تمھارا بیٹا میری نگرانی میں کتنا بہتر ہو جائے گا۔ چار سالوں کے بعد جب آؤ گے تو اسے پہچان نہیں سکو گے۔''

میں نے اس پر اعتماد کیا اور خوشی کی لے میں جھومتا ہوا واپس لوٹا ۔ میں نے بیوی سے کہا: ''غم نہ کرو۔ چار سال بعد تم جان جاؤ گی کہ کتاب میں کیا لکھا ہے' پھر تم مجھے بتانا میری غلطی تھی یا نہیں۔''

تین سال بیت گئے تو میں نے سوچا کہ اب تک مورت خان نے کافی کچھ سیکھ لیا ہوگا' اس لیے میں اس سے ملنے چلا گیا' لیکن میں نے وہاں کیا دیکھا؟

میرے بیٹے کو سارا سارا دن دوسرے کاموں پر لگائے رکھا جاتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سیکھا تھا اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس سے یہ اتنی مشقت کیوں لی جاتی ہے۔ میرے بیٹے نے التجا کی کہ میں اس کو وہاں چھوڑ کر نہ جاؤں بلکہ اپنے ساتھ لے جاؤں' نہیں تو عامل اسے معمولی غذا کے عوض کام کرا کرا کر مار ڈالے گا۔ میرے بیٹے نے کہا: ''وہ تو خود جاہل ان پڑھ ہے' وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ ایک عامل کے بارے میں ایسی بات منہ سے نکالنا بری بات تھی۔ لیکن مورت خان نے چلا کر کہا: ''ابا اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے تو میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں پریشان ہو گیا اور میں نے اپنے بیٹے کی سچائی کو جانچنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے عامل اکشی کے ایک ہمسایہ کو بلا کر اسے ساری صورت حال بتائی۔

میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تمھارے خیال میں عامل میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دے گا؟''

اور جو کچھ مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میرا بیٹا سچ بول رہا تھا۔ عامل اکشی نہ تو پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا تو پھر کیا وجہ تھی کہ کئی تعلیم یافتہ ملاؤں سے زیادہ طاقتور تھا؟ اس کی طاقت اس کے خاندان کی طاقت میں پوشیدہ تھی کیوں کہ اس کے خاندان کے پاس ایک بڑا راز تھا۔ سارا قبیلہ اس کے آباواجداد کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کسی کو ان کے خلاف بولنے کی جرات نہ تھی۔ لوگوں کی زبانی مجھے جس بات کا پتہ چلا وہ یہ تھی: ''ایک بار ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایک کسان نے عامل اکشی کے آباواجداد میں سے ایک کا' جو خود بھی ایک عامل تھا، گھاس کا گٹھا چرا لیا۔ جب وہ شخص گھر پہنچا تو وہ گٹھے کو اپنی پیٹھ سے نیچے نہ اتار سکا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے اپنے بیٹے کو بلایا مگر بے سود۔ چور پریشان ہوا اور اس گھاس کے گٹھے کو واپس اسی جگہ رکھنے چلا گیا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ ساری رات وہ پریشانی کی حالت میں اس بوجھ کو پیٹھ پر اٹھائے گاؤں میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ مالک کے پاس واپس جائے اور اپنے جرم کو تسلیم کر لے۔

اس نے کہا: ''اے عامل! میں نے ایک جرم کیا ہے اور ساری رات اپنی بدی کو پیٹھ پر لادے

پھرتا رہا ہوں۔ اچھے عامل میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں اور تم سے معافی کا طلب گار ہوں۔ گھاس کو میری پیٹھ سے جدا کر دو۔ عامل نے اسے معافی دے دی اور اسے، واپس اسی جگہ بھیج دیا، جہاں سے اس نے گھاس کا گٹھا چرایا تھا۔ عامل کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا اور گھاس کا گٹھا چور کی پیٹھ سے نیچے گر گیا۔ عامل اکشی کا یہ بزرگ ایک جادوگر تھا اور ایسا ہی عامل اکشی بھی ہے۔ اس کی طاقت کا راز نمک میں مضمر ہے۔ اگر وہ نمک پر پھونک مارے اور جادوئی الفاظ ادا کرے تو بے اولاد جوڑوں کو اولاد مل جاتی ہے اور بیمار شفایاب ہو جاتے ہیں۔''

جب میں نے یہ سب کچھ سنا تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر مورت خان کو ساتھ لیا اور گھر واپس آ گیا تا کہ وہ چرواہا بن سکے۔ میں قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ وہ نمک پر پھونک مارنا سیکھ لے۔ اس طرح مہینے اور سال گزرتے گئے۔ موسم بہار میں ہم نئی چراگاہوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں اور خزاں میں ہم پھر وادی میں آ جاتے ہیں۔ اور اس تمام عرصے میں یہ کتاب میری بوری میں پڑی رہی۔ بعض اوقات جب میں بہت افسردہ ہوتا تو اسے نکال کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔ میں اسی انداز میں بیٹھتا جیسے ملاں بیٹھتا تھا اور اس کتاب کو ہر جگہ سے چھوتا مگر کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ کتاب گونگی بنی رہتی میری بیوی پھر برا بھلا کہنے لگتی: ''اگر ہم نے اس موئی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا ہوتا تو اس کے بجائے ہمارے پاس بہت اچھی نسل کے اونٹوں کا ایک ریوڑ ہوتا۔''

اور پھر ایک نئی صبح طلوع ہوئی اور ہماری بستیاں انقلابیوں کے زیر انتظام آ گئیں۔ اب اساتذہ بھی آ گئے اور انھوں نے ہمیں کتابیں لا کر دیں۔ ایک استاد ہماری بستی میں بھی آیا۔ اس نے سارے بچوں اور بڑوں کو جمع کر لیا جو پڑھنا لکھنا سیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے استاد کو دیکھتے ہی اسے پسند کیا اور اسے اپنی اس کتاب کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے کتاب لانے کو کہا اور چند روز تک اس نے یہ کتاب اپنے پاس رکھی۔

اس نے کہا: ''ولمورت آغا تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ یہ بہترین ترکمانی مخطوطات میں سے ایک ہے۔ اپنے بیٹے کو سکول بھیجو میں اسے لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا۔ میں اسے جلانے والی لکڑی اکٹھی کرنے یا پانی لانے نہیں بھیجوں گا۔ مجھے کسی غلام کی ضرورت نہیں۔ وہ چند سال تک سکول میں پڑھے گا اور پھر اپنی ماں اور ابا کے سامنے بیٹھ کر یہ کتاب پڑھے گا۔''

میں جانور چرانے کے لیے گئے ہوئے مورت خان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، میں نے اسے

بتایا: ''تم اب سکول جاؤ گے۔''

مورت خان نے میری بات سنی مگر گھر جانے سے انکار کر دیا۔

''میں دوبارہ کسی ملاں یا عامل کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔'' اُس نے کہا: ''شہروں اور گاؤں میں اب انقلابی آ گئے ہیں اور کسی عامل کی بیوی اب مجھے پانی ڈھونے پر نہیں لگا سکتی۔''

میں نے اسے سمجھایا کہ ہماری حکومت نے ہماری بستی میں ایک استاد بھیجا ہے، جو لوگوں کو پڑھائے لکھائے گا۔ بالآخر میں نے اسے قائل کر ہی لیا۔ وہ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتا، باقی وقت میں وہ لکھنا پڑھنا سیکھتا آج کل وہ قریبی ضلع میں مویشیوں کی افزائش نسل کے ایک فارم میں منیجر ہے۔

جب وہ اچھی طرح لکھنا پڑھنا سیکھ گیا، تو میں نے بوری میں سب سے نیچے پڑی کتاب نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ تب میں نے جانا کہ کتابیں کوئی ماورائی چیز نہیں ہوتیں بل کہ انھیں ہم جیسے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں ایسے گیت بھی تھے جو ہم چرواہے لوگ گایا کرتے تھے۔ لیکن کتاب میں زیادہ تر ایسی نظمیں ہیں جو نیکی، بدی، سچائی اور جرات سے متعلق ہیں، جن کے ذریعے لوگ اپنی خوشیوں کو پانے کا گر سیکھتے ہیں۔ میں نے اس وقت یہ بھی جانا کہ اس وقت جب ملاں نے اس کتاب کو پڑھا تھا تو میں نے بہت سی چیزوں کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھا تھا۔ جب میرے بیٹے نے اپنے خاندانی آتش دان کے پاس بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھا تو اس کا ہر لفظ 'تمام تر' خوب صورتیوں کے ساتھ ہم پر عیاں ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے میری بیوی اور بستی کے تمام لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ جب ولمورت آغا یعنی میں نے ایک اونٹنی کے بدلے میں اس کتاب کو حاصل کیا تھا تو میں نے کوئی دھوکہ نہیں کھایا تھا۔

''ہاں تو میرے بچے! اب تو تم نے جان لیا ہوگا کہ اس کتاب کے لیے ہمیں کیا کیا کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ میرے کنبے کی یہ داستان سن کر بھلا کون ہوگا، جو مجھ سے اس کتاب کو جدا کرنے کی جرات کرے گا۔؟ یہ لو تم اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے پڑھو مگر دوبارہ مجھ سے نہ مانگنا۔''

یہ رات کا پچھلا پہر تھا جب ولمورت آغا نے اپنی کہانی ختم کی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے زیادہ مجبور کرنا زیادتی ہوگی۔ اگر میں کہتا کہ ہم اشک آباد میں اس کتاب کی بہت سی نقلیں بنوائیں گے' تب وہ اور اس کے گاؤں کا ہر شخص ایسی ایک کتاب کا مالک بن جائے گا تو شاید وہ میری سننے پر ہی تیار نہ ہوتا۔ اگر میں اسے کہتا کہ میں اسے یہ کتاب اسی حالت میں دو یا تین ماہ بعد واپس کر دوں گا تو وہ تب بھی نہ

مانتا۔ یہ سب کچھ ناممکن تھا کیوں کہ یہ کتاب اس کی روح تھی اور یہ اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔

میں نے موقع غنیمت جان کر کہا: ''ولمورت آغا۔''

''کہو بیٹے کیا بات ہے؟''

''کیا تم ایک عنایت کرو گے؟''

''کیسی عنایت؟''

''اسے میرے ہاتھ بیچ دو!'' اس نے قہقہہ لگایا اور اپنی داڑھی کو اپنے ہاتھوں سے تھپکا۔ اس لمحے وہ ناراض نہیں ہوا اور نہ ہی میرے الفاظ کو سنجیدگی سے لیا۔ ''نہیں میرے عزیز مہمان۔۔۔۔ یہ بکاؤ نہیں۔۔۔۔ دنیا میں چند ایسی چیزیں بھی ہیں جو کسی قیمت پر خریدی نہیں جاسکتیں۔''

''لیکن بہرحال اسے کسی نے تمھارے ہاتھ بھی تو بیچا تھا؟''

''لیکن وہ بہت خسارے میں رہا۔'' وہ پھر ہنسا۔

میں اسے کس طرح سمجھاتا کہ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہم نے بہت دیر تک آپس میں تبادلہ خیال کیا اور آخر اس کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔

''اچھے نوجوان'' اس نے کہا: ''اگر تم اس کتاب کے اتنے ہی گرویدہ ہو گئے ہو تو بیٹھ کر اس کی نقل کرلو۔''

میں نے ولمورت آغا کے خیمے میں بیٹھ کر دو ہفتوں میں اس قیمتی مخطوطے کی نقل تیار کی۔ وہ زیادہ تر وقت میرے پاس بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات وہ اپنی یادداشت کے بل بوتے پر مجھے لکھوانے لگتا اور بعض اوقات خاموشی سے مجھے کام کرتا ہی دیکھتا رہتا۔ مجھے کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ اکثر کہتا: ''میں کسی قدر پڑھنا سیکھ تو گیا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ کبھی لکھنا نہیں سیکھ سکوں گا۔'' بوڑھی عورت چائے اور کیک سے ہماری تواضع کرتی رہتی۔ کبھی کبھار کوئی دوسرا مشروب بھی لے آتی۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔

ولمورت آغا کے پاس چالیس سال سے جو انمول نظمیں تھیں ان کا شاعر ترکمان کلاسیکی شاعری کا موسس اور مشہور شاعر مخطوم قلی ہے، فراقی (۱۷۳۰ء تا ۱۸۷۰ء) جس نے زیادہ تر حملہ آور ایرانی بادشاہوں، بخارا کے امیروں اور کھیوا کے خانوں کو پسپا کرنے کے لیے ترکمانی قبائل کے اتحاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے لکھا۔۔۔۔!

تھیب مہاپوریا

چمپون

سپیشل وارڈ کی طرف جانے سے پہلے ہسپتال کے ڈائریکٹر نے اطلاعاً مجھ سے کہا: "اس مریض کا تعلق بہت اچھے خاندان سے ہے اور اس کی کہانی کا تعلق' جو کہ اس کے دوستوں اور رشتہ داروں کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہے' ان بااثر اور دولت مند لوگوں سے ہے جو کہ ابھی زندہ ہیں۔ اس کی بیماری کی علامات ایسی ہیں کہ ہم اپنے اس ہسپتال میں ان کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ خاص طور پر طبی نقطہ نگاہ سے ہم اسے فاترالعقل قرار دینے سے قاصر ہیں۔ اصولاً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مریض کو کوئی شدید صدمہ ہوا ہے۔ اس بات کو پانچ ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے اور وہ ابھی تک اپنے آپ کو اس صورت حال سے باہر نہیں نکال سکا۔ سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ جس نے اسے ،اس حال تک پہنچایا ہے، اسے صرف وہی واقعہ یاد ہے۔ اس کا دماغ کسی اور چیز کو قبول ہی نہیں کرتا اور یہی ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ ہم نے اسے نارمل حالت میں واپس لانے اور چیزوں کے بارے میں اس کے نارمل ردعمل کو واپس لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ صحت یاب ہو جائے گا اور اگر ناکام رہتے ہیں تو۔۔۔۔

ڈاکٹر نے مایوسی کے انداز میں اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے کندھے اچکائے۔

مریض کی عمر ستائیس یا اٹھائیس برس کے قریب تھی۔ وہ مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا اور اس کی بیماری نے اس کی ظاہری حالت کو بالکل متاثر نہیں کیا تھا جیسے کہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ تو لاغر اور کمزور تھا اور نہ ہی اس کی رنگت زرد تھی۔ ظاہری طور پر وہ بالکل بیمار نہیں لگتا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک ذہین اور بھلا شخص لگتا تھا۔ اس نے مناسب لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے ایک مہذب شخص کی طرح اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔ اس کی شخصیت ایک بیرو کارکی نہیں بلکہ ایک لیڈر کی سی تھی۔

ڈاکٹر نے جب میرا تعارف کرایا تو اس نے میری طرف عجیب سے انداز سے دیکھا۔ وہ پریشان کر دینے والی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ میں نے جو بھی کہا یا پوچھا مجھے اس کا جواب نہیں

ملا۔ مجھے ڈاکٹر کے تنبیہی الفاظ یاد آنے لگے۔

''میرے خیال میں تم کچھ عرصے تک بھوکت میں ضرور رہے ہو؟''

''نہیں ۔۔۔۔بھوکت میں نہیں۔۔۔۔میں تائی مانگ میں رہا ہوں جو کہ پنگنگا میں واقع ہے۔۔۔وہاں میں ایک لمبے عرصے تک رہا ہوں۔''

''تائی مانگ، بہت سے کان کنی کے اضلاع کا مرکز۔۔۔۔میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟ وہاں کی زندگی تو بہت پر لطف رہی ہوگی۔''

''وہاں کی زندگی تو جہنم سے کم نہیں تھی۔''

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی ۔۔۔''کیا؟'' کیا وہاں کوئی ایسی صورت حال تھی جو دوسری جگہوں پر نہیں ہوتی۔مثلاً ہادیائی کی طرح۔ہادیائی اور اس جیسی دوسری جگہیں عورت، شراب اور جوئے کی وجہ سے مشہور ہیں مگر تائی مانگ کی وجہ شہرت اس کے چپیون، مگر مچھ اور آہنی زنجیریں ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔۔۔۔بھلا چپیونوں، مگر مچھوں اور آہنی زنجیروں کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

اس نے کہا:''میں تمھیں ان کے متعلق بتاتا ہوں۔''

اس کے بعد تو وہ شروع ہو گیا۔میں اس کی خاموشی توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔آگے جو کچھ بیان ہوگا، وہ تمام کی تمام وہ کہانی ہوگی جو کہ میں نے اس سے حاصل کی۔اس کہانی میں جہاں کوئی خلا موجود تھا، اسے میں نے دوسری جگہوں سے ملنے والی اطلاع سے پر کر لیا تھا۔جگہوں اور اشخاص کے نام البتہ فرضی تھے۔

''میرا باپ نیگنگا کا گورنر تھا۔میں نے اپنے وقت کے بنکاک کے بہترین سکول سے تعلیم حاصل کی۔جب میں سولہ برس کا ہوا تو میری عادتیں کچھ بگڑ گئیں۔میرے باپ نے مجھے واپس پنگنگا جانے کا حکم دیا اور میں سکول کے بورڈنگ میں واپس چلا گیا۔میں وہاں پانچ سال رہا اور یوں میں نے اپنی سکول کی تعلیم مکمل کر لی۔انھی دنوں میرا باپ ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔میرا باپ ایسے لوگوں میں سے ایک تھا، جنھوں نے بہت پہلے سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہم تھائی باشندوں کو غیر ملکی معاشی غلبے سے اپنے آپ کو آزاد کر لینا چاہیے۔اس نے ہمیشہ مجھے گورنمنٹ کی ملازمت کے بجائے بزنس لائن میں جانے کی ترغیب دی۔اس نے آسانی سے اپنی بات منوالی۔مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔میرا باپ

ریٹائرمنٹ کے بعد بنکاک چلا گیا تو میں خودمختار ہوگیا اور میں نے کان کنی کی ایک آسٹریلوی کمپنی میں کلرکی اختیار کر لی۔ میں اپنے تعلیمی حوالے سے اس کام کے لیے بالکل موزوں تھا کیوں کہ میں مالے، ہوکن اور ہیلم تین زبانیں بول سکتا تھا۔ فرم اس شخص کو، جو انگریزی اور تھائی زبان کے علاوہ تین زبانیں جانتا ہو، منہ مانگی تنخواہ دینے کے لیے تیار تھی۔

تاہم میں نے آسٹریلویوں کے ساتھ صرف دو سال کام کیا۔ یوکن گولڈ مائننگ کمپنی نامی ایک امریکی فرم نے تائی مانگ کے قریب ایک کان میں کھدائی شروع کی تو انھیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ایشیائی مزدوروں کی دیکھ بھال کر سکے اور ساتھ ہی حکومتی کارندوں کے درمیان رابطے کا کام بھی دے سکے۔ میں نے وہاں فوراً درخواست دے دی اور دس سے زیادہ لوگوں میں سے جو سب سے کم عمر تھا مجھے اس کام کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ مجھے تقریباً چار سو بھات ملنے لگے۔ منیجر نے اس کے علاوہ مجھے کچھ اضافی ذمہ داریاں بھی سونپ دیں اور یوں میری آمدنی آٹھ سو بھات تک جا پہنچی۔

ویسے تو بھوکت میں کسی چوبیس سالہ نوجوان کا آٹھ سو بھات ماہانہ کمانا کوئی انہونی بات نہیں تھی لیکن اس آمدنی کی وجہ سے میری زندگی میں ایک واضح اور لازمی تبدیلی تو آنی ہی تھی۔ جب میری آمدنی صرف دو سو بھات تھی تو میں کچھ پیسے بچا بھی لیتا تھا اس وقت میں ایک خاموش سی زندگی بسر کر رہا تھا ان دنوں میں صرف مطالعہ کرتا تھا اور کام کے بعد ریڈیو سنا کرتا تھا۔

لیکن جب میں نے آٹھ سو بھات کمانا شروع کر دیے تو گزارہ کرنا میرے لیے مشکل ہوگیا۔ پیسے کم پڑنے لگے اور یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ نائے اسنوئے یعنی میں نے معاشرے کے ایک خاص طبقے میں بہر حال اپنے لیے ایک جگہ بنالی تھی۔ جہاں کہیں بھی عورت، شراب اور جوئے کی محفل سجائی جاتی، وہاں میرا ذکر ضرور ہوتا۔ میں ان محفلوں کی جان تھا۔

میں کچھ اور چیزوں میں بھی آگے تھا۔ میں کسی کو بھی اپنے سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا میں پیروکار کبھی نہ بنا بل کہ لیڈر ہی رہا اور میں نے اپنا کردار بہت اچھی طرح سے نبھایا۔ مجھے یقین ہے اس سلسلے میں میری سماجی حیثیت نے بھی اپنا رول ادا کیا تھا۔ چاہے مقامی لوگوں کی یا غیر ملکیوں کی محفل ہوتی میں اسی کا حصہ بن جاتا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ میری دولت نے ہر ایک کو میرا دوست بنا دیا تھا۔

میری پسندیدہ جگہیں جہاں میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتا تھا وہ تائی مانگ کے مختلف کلب تھے۔ ہمارا قصبہ اس علاقے کا مرکزی علاقہ تھا جہاں سے سڑکیں تمام اطراف کو جاتی تھیں۔ یہاں سے

آدمی بہت سے علاقوں کی طرف جا سکتا تھا اور میری کمپنی کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے بہت نزدیک واقع تھا۔ ساری ہی دلچسپیوں کے سامان، یہاں ارد گرد موجود تھے۔

اب جو کچھ میں بیان کرنے جا رہا ہوں اس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

تائی مانگ سے دریا کے دہانے تک پہنچنے کے دو راستے تھے اور وہیں کمپنی کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ یہاں سے دوسرے کنارے کی سمت میں دریا کے بہاؤ کے مخالف رخ میں چلتے ہوئے، کسی کشتی کے ذریعے ہم تکواپا تنگ میرا ؤ روڈ تک جا سکتے تھے۔ اگر آپ بس پر جانا چاہیں تو آپ دریا کے بہاؤ کی سمت میں تائی مانگ کی طرف چلتے ہوئے دریا کے دہانے تک پہنچ سکتے تھے۔ البتہ اس طرح وقت زیادہ لگتا تھا۔ اس طرح متواتر پانچ چھ گھنٹوں تک بیٹھے رہنے سے آدمی اکڑ کر رہ جاتا تھا اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ بس کا مل جانا بھی کوئی یقینی بات نہیں تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ کشتی کے ذریعے دریا عبور کر کے، دریا کے دہانے کے قریبی علاقے میں پہنچ جائیں۔ پھر جنگل میں سے پیدل چلتے ہوئے آپ تائی مانگ جا نکلیں۔ اس طرح تین گھنٹوں میں آدمی وہاں جا پہنچتا تھا۔ لیکن اس سفر کی کچھ اپنی قباحتیں بھی تھیں۔ جنگل کے ان راستوں سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر آپ جنگل میں گم بھی ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ دریا کا یہ حصہ نہایت خوں خوار قسم کے مگرمچھوں سے اٹا پڑا تھا۔ جب میرا باپ نکرون سرتماراج کا گورنر تھا تو میں پاک پیور ضلع میں اس کی مگرمچھوں کے شکار کی مہموں میں، اس کے ساتھ آیا کرتا تھا کیوں کہ یہ علاقہ مگرمچھ کے شکار کے لیے نہایت موزوں تھا۔ پھر بھی ہماری کان کنی کے قریب کا دریائی علاقہ، اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہاں کے مگرمچھ کشتی میں سوار لوگوں پر اچانک اچھل کر حملہ کر دیتے تھے۔ اسی لیے یہ بات حیران کن نہیں تھی کہ یہ ویران علاقہ تھا اور گنتی کے چند خاندان ہی یہاں دریا کے کناروں پر آباد تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ چھوٹی کشتیوں پر یہاں سے دریا عبور کرنے کی کوئی کم ہی ہمت کرتا تھا۔ بھوکت صوبے کا یہ بہت بدنام ضلع تھا۔ تائی مانگ کے علاقے کے لوگ جو ہماری کانوں کو دیکھنا چاہتے تھے، اس وقت تک رضامند نہیں ہوتے تھے، جب تک انھیں یہ یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ کشتی، جس میں وہ سفر کریں گے، بہت مضبوط ہوگی اور اس کی دیواریں بھی دونوں طرف سے اونچی اور محفوظ ہوں گی۔

بہر حال میں خود کمپنی کی بڑی اور محفوظ کشتی استعمال کرتا تھا۔ اس طرح میں نہایت ہی خطرناک

ترین علاقوں سے بھی گزر جاتا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر میں جنگل میں سے ہو لیتا تھا۔ یہ راستے اب خوب اچھی طرح سے میری پہچان میں آچکے تھے۔ پھر بھی میری خواہش ہوتی تھی کہ میں اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے جنگل عبور کرلوں۔ شیر کے پاؤں کے نشانات اس علاقے میں اکثر دیکھے جاتے تھے۔

ہاں تو اب آپ سمجھے کہ یہ کتنی پر کشش جگہ تھی: یعنی اپنے تضاد کے حوالے سے۔ حتیٰ کہ یہاں کے شیر اور مگر مچھ بھی آپس میں تال میل نہیں رکھتے تھے۔ میں شیخی نہیں بگھار رہا لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں تائی مانگ کا ہر دل عزیز شخص تھا۔ علاقے میں اپنی اسی پسندیدگی کی بنا پر۔ تائی مانگ ٹل کہ سارے بھوکت کے، ایک نہایت اہم شخص کے ساتھ میری ٹھن گئی۔ یہ شخص تاؤ کے سون تھا۔

تاؤ کے سون یہاں ''بگ برادر سون'' کے نام سے بھی جانا پہچانا جاتا تھا۔ اب اگر یہ شخص بنکاک میں پلا بڑھا ہوتا تو اس کے نام کو چینی زبان کے معنوں میں پکارا جاتا۔ لیکن جنوب کے علاقے کے لہجے کے مطابق اسے چینی انداز سے ہر دو طرح سے ادا کیا جا سکتا تھا، جیسے موقع محل کے مطابق کسی غیر ملکی کو پکارا جا سکتا تھا۔ بھوکت کے اردگرد کے علاقے میں تاؤ کے سون کی ہر ایک کے ساتھ دوستی اور تعلقات تھے۔ لیکن جن جگہوں پر وہ بہت پُر اثر تھا، وہ تائی مانگ، تکواپا، پھنگنگا، کاؤ کلائے اور تنگ پراؤ تھیں۔ اس علاقے کا کوئی بھی قانونی یا غیر قانونی کیس ہوتا، تو وہ عدالت میں جانے سے پہلے پہلے تاؤ کے سون یعنی بگ برادر کے ذریعے ہی حل ہوتا تھا۔ وہ اونچے رتبے کے سارے ہی حکومتی اہل کاروں کو خوش رکھتا تھا۔ جب انھیں تائی مانگ آنا ہوتا تھا تو وہ بگ برادر کی کار ہی میں آتے تھے اور وہ انھیں بہترین جگہوں پر ٹھہراتا تھا۔

اس علاقے کی تمام تر آسائشات وہ ان کو بہم پہنچاتا تھا۔ یہاں کے ہر اہم افسر کے منہ سے نکلی ہر بات فوراً پوری کی جاتی تھی۔ بگ برادر پُر تکلف مہمان نوازی کے لیے مشہور تھا۔ نوجوان حکومتی اہل کار اس کے مہیا کردہ آسائشات کے جال میں یوں پھنس جاتے تھے کہ پھر وہ اس کے آلہ کار بن کر رہ جاتے تھے۔

بگ برادر بہت پکا قوم پرست تھا، وہ بے شک اپنے ملک کے مفاد کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی سرکاری سرزنش کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔

میں خود بھی بہت متشدد قسم کا قوم پرست تھا اور میں صرف اسی وقت اس کی مخالفت کرتا تھا، جب وہ کسی لمحے اپنی ذات کو بھلا کر بدسلوکی پر اُتر آتا تھا۔ لیکن تاؤ کے سون نے سرعام کسی کی بھی بے

عزتی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک طنز آمیز نقطہ چینی کا رویہ اپنائے رہتا تھا۔ میں بھی اپنے آپ کو اس جیسا ہی نقطہ سنج سمجھتا تھا، اسی لیے ظاہری طور پر، میں کبھی بھی جارحانہ رویہ نہیں اپنا تا تھا۔ وہ ایک منجھا ہوا جوئے باز تھا جب کہ میں ابھی نوجوان تھا اور اس کھیل کا نیا کھلاڑی تھا۔ اگر چہ بہت سے موقعوں پر میں نے اپنے ایجاد کردہ ذاتی ہتھکنڈوں سے اس ''شیر کی طاقت'' کو کمزور کیا تھا۔ لوگ میری کامیابیوں کو سراہنے لگے تھے اور در پردہ، اس پر ہنستے تھے۔ اور یہی چیز سون کے نزدیک نا قابلِ معافی تھی۔

ہم ایک دوسرے کے مقابل تو کبھی نہیں آئے تھے مگر ہمارے جھگڑے کی دھوم سارے علاقے میں مچی ہوئی تھی، اور یہ بات ہمیشہ ہی میری سمجھ سے باہر رہی کہ چینی اور تھائی باشندے ہمیشہ اس موقع کا انتظار کیوں کرتے رہتے تھے کہ کب ہم دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور ہم براہ راست آپس میں جھگڑ پڑیں۔ میرے خیال میں میرے جیسے نوخیز اور نوآموز شخص کا سون جیسے جہاندیدہ شخص کے مقابل آنا ان لوگوں کے لیے شاید ایک پر جوش کھیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اس دن کے بارے میں تشویش لاحق رہتی تھی جب ان لوگوں کی وجہ سے، ہم ایک دوسرے کے کھلے دشمن بننے والے تھے۔ سون اس سارے علاقے اور اس جنگل کا ایک لمبے عرصے سے بادشاہ چلا آ رہا تھا اور یہ صورتِ حال اس کے لیے نا قابلِ برداشت تھی۔ جنگل کا بادشاہ ایک شیر، کسی دوسرے جانور کو اپنی سلطنت کو فتح کرنے کی کبھی اجازت دے سکتا تھا؟ میں سوچا کرتا تھا کہ آخر کار ایک دن یہ سب کچھ تو ہونا تھا، چاہے یہ دن کی روشنی میں نہ ہو، لیکن رات کی تاریکی میں تو یہ سانحہ ہو سکتا تھا۔ بہر حال اپنی اور اس کی دشمنی کے حوالے سے میں اب محتاط رہنے لگا تھا۔۔۔حتیٰ کہ۔۔۔۔''

''کیا آپ چمپون کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔''

میں اس کے، اس سوال اور اس کی کہانی کے اس نئے موڑ پر قدرے حیران ہوا۔ ڈاکٹر مجھے اپنے مریض کے پاس اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا، اس لیے میں نے اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتے ہوئے فوراً جواب دیا: ''ہاں میں نے اس کے متعلق سنا تو ہے لیکن آج تک کبھی اسے دیکھا نہیں۔''

''یہ بنکاک کا ایک غیر معمولی پھول ہے لیکن جنوبی علاقوں اور خاص طور پر تائی مانگ کے گرد و نواح میں یہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ میں اس کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں۔ اس پھول کا تعلق چمپک خاندان سے ہے۔ یہ چھپی کی طرح دکھائی دیتا ہے لیکن جب ابھی اس کی پتیاں برآمد نہیں ہوئی ہوتیں اور ابھی یہ نشو ونما کی حالت میں ہوتا ہے تو یہ ایک مخملیں کٹورے میں چھپا ہوتا ہے۔ جب یہ مخملیں حصہ کھلتا ہے تو

اس کی پتیاں برآمد ہوتی ہیں ۔آپ تصور نہیں کر سکتے کہ تب کیسی خوشبو پھیلتی ہے ۔اس کی پتیاں موٹی اور سخت ہوتی ہیں اور ایک مومی تہ اپنے اوپر لیے ہوتی ہیں ۔یہ پھول چمپی کی طرح جلد ہی مرجھا نہیں جاتا ۔ چمپون جب کھل جاتا ہے تو پھر کئی روز تک کھلا رہتا ہے ۔اس کی مہک اردگرد کے تمام پھولوں کی مہک پر حاوی ہوتی ہے ۔اس کی مہک نہایت طاقتور ہوتی ہے یہ آدمی کو مست اور بے خود کر دیتی ہے ۔

کیا یہ چیز عجیب وغریب نہیں کہ سون اپنی تمام تر قوم پرستی کے زیر اثر اپنی بیٹی کا نام اس پھول کے نام پر رکھتا ہے؟ چمپون! غالبًا وہ یہ جانتا تھا کہ یہ نام اس کے لیے کتنا موزوں تھا ۔انیس سال کی عمر میں چمپون ایک خوب صورت اور دلآویز شخصیت کی مالک لڑکی بن چکی تھی ۔اس پھول کے نام کی طرح وہ پہلی نظر میں کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی تھی ۔لیکن جب سنجیدگی کے ساتھ اس پر دوسری نظر ڈالی جاتی تھی تو اس کی خوب صورتی پوری طرح سے آشکار ہونے لگتی تھی ۔ایسے نام والی لڑکی سے ،جس قسم کے جذبے کی توقع رکھی جا سکتی ہے ۔وہ بالکل ویسی ہی تھی ۔اس کے جذبوں میں ویسی ہی تبدیلیاں واقع ہوتی تھیں ،جیسے کہ ایک پھول کی مہک کی اثر پذیری میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔وہ چمپون پھول کی طرح ایک آدمی کو مست اور بے خود کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی ۔چمپون جب کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی تھی ۔

بارہ سال کی عمر تک چمپون بھوکت کے ایک سکول میں پڑھتی رہی لیکن اس کے بعد اس کے باپ نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے اچھی چینی لڑکیوں کی طرح گھر میں ہی رہنا چاہیے ۔لیکن چمپون جو اس وقت چوتھی جماعت کی طالبہ تھی ،اس نے اپنے باپ کے متعین شدہ طریقہ کار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے خلاف بغاوت کرنے کا گر سیکھ لیا تھا ۔سون کسی حد تک تو اس رویے کو پسند کرتا تھا کہ اس کی بیٹی نے اسی کی طرح اپنی مرضی کا مالک ہونے کا وطیرہ اپنا لیا تھا ۔اس لیے اس نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اسے پھننگ کے کانونٹ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی ۔اس چیز سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سون چمپون کی مزید تعلیم کا مخالف نہیں تھا بلکہ وہ تو اسے تھائی زندگی کی طرز میں اپنے آپ کو ڈھالنے سے روکنا چاہتا تھا ۔اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ سون قطعی طور پر نہیں چاہتا تھا کہ چمپون کسی تھائی باشندے سے شادی کرے ۔

سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد چمپون اور اس کے باپ کے خیالات کا ٹکراؤ شروع ہو گیا ۔تاؤ کے سون نے اپنی بیٹی کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیے رکھا اور چمپون اس رویے کو خاطر

میں نہیں لاتی تھی ۔باپ اور بیٹی کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا ۔چیون چینی روایات کی اتنی پابندی تو کرتی تھی کہ وہ بغیر اجازت گھر سے باہر نہیں رہتی تھی اور گھر کے سامنے والے صحن میں نظر نہیں آتی تھی کیوں کہ اس طرح ،وہ اپنے باپ کی ناراضگی مول لے سکتی تھی ۔لیکن جہاں وہ جانا چاہتی تھی اور جہاں پر ،اس کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی ،وہ وہاں جانے سے پہلے ،اپنے باپ کی مرضی پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی ۔اپنی بیٹی کی اس خودسری پر ،اس کا باپ اپنی رائے کا برملا اظہار نہیں کرتا تھا بل کہ کسی حد تک مفاہمت کا رویہ اپنا لیتا تھا ۔

مجھے یہاں آپ کو بتا دینا چاہیے کہ یہاں کے جنوبی علاقے میں ،مکان کس انداز سے تعمیر کیے جاتے ہیں تا کہ آپ سمجھ سکیں کہ کیوں چیون ،مکان کے سامنے والے پورچ میں نظر نہیں آنا چاہتی تھی ۔

جنوبی علاقوں میں گھر بالکل بنکاک کی طرز پر بنائے جاتے تھے ؛یعنی گلی کے کنارے کنارے ایک کمرے کے پیچھے دوسرا کمرہ ۔یہ گھر بنکاک کے گھروں کی طرح ،ایک ہی طرح کی لمبائی کے لگتے تھے لیکن اصل میں ان کی لمبائی زیادہ ہوتی ہے ۔ایک گھر تیس سے چالیس ''واہ'' کی لمبائی کا ہو سکتا ہے ۔جب کہ ایک ''واہ'' ایک میٹر کے برابر ہوتا ہے ۔مناسب روشنی کے حصول کی خاطر چھت کئی جگہوں سے کھلی ہوتی ہے ۔ان کھلی جگہوں کو شیشے یا ٹین سے ڈھانپ دیا جاتا تھا ؛یعنی مالک اپنی حیثیت کے مطابق ایسا کرتا تھا ۔شیشے یا ٹین کے پہ کو ایک میکانکی عمل کے تحت ہٹائے جا سکتے تھے اور بارش کے وقت کھلی جگہوں کو پھر سے ڈھانپا جا سکتا تھا ۔امیر ترین باشندے اس علاقے میں ،ایسے ہی گھروں میں رہائش پذیر تھے ۔چینی تاجر پیشہ لوگ دکھاوے کے لیے خوب صورت بنگلے تعمیر کراتے تھے لیکن وہ بھی اپنے آپ کو اصل ماحول میں رکھنے پر ترجیح دیتے تھے ۔

تاؤ کے سون کا گھر اسی طرز پر تعمیر تھا ،جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے ۔لیکن شہر سے باہر واقع تھا ۔یہ کسی پر ہجوم گلی میں نہیں تھا ،اس گھر کا پچھواڑا جنگل کے قریب تھا ۔

چینی گھروں میں لڑکیاں ،مکان کے اگلے حصے میں دکھائی نہیں دیتی تھیں ،اگر چہ چیون لڑکیوں کو گھروں میں قید کر کے رکھنے کی حامی نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ گھر کے اگلے حصے میں نظر نہیں آتی تھی اور اڑوس پڑوس کے لوگوں سے اس کا رویہ اس ضمن میں مختلف تھا ۔وہ اپنے آپ کو گھر گرہستی کے کاموں اور کشیدہ کاری وغیرہ میں مصروف رکھنے میں خوشی محسوس کرتی تھی ۔وہ مطالعے کی بہت شوقین تھی اور اس مقصد کے لیے وہ پھنبنگ اور بنکاک سے کتابیں منگواتی تھی اور جنگل کی مہم جوئی سے لطف اندوز ہوتی تھی ۔

ہم دونوں اتفاقاً ملے اور پھر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے، جیسا کہ تقدیر نے ہمارے لیے طے کیا تھا۔ ہماری محبت اتفاقیہ تھی مگر بہت مضبوط اور گہری تھی۔ حقیقت میں ہم اپنی محبت کو راز میں رکھنا چاہتے تھے، لیکن ہماری کوششیں رائیگاں گئیں کہ یوں اس کی شدت میں زیادہ اضافہ ہوا۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ تاؤ کے سون ہماری محبت کو قطعاً برداشت نہیں کرے گا اور اس شخص سے، جس سے وہ نفرت کرتا ہو اور وہ اس کا بدترین دشمن بھی ہو، وہ اس سے اپنی لڑکی کی شادی کی اجازت دینے سے، پہلے اسے جان سے مار دینے کو ترجیح دے گا۔

میں یہاں اس بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ چیپون ایک پختہ ارادے کی لڑکی تھی اور پھر بھی اس نے میرے ساتھ بھاگ جانے سے انکار کیا۔ اس کی تعلیم اور تربیت کے انداز نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ ایک سچی اور گہری محبت تھی۔ اور میں خود بھی، اس حوالے سے، اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر ہم بھاگ جانے کا فیصلہ بھی کر لیتے، تب بھی ہم نے اپنی روایات کی پاسداری ضرور کی ہوتی اور چیپون نے بھی زندگی کی آسانیوں کے بجائے اس کی صعوبتوں کو برداشت کرنے پر ترجیح دی۔

تائی مانگ ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور کوئی بات زیادہ دیر تک یہاں پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اور پھر ہماری محبت کی داستان ۔۔۔۔ اس کی کہانی تو جنگل کی آگ کی طرح فوراً پھیلی اور چیپون کے باپ کو بھی جلد ہی اس کی خبر ہوگئی۔

میں اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ گھر میں پابند کر دی گئی تھی کیوں کہ میرے آدمی جو اس کے گھر کے اردگرد پھیلے رہتے تھے ان کے بقول: انھوں نے اسے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے اس تک اپنا پیغام پہنچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ حتیٰ کہ میں نے ایسے شخص کے لیے انعام دینے کا اعلان کیا، جو کہ میرا رقعہ اس تک پہنچا دیتا اور جو اس کا جوابی رقعہ مجھ تک پہنچاتا اس کے لیے انعامی رقم میں مزید اضافے کا بھی اعلان کیا۔ کئی لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی بھی، ان میں سے میرا پیغام اس تک پہنچانے یا اس کا پیغام مجھ تک لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف یہ ہوا کہ اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ضرور ڈالا۔

اپنی دشمنی کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک میں اور تاؤ کے سون، چند تہذیبی اصولوں کے

پابند ضرور رہے تھے۔ظاہراًایک دوسرے کے لیے ہمارا رویہ نرم ہی تھا۔لیکن اب تو یہ ایک کھلی جنگ تھی۔ اگر چہ ہم ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے لیکن اب جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا، ہم ایک دوسرے کو گھورنے لگتے تھے۔ جہاں تک چیپون کا تعلق ہے،اس کے متعلق تھوڑی بہت اطلاع مجھے اپنے آدمیوں کے ذریعے ملی تھی۔اسے مارا پیٹا گیا تھا۔اسے اس بڑے اور اندھیرے گھر میں خاصے تشدد کا سامنا تھا، وہ وہاں ایک قیدی کی طرح رہ رہی تھی۔

مجھے بھی ایک لمبے عرصے کے لیے بھوکت سے دور رہنا پڑا۔میری جلا وطنی اس علاقے کا سب سے بڑا موضوع بنی ہوئی تھی۔میرے چند دوستوں نے ایک موٹر بوٹ کرایے پر حاصل کی اور میری تسلی کے لیے،میرے گھر پر کچھ جنگ جو قسم کے لوگ متعین کر دیے۔ جنگ جو لوگوں کی یہ پارٹی ایک خاص انداز کی تھی۔ان کا سٹائل وہی تھا، جس کے لیے بھوکت مشہور تھا۔یعنی خوراک،شراب اور عورت!

میں یہاں خوراک اور شراب کے معیار کے متعلق آپ کو بتا نہیں سکتا۔ہاں میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ایسی زبردست چیزیں کسی بھی قیمت پر حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔

پھنینگ سے خاص طور پر، میرے لیے ایک طوائف منگوائی گئی تھی۔اس موقعہ پر البتہ اسے یہاں آنے کی دعوت دی گئی تھی اور اس نے قبول کر لی تھی۔زندگی کے سیاہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کسی وجود کے لیے،ایک سیاہ اندھیری رات میں بہت معمولی سی روشنی ہی کافی ہوتی ہے۔اسی لیے جب کسی شخص کی زندگی سے ایک عورت نکل جاتی ہے،تو وہ کسی دوسری کا سہارا ڈھونڈ لیتا ہے،میرے دوستوں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ میری مدد کر رہے تھے۔میں نے شیطان کا یہ تحفہ قبول کر لیا۔

اس کا نام امنیا تھا۔وہ ایک فلپائنی عورت تھی، جس کی رگوں میں پرتگیزی خون کی آمیزش تھی۔وہ ایک تھائی لڑکی کی جگہ لے سکتی تھی۔ بلا شبہ وہ ایک خوب صورت چیز تھی اور اس کی شخصیت میں ایک سحر تھا۔وہ اتنی خوب صورت تھی کہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ایک طوائف تھی۔

میں نے اور میرے دوستوں نے تین دن اور تین راتیں کشتی پر گزاریں۔وہ مجھے اپنے ساتھ رونگ لے جانا چاہتے تھے مگر میں کسی ضروری کام کی وجہ سے ان کے ساتھ جانے سے قاصر تھا۔وہ تو چلے گئے مگر امنیا یہیں میرے پاس ٹھہر گئی۔پانچ چھ دنوں بعد واپس آ کر ان کو امنیا کو اپنے ساتھ واپس پھنینگ لے جانا تھا۔

میں نے امنیا سے دوستوں کے ساتھ رونگ جانے کو کہا۔لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اس نے

یہاں اسی ویران اور دور افتادہ جگہ پر رہنا پسند کیا۔ میں نے بعد میں پوچھا کہ وہ یہاں کیوں رک گئی تھی۔ اس نے جواباً کہا کہ اسے میری جوانی' خوب صورتی اور اچھے اخلاق نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی، اس تعریف کا مجھ پر کیا اثر ہوا؟ یا یہ کہ انیتا جیسی خوب صورت عورت میری زندگی اور روح میں کیا کچھ تبدیلی لا سکتی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔

مگر فوری طور پر یہ ہوا کہ جوں ہی دوست روانہ ہوئے، انیتا میرے ساتھ، میرے گھر میں آ گئی ۔ایک دوسرے کو جاننے کے سلسلے میں ہم دونوں کچھ زیادہ ہی پر جوش تھے ۔میرا گھر ایک بھدا سا لکڑی کا بنا بنگلہ تھا۔ تین کمروں کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے، جہاں سے زمین کے فرش پر اترنے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں ۔ پہلا کمرہ تو میرا بیڈ روم تھا اور دوسرے میں، میں کھانا کھاتا تھا ۔اسی کمرے سے ایک راستہ کچن اور باتھ روم کو جاتا تھا۔ آخری کمرہ عام طور پر بند رہتا تھا کیوں کہ میں وہاں اپنے ضروری کاغذات رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ رات کے وقت بھی میں اپنے بیڈ روم میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔

میرا بنگلہ کمپنی کے دوسرے گھروں سے ذرا پرے اور جنگل کے قریب واقع تھا۔ یہ بہت پر سکون' خاموش اور الگ تھلگ سی جگہ تھی ۔دن کے وقت میرے پاس ایک نوکر اور باورچی ہوتا تھا ۔اور شام کو سب کارکن اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے اور وہاں وہ جوا کھیلتے تھے یا اور دوسرے طریقوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

انیتا کی آمد پر ایک شام کو میں کمپنی کے انجینئروں کی طرف سمندر کے قریب دی گئی رات کے کھانے کی دعوت میں شریک تھا۔ وہاں کھانے کے بعد ڈانس وغیرہ کا اہتمام بھی تھا اور دونوں انجینئروں نے وہاں اچھا وقت گزارا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ انیتا سے ملنا چاہتے تھے اور اس ضمن میں میری طرف سے دعوت ملنے کے متمنی تھے ۔ایک لمبے عرصے سے وہ یہاں عورتوں اور نہایت ہی خوب صورت عورتوں کے بغیر رہ رہے تھے اور وہ یقیناً عورتوں کے لیے مرے جا رہے تھے ۔ان کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ وہ مہذب اور اچھے اطوار کے مالک تھے ۔انھوں نے انیتا کے ساتھ ڈانس کیا اور کچھ خوش فعلیاں بھی کیں۔ یہ پارٹی ساری رات چلتی رہی۔

میں ذرا ہلکی نیند لینے والا آدمی ہوں اور مجھے سونے میں کچھ وقت لگتا ہے ۔لیکن اس رات کی پارٹی کے بعد میں فوراً ہی سو گیا۔ کچھ دیر کے بعد' میں جاگ اُٹھا۔ شاید یہ دروازے کے قبضوں کی جنھیں

کبھی تیل نہیں دیا گیا تھا، چر چراہٹ کی آواز تھی۔ یہ بہت عجب بات تھی۔۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ سونے سے پہلے میں نے دروازہ بند کردیا تھا۔

میں وجہ معلوم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھلے دروازے سے صبح کے سورج کی کرنیں سیدھی میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ پھر میں نے دروازے میں کسی جسم کا سایہ دیکھا۔ میں اس پر یقین نہ کر سکا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

اوہ میرے خدا! کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ یا میرا دماغ چل گیا تھا؟ اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ابھی تک دروازے میں موجود، اس سیاہ بھوت کے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ چپون تھی۔ بالکل برہنہ۔۔۔۔ اس کے لمبے سیاہ بال، اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی کمر اور ٹخنوں کے گرد لوہے کی ایک زنجیر تھی۔

ہم دونوں ہی دم بخود تھے۔ میں نے اس کی نگاہوں کو، اپنے چہرے سے پرے ہٹتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ بینا نائز ہو چکی تھی۔ میں کچھ دیر تک اپنا سانس روکے رہا، پھر ایک ساتھ ہی ہم دونوں کی نظریں امیتا پر پڑیں۔ جالی دار مچھر دانی کے نیچے بستر پر اس کا جسم، مجھ سے لپٹا پڑا تھا۔ وہ سو رہی تھی اور آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ چپون کی برہنگی کو دیکھ کر مجھے شرم کیوں محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن امیتا کی جسمانی نمائش نے ایک دم مجھے شرمندگی میں ضرور مبتلا کر دیا اور میں نے جلدی سے اس کے جسم کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

میں چپون کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کرپا رہا تھا۔ میں اس کی طرف سے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔ میرا سر چکرانے لگا؟ کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟ میں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔ جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو چپون جا چکی تھی۔

''چپون نے اپنے باپ کے سامنے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ وہ نائے امنوئے یعنی مجھ سے محبت کرتی تھی اور یہ کہ ہم میں میل ملاقات بھی تھی۔ لیکن یہاں اس نے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ اس نے ایسا کرتے ہوئے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ جس سے اس پر یا اس کے خاندان کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔ سون نے اس بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اسے واقعی یقین نہیں تھا کیوں کہ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ کوئی عورت ایک مرد سے میل ملاپ رکھنے کے باوجود، اپنے آپ کو محفوظ کیسے رکھ

سکتی ہے۔سون کے گھر میں خود اس کی اپنی چھ عدد داشتائیں تھیں ۔ اور اس کے علاوہ ایک صحت مند نوجوان آدمی ہوتے ہوئے اور ایسی چیزوں کا رجحان رکھتے ہوئے تائے امنوئے جو کہ اس کا دشمن تھا اور جو کہ واحد شخص تھا، جو اس لمبے عرصے میں اس سارے علاقے میں اس کے سامنے یوں اکڑا ہوا تھا، اس کی بیٹی کے ذریعے، اس سے بدلہ لینے سے کیسے باز رہ سکتا ہے۔اس کا خیال تھا کہ اس شخص کے ساتھ جس سے وہ شدید نفرت کرتا تھا، چیون نے محبت کر کے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔اس نے اسی بنا پر اس کی وضاحت اور دلیلوں کو رد کر دیا تھا۔

جب باپ اور بیٹی دونوں اپنی بات پر اڑے رہے اور دونوں میں سے کوئی اپنے موقف سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوا تو پھر آنے والے وقت میں جو کچھ ہونا تھا، اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ وہ دونوں جنگ وجدل پر آمادہ ہو گئے۔سون نے جلتی ہوئی لکڑی کا ایک ٹکڑا چیون پر دے مارا۔چیون نے اپنے آپ کو اس وار سے بچا لیا۔تاہم اسے بے دردی سے پیٹا گیا۔اتنا شور مچا کہ ہمسائے بھی متوجہ ہو گئے۔چیون نے البتہ ناقابل برداشت درد کی شدت کا اظہار محض سسکیوں کی صورت میں کیا۔تاؤ کے سون جب یہ تشدد کرتے کرتے تھک گیا تو چیون فرش سے اٹھی۔

"میں نے تمھیں بتایا ہے کہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح پاکیزہ ہوں، لیکن تم میری بات کا یقین نہیں کر رہے۔تم نے مجھے گالیاں دیں اور مارا پیٹا۔میں اب سیدھی امنوئے کے پاس جاؤں گی اور اپنا آپ اس کے سپرد کر دوں گی۔۔۔۔اب خدا ہی میری مدد کرے گا۔"

ہر کسی کو معلوم تھا کہ چیون جو کچھ کہتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔۔۔ایک ہفتے بعد جب اس کا باپ گھر پر نہیں تھا تو وہ وہاں سے نکل آئی۔

اس چینی خاندان کے سربراہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس گھر کے لیے ایک حکم کا درجہ رکھتا تھا۔اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر چیون یہاں سے بھاگی تو سب لوگوں کو یعنی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور نوکروں کو اس بات کی سزا دے گا۔چیون کے لیے بچ نکلنا بہت مشکل تھا۔گھر کے سبھی افراد نے چیون کو پیچھے سے جکڑ لیا اور کسی نے گھر کے مالک کو بھی اس بات کی اطلاع دے دی۔پہلی بار بھاگنے کی کوشش پر چیون کو سزا دی گئی۔

اس نے کئی بار بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔اسے ایسا کرنے سے روکنے کے لیے تاؤ کے سون نے حکم دیا کہ اسے اس کے بیڈروم میں ایک ستون کے ساتھ زنجیر سے باندھ دیا جائے۔رات

کے وقت البتہ اس نے اس کی زنجیر کی لمبائی اتنی رکھنے کی اجازت دے دی کہ وہ آسانی سے کمرے میں حرکت کر سکے لیکن تب بھی زنجیر اس کے ٹخنوں سے بندھی ہوتی تھی۔ زنجیر میں بندھے ہونے کے باوجود بھی جب چیپون نے بھاگنے کی کوشش ترک نہ کی تو سون نے اس کی سوتیلی ماؤں میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ رات کو سونے سے پہلے، اسے کپڑوں سے بالکل آزاد کر دیا کرے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا یہ اقدام کافی فائدہ مند رہے گا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس سلسلے میں پیچھے نہیں ہٹے گا، چاہے اس معرکے میں، ان دونوں میں سے کوئی ایک تباہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ایک صبح انھوں نے چیپون کے بیڈروم کو خالی پایا۔ چھت کھلی ہوئی ملی اور شیشے کا کور اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ چیپون نے اوپر چڑھنے کے لیے اپنی بیڈ شیٹ استعمال کی تھی۔ چیپون اپنے چاہنے والے نائے امنوئے کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ تک پہنچنے میں کیا کیا تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت نہ کی ہوں گی۔

شاید چیپون نے اپنے ٹخنوں سے بندھی زنجیر اوپر اٹھا کر اس کا ایک سرا اپنی کمر کے گرد باندھ لیا ہوگا۔ وہ اپنے کپڑوں کی الماری پر چڑھ کر چھت پر آ گئی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند اور مضبوط جسم کی مالک لڑکی تھی اور اس کے لیے یوں فرار ہونا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔

لیکن اس کا میرے گھر تک پہنچ جانا تو واقعی ایک معجزہ تھا۔ اس نے مگرمچھوں سے اٹا پڑا دریا کس طرح عبور کیا ہوگا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ لوگ بھی اتنا کہہ پاتے تھے کہ وہ بس کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچ گئی ہوگی۔ کھلا دروازہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ یہاں موجود تھی۔

میں برآمدے کی طرف لپکا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ وہاں اس کا کوئی سراغ موجود نہ تھا۔ میں نے اسے دریا کے کنارے تک ڈھونڈا۔ میں شام تک اسے دیوانہ وار تلاش کرتا رہا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنے تھوڑے عرصے میں زیادہ دور تک جا سکی ہو اور اس نے میری آوازیں نہ سنی ہوں۔ میں نے اسے اتنی زیادہ مرتبہ پکارا تھا کہ مجھے اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ میں کارکنوں کے کوارٹروں میں گیا اور میں نے حکم دیا کہ بیس آدمی ادھر ادھر پھیل جائیں اور دریا کے آس پاس اس کا سراغ لگائیں۔ میں نے رات گئے تک انھیں اسے تلاش کرنے کو کہا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہم لوٹے۔

میں اپنے بنگلے میں واپس جانے کے بجائے تائی مانگ می طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنے

آپ سے کہا کہ اگر چیپون مجھے اس کے باپ کے گھر میں بخیر وعافیت مل گئی تو میں شکریے کے طور پر تاؤ کے سون کے قدموں پر جھکنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤں گا۔

جب میں تائی مانگ پہنچا تو مجھے میرے آدمیوں نے اطلاع دی کہ چیپون گھر پر موجود نہ تھی۔ بہر حال میں اپنی تسلی چاہتا تھا، اس لیے میں چیپون کے باپ سے ملنے چلا گیا۔ ہم دونوں کی آپس میں شدید نفرت کے باوجود، یہ بات اپنی جگہ اہم تھی کہ چیپون ہم دونوں ہی کو بہت پیاری تھی۔ لیکن وہ تباہ حال شخص تو صحیح معنوں میں ایک وحشی جانور تھا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ اگر چیپون اسے، اس شرمناک حالت میں واپس مل بھی گئی تو وہ اسے جان سے مار دے گا اور اس کی لاش کو کفن میں لپیٹ کر مجھے بھیج دے گا۔

میں واپس گھر پہنچا اور میں نے وہاں سے تیس آدمی لیے اور انھیں میں نے دو گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ انھوں نے چیپون کی تلاش میں دریا کے دونوں کناروں کو چھان مارا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سوائے دریا کے پانی کے کہیں سے بھی نہیں گزری تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ دریا کے تنگ راستے سے گزری ہو۔ میں نے دونوں گروپوں کی نگرانی کی اور دریا کی مخالف سمت میں سفر کرتا رہا۔

میں چوبیس گھنٹے تک چلتا رہا اور بھاگتا رہا۔ میں نے اس دوران میں برانڈی کے دو چار گھونٹ کے سوا شاید کچھ بھی نہیں لیا تھا۔ اس دوران میں شاید میں اونگھ بھی گیا تھا کیوں کہ جب میں نے آنکھ کھولی تو میری کشتی بس دریا کے کنارے سے ٹکرانے ہی والی تھی۔ میں نے کسی ایک ملاح سے پوچھا تھا کہ ہوا کیا ہے اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا۔

''کیا آپ نہیں جانتے کہ مگرمچھ ایک انسان کو کیسے نگل لیتے ہیں؟''

بہر حال مگرمچھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ سالم انسان کو نگل نہیں سکتا۔ اس کا منہ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ کسی جسم کے ٹکڑے نہیں کر سکتا۔ پھر اس کی دم اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکار کے جسم کو چیر پھاڑ نہیں سکتا۔ وہ اس جسم کو کھانے کے لیے کنارے پر ضرور آتا ہے۔ وہ جسم کے ایک حصے کو اپنے منہ میں لے کر اسے کسی درخت کے ساتھ بار بار مارتا ہے۔ اور جو حصہ علاحدہ ہو کر گر پڑتا ہے وہ اسے کھا لیتا ہے، وہ ہر مرتبہ کوئی حصہ کوئی ٹکڑا کھا لیتا ہے حتیٰ کہ وہ جسم غائب ہو جاتا ہے۔

اس لمحے مریض بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا اس نے خلا میں گھور کر دیکھا۔ اس کی خاموشی نے مجھے بے چین کر دیا اور میں نے سوال کر دیا۔

’’کیا ملاحوں نے چمپون کو پا لیا تھا؟‘‘

’’نہیں‘‘۔مریض نے کہا:’’انھیں صرف ایک انسانی ٹانگ ملی تھی جس کے گرد ایک زنجیر لپٹی ہوئی تھی اور یہ گھٹنے کے اوپر سے کٹی ہوئی تھی ۔یہ ایک درخت کی نچلی شاخ پر ٹنگی ہوئی تھی ۔۔۔۔

’’جناب کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ چمپون نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر دریا میں موجود مگرمچھوں کے سپرد کر دیا تھا؟‘‘یا یہ کہ وہ دریا عبور کرنے کے بعد تیر کر واپس اپنے باپ کے پاس پہنچ کر اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ایک غلط آدمی سے محبت کی تھی؟‘‘

☆☆☆☆

یاسوناری کاواباتا

ایک بازو

''رات بھر کے لیے میں تمھیں اپنا ایک بازو دے سکتی ہوں۔''لڑکی نے کہا۔اس نے اپنا دایاں بازو کندھے سے علاحدہ کیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے، اسے میرے گھٹنے پر رکھ دیا۔

''شکریہ۔''میں نے اپنے گھٹنے کی طرف دیکھا۔بازو کی گرمائش مجھ تک پہنچی۔

''میں یہ انگوٹھی پہنوں گی۔تمھیں یاد دلا دوں کہ یہ میری ہے۔''وہ مسکرائی اور اس نے اپنا بایاں بازو، میرے سینے کی طرف اٹھایا۔''پلیز۔''لیکن ایک ہاتھ سے انگوٹھی اتارنا اس کے لیے مشکل تھا۔

''منگنی کی انگوٹھی؟''

''نہیں، یہ ایک نشانی ہے، میری ماں کی طرف سے۔''

''شاید یہ ایک منگنی کی انگوٹھی ہی لگتی ہے۔لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔میں اسے پہنتی ہوں اور جب میں اسے اتارتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں ماں سے جدا ہو رہی ہوں۔''

بازو کو اپنے گھٹنے سے اٹھاتے ہوئے، میں نے انگوٹھی کو اس کی انگوٹھی والی انگلی میں کھسکا دیا۔

''کیا یہی ہے؟''

''ہاں، اس نے سر ہلایا۔جب تک انگلیاں اور کہنی نہ جھکے تو یہ مصنوعی لگے گا۔تم اسے پسند نہیں کرو گے۔مجھے اس میں جھکاؤ پیدا کرنے دو۔''

اس نے اپنا دایاں بازو گھٹنے پر سے اٹھایا اور نرمی سے اپنے ہونٹوں سے دبایا۔پھر اس نے انگلیوں کے جوڑوں کو دبایا۔

''اب یہ حرکت کریں گی۔''

''شکریہ۔''میں نے بازو واپس لیا۔اب کہنی اور انگلیاں جھک رہی تھیں۔کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ بولے گا؟ کیا یہ میرے ساتھ بات کرے گا؟''

''یہ وہی کرتا ہے جو ایک بازو کرتا ہے۔ اگر یہ بات کرتا ہے تو مجھے شبہ ہے کہ شاید ہی میں اسے واپس لوں۔ لیکن بہر حال تم کوشش کرو۔ اگر تمھارے تعلقات، اس کے ساتھ اچھے ہیں تو کم از کم یہ وہ ضرور سنے گا جو تم اسے کہو گے۔''

''میں اس کے ساتھ اچھا رہوں گا۔''

''میں تمھیں پھر ملوں گی۔'' اس نے کہا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں بازو کو یوں جوڑا جیسے وہ اپنی روح، اس میں منتقل کر رہی ہو۔ ''تم اس کے ہو لیکن صرف ایک رات کے لیے۔'' جب اس نے میری طرف دیکھا تو ایسے معلوم ہوا، جیسے وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''میں یہ تصور نہیں کر سکتی کہ تم اسے اپنے بازو کے ساتھ بدل لو گے۔'' اس نے کہا: ''لیکن ٹھیک ہی رہے گا۔ آگے بڑھو اور کر گزرو۔''

''شکریہ۔''

میں نے اس کا بازو اپنی برساتی میں رکھ لیا اور دھند آلود گلیوں میں اتر گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر میں ٹیکسی یا سٹریٹ کار لیتا ہوں تو یہ بڑا عجیب سا خیال ہو گا۔ لڑکی کا جسم سے علاحدہ کیا گیا بازو، اگر رو پڑے یا چیخنے لگے تو یہ ایک عجب سا نظارہ ہو گا۔

اس طرف، جس طرف میرا دایاں ہاتھ تھا، میں نے اسے اپنے کندھے کے جوڑ کی گولائی پر اپنی چھاتی کے ساتھ لگا لیا۔ یہ رین کوٹ کے اندر چھپا ہوا تھا اور وقفے وقفے سے اپنے بائیں ہاتھ سے مجھے اسے چھونا ہوتا تھا' یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ اب بھی وہاں موجود تھا۔ غالباً میں اس بازو کی موجودگی سے زیادہ اپنی خوشی پر یقین کرنا چاہتا تھا۔

جہاں میں چاہتا تھا اس نے وہیں سے بازو کو علاحدہ کیا تھا۔ یہ گول اور گداز تھا۔ کیا یہ بازو کے اوپر والے مقام کی طرف تھا یا کندھے کے آغاز پر؟ یہ گولائی مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والی ایک خوب صورت لڑکی جیسی تھی جو کہ جاپانیوں میں بہت کم تھی۔ یہ نفیس اور ستھرا پن، خود لڑکی کے اندر تھا، ایک ایسے کُرے کے مانند، جو تازہ اور مدھم روشنی کی طرح چمک رہا ہو۔ جب لڑکی صاف ستھری نہ رہے تو یہ نرم گولائی پلپلی سی ہو کر ماند پڑنے لگے گی۔ وہ چیز جو ایک خوب صورت لڑکی میں مختصر لمحات کے لیے ہو، اس نے مجھے لڑکی کے جسم کی گولائی کا احساس دلایا۔ اس کی چھاتیاں بڑی نہیں ہوں گی محتاط سی، بس اتنی بڑی کہ ہاتھوں کے پیالوں میں سما جائیں۔ ان میں چمٹ جانے والی نرمی اور مضبوطی ہونی چاہیے اور

بازو کی گولائی میں، میں اس کی ٹانگوں کو محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ چل رہی ہوں۔ وہ انھیں ایک چھوٹے پرندے کی طرح ہلکے پھلکے انداز میں لیے جائے گی یا وہ ایک تتلی کی طرح، ایک پھول سے دوسرے پھول تک جاتی جائے گی۔ جب وہ چومے گی تو اس کی زبان کی نوک پر، وہی ملائمت اور لطافت ہوگی۔

یہ بغیر آستینوں کے لباس والا موسم تھا۔ لڑکی کا کندھا جو ابھی حال ہی میں ننگا ہوا تھا، اس کی جلد کی رنگت ابھی ہوا کے کھردرے مس سے متعارف نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی کلی کے مانند تھی، جو موسمِ بہار کے سائے تلے نم آلودہ ہوئی ہو اور ابھی تک گرمی سے پامال نہ ہوئی ہو۔ میں اس صبح ایک میگنولیا کا شگوفہ لایا تھا اور میں نے اسے، ایک شیشے کے گلدان میں لگا دیا تھا اور لڑکی کے بازو کی گولائی اس عظیم اور سفید شگوفے کے مانند تھی۔ اس کے لباس کو پچھلی طرف سے ایسے ہی دوسرے بغیر آستینوں والے لباسوں سے، زیادہ بنیادی طریقے سے تراشا گیا تھا۔ کندھے کا جوڑ اور کندھا خوب نمایاں تھا۔ لباس ٗجو گہرے سبز سلک کا تھا اور تقریباً کالا تھا، ایک نرم سی چمک رکھتا تھا۔ لڑکی کے کندھوں کی ڈھلان گولائی میں تھی، جو کمر کے ابھار کی طرف ایک نرم سی لہر کا تاثر پیدا کرتی تھی۔ اگر ترچھے انداز میں، پیچھے سے دیکھا جائے تو گول کندھوں کا گوشت، لمبی پتلی گردن تک آتے ہوئے، اوپر کی طرف سنوارے گئے بالوں کے آغاز پر، اچانک رک جاتا تھا اور کالے بال کندھوں کی گولائی پر، ایک چمک دار سا سایہ بناتے تھے۔

لڑکی کو اندازہ تھا کہ میں اسے خوب صورت سمجھتا ہوں، اس لیے اس نے کندھے کی گولائی سے، اپنا دایاں بازو مجھے عاریتاً دیا تھا۔

برساتی کے نیچے احتیاط سے چھپایا گیا لڑکی کا بازو میرے ہاتھ سے زیادہ ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ میرے دل کے تیزی سے دھڑکنے کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ میرا ہاتھ گرم ہوگا۔ میں چاہتا تھا، اس کی گرمائش ایسے ہی قائم رہے جیسے خود لڑکی کی گرمائش تھی۔ اور جو معمولی سی ٹھنڈک میرے ہاتھ کی تھی، اس نے اس بازو کی خوشی، مجھ تک پہنچائی۔

دھند زیادہ تیز ہو گئی تھی ٗرات مجھے بارش کے انداز میں ڈرا رہی تھی اور میرے اَن ڈھکے بال گیلے ہو رہے تھے۔ میں اپنے پیچھے ایک فارمیسی کی بند دکان سے اٹھتی، ریڈیو کی آواز، سن سکتا تھا۔ وہاں سے اعلان ہو رہا تھا کہ دھند کی وجہ سے تین ہوائی جہاز لینڈ نہیں کر سکے اور ائیر پورٹ کے اوپر آدھے گھنٹے سے منڈلا رہے ہیں۔ سننے والوں کی، اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا رہی تھی کہ ایسی نم آلود راتوں کو گھڑیاں غلط وقت بھی بتانے لگتی ہیں۔ ایسی راتوں میں اگر گھڑیوں کو خاصی چابی دی جائے گی تو ان کے

سپر نگ ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔ میں نے اوپر چکر لگاتے ہوائی جہازوں کی روشنیوں کو تلاش کیا لیکن میں انھیں نہ دیکھ سکا۔ وہاں آسمان ہی نہیں تھا۔ دباؤ ڈالتا گیلا پن، میرے کانوں میں گھس رہا تھا اور مجھے دوری پر موجود، زمین کے اندر رہنے والے بے شمار کیڑوں کے اُڑنے سے پیدا ہوتی گیلی آواز، جیسا تاثر محسوس ہو رہا تھا۔ میں فارمیسی کے سامنے کھڑا مزید تنبیہ کا منتظر رہا۔ مجھے تجربہ ہوا کہ اس طرح کی راتوں میں چڑیا گھر کے خوں خوار درندے، شیر، ببر شیر اور چیتے اور باقی سب اس گیلے پن میں اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے دھاڑتے ہیں اور اس وقت ہم انھیں سننے کے لیے موجود تھے۔ ایک گونج نمودار ہوئی جیسی زمین کی گونج ہوتی ہے۔ تب میں نے یہ بھی جانا کہ حاملہ عورتوں اور اداس لوگوں کو، ایسی راتوں میں جلد سو جانا چاہیے اور جن عورتوں نے اپنی جلد پر براہِ راست پرفیوم چھڑکا ہو، ان کے لیے بعد میں، اسے اپنے جسم سے علاحدہ کرنا مشکل ہوگا۔

درندوں کی دھاڑ کے ساتھ میں چل پڑا اور پرفیوم کی حرارت، میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ غصیلی دھاڑ نے مجھے مضطرب کر دیا تھا اور میں چلتا رہا کہ کہیں میرا اضطراب اس لڑکی کے بازو میں نہ منتقل ہو جائے۔ لڑکی نہ تو حاملہ تھی اور نہ ہی افسردہ یا مایوس، لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اس رات کو ریڈیو کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے، ایک بازو کے ساتھ جلد ہی بستر پر چلی جائے گی۔ مجھے امید تھی کہ وہ صحیح طور پر سو سکے گی۔

جیسے ہی میں گلی میں پہنچا، میں نے برساتی کے اندر اپنے بائیں ہاتھ کو دبایا۔ ایک ہارن کی آواز آئی۔ کوئی میرے پہلو سے مجھے چھوتا ہوا گزرا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ شاید بازو، اس ہارن کی وجہ سے ڈر گیا تھا۔ انگلیاں جکڑنے کو تھیں۔

''فکر نہ کرو۔'' میں نے کہا: ''یہ بہت دوری پر تھا، یہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یُوں یُوں کر رہا تھا۔''

چوں کہ میں ایک بہت ہی اہم چیز کو پکڑے ہوئے تھا، اس لیے میں نے دونوں اطراف میں دیکھا۔ ہارن کی آواز اتنی زور سے آ رہی تھی کہ میں نے سوچا کہ یہ کسی اور کے لیے ہوگی۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر سے یہ آ رہی تھی، لیکن میں کسی کو نہ دیکھ سکا۔ میں صرف ہیڈ لائٹس کو دیکھ سکا۔ وہ ایک بہت زیادہ پھیلاؤ والے مدھم ہوتے ارغوانی دھبے میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ لائٹس کے لیے ایک عجیب رنگ۔ جب میں نے گزرتے ہوئے، اسے اپنے قریب سے سرکتے ہوئے دیکھا تو میں خود پر قابو پائے

ہوئے تھا۔ ارغوانی رنگ میں رنگی، ایک نوجوان خاتون گاڑی چلا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے وہ میری طرف مڑ کر تھوڑا سا جھکی ہو۔ میں نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔ مجھے لگا کہ وہ لڑکی بازو لینے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ وہ لڑکی تو ایک بازو کے ساتھ ڈرائیو کرنے کے قابل نہیں رہی ہوگی۔ لیکن کیا اس گاڑی چلانے والی عورت نے، یہ نہیں دیکھ لیا ہوگا کہ میں کیا اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں؟ کیا اس نے نسوانی وصف کے وجدان کے ساتھ، اس کا ادراک نہیں کر لیا ہوگا؟ مجھے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچنے سے پہلے کسی اور شخص سے مڈبھیڑ ہونے سے خود کو بچانا ہوگا۔ عقبی روشنیاں بھی، ایک مدھم سا نیلا پن لیے ہوئے تھیں۔ میں نے ابھی تک کار کو نہیں دیکھا تھا۔ خاکستری دھند میں ایک دھبے جیسا ارغوانی پھول تیرتا ہوا پرے چلا گیا۔

''وہ بغیر کسی وجہ کے ڈرائیو کر رہی ہے، وہ بالکل کسی وجہ کے بغیر بس ڈرائیونگ کے لیے ڈرائیو کیے جا رہی ہے۔ اور ڈرائیو کرتے ہوئے ہی وہ غائب ہو جائے گی۔'' میں بڑبڑایا: ''اور اس پچھلی سیٹ پر کیا بیٹھا ہوا تھا؟''

بظاہر کچھ بھی نہیں۔ کیا یہ اس وجہ سے تھا کہ میں لڑکی کا بازو ساتھ لیے ہوئے پھر رہا ہوں اور شاید اسی لیے میں خالی پن سے کمزور ہو رہا تھا؟ جو کار وہ ڈرائیو کر رہی تھی، اس کے ساتھ رات کی چپ چپی دھند چلی جا رہی تھی اور ہیڈ لائٹس میں کچھ اس کے متعلق ایسا تھا، جو دھندلے پن میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اگر یہ اس کے اپنے بدن سے نہیں آ رہی تھی تو یہ ارغوانی روشنی کہاں سے آ رہی تھی؟ کیا ایک بازو، جسے کہ میں نے چھپایا ہوا تھا کے پاس خالی پن والا ایسا لباس تھا کہ ایک عورت ایسی رات کو اکیلی سفر کر رہی تھی؟ کیا اس عورت نے کار سے اس لڑکی کے بازو کے لیے سر ہلایا تھا؟ شاید ایسی رات میں، عورتوں کی حفاظت کے لیے فضا میں بھوت اور فرشتے ہوتے ہیں۔ شاید وہ عورت کار میں نہیں تھی، مل کہ ایک ارغوانی روشنی میں سفر کر رہی تھی۔ اس کا سفر خالی (از غایت) نہیں تھا۔ وہ عورت میرے اس راز کی جاسوسی کر رہی تھی۔

میں ایسی مزید اتفاقیہ ملاقاتوں سے بچنے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف واپس ہوا۔ میں نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر سننے کی کوشش کی۔ ایک جگنو جیسی روشنی میرے سر کو چھوتی ہوئی غائب ہو گئی۔ یہ روشنی ایک جگنو کی روشنی سے بھی زیادہ بڑی اور طاقتور تھی۔ میں پیچھے کی طرف گھوما۔ جگنو جیسی اور بہت سی روشنیاں مجھے چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ اس سے پہلے کہ دبیز دھند، انھیں نگل جائے وہ

غائب ہوگئیں۔ کیا میرے پہنچنے سے پہلے، کسی قسم کی Death fire یا چھلاوا، وہاں پر دوڑتا ہوا آ پہنچا تھا؟ لیکن پھر میں نے دیکھا کہ یہ چھوٹے پتنگوں کا ایک جھرمٹ تھا۔ دروازے کی روشنی کی زد میں آ کر پتنگوں کے پر، جگنوؤں کی طرح روشن ہو اٹھے تھے۔ وہ جگنوؤں جتنے بڑے نہیں تھے، لیکن پھر بھی پروانوں کے لیے اتنے چھوٹے کہ غلط فہمی میں مبتلا ہوا جا سکتا تھا۔

خودکار ایلیویٹر کو نظر انداز کرتے ہوئے، میں نے تیسرے فلور تک جانے والی تنگ سیڑھیوں والا راستہ، چوری چھپے کے انداز میں، طے کیا۔ کھبو نہ ہونے کی وجہ سے، مجھے دروازے کا تالہ کھولنے میں مشکل پیش آئی۔ میں نے جتنی زیادہ کوشش کی، اتنا ہی میرا ہاتھ کانپا، جیسے کسی جرم کے ارتکاب کے بعد کانپتا ہے۔ کوئی چیز کمرے میں میرا انتظار کر رہی ہوگی، وہ کمرہ جہاں، میں تنہا رہتا تھا اور تنہائی موجود نہیں تھی؟ لڑکی کے بازو کی وجہ سے، اب میں اکیلا نہیں تھا۔ اور یوں خود، میری اپنی ہی تنہائی مجھے ڈرانے کے لیے، وہاں میری منتظر تھی۔

''آگے بڑھو۔'' میں نے لڑکی کا بازو باہر نکالتے ہوئے، آخر کار دروازہ کھولا: ''میں تمھیں اپنے کمرے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں لائٹ جلاؤں گا۔''

''کیا تم کسی چیز سے خوف زدہ ہو۔'' بازو یہ کہتا ہوا محسوس ہوا: ''کیا یہاں کچھ ہے؟''

''تمھارے خیال میں وہاں کچھ ہو سکتا ہے؟''

''میں کچھ سونگھ رہا ہوں۔''

''لو؟ یہ میں ہوں گا جسے کہ تم سونگھ رہے ہو۔'' کیا تم اندھیرے میں میرے سائے کی نشانیاں نہیں دیکھ رہے ہو؟ احتیاط سے دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ میرا سایہ میری واپسی کا منتظر ہو؟''

''یہ ایک اچھی بو ہے۔''

''اوہ، میگنولیا'' میں نے بشاشت سے کہا۔ میں خوش تھا یہ میری تنہائی کے بوسیدہ پن کی بو نہیں تھی۔ میرے دلکش مہمان کے لیے میگنولیا کی مناسبت بالکل ٹھیک تھی۔ میں اندھیرے سے مانوس ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ بہت گہرے اندھیرے میں بھی جان سکتا تھا کہ ہر چیز کہاں پر تھی۔

''مجھے لائٹ جلانے دو۔'' بازو کی طرف سے ایک ریمارکس آیا: ''میں اس سے پہلے تمھارے کمرے میں نہیں آیا۔''

''شکریہ، مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' اور کسی نے نہیں لیکن صرف میں نے اس سے پہلے یہاں کی

بتیاں جلائی ہیں۔''میں نے دیوار کے ساتھ لگے سوئچ کی طرف بڑھتے ہوئے بازو کو تھامے رکھا۔ایک ہی وقت میں ساری کی ساری پانچ لائٹس چھت میں، میز پر، بیڈ پر، کچن اور باتھ روم میں جل اٹھیں۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی روشن ہوں گی۔

میکو لیا اپنے پورے جوبن پر تھا۔اس صبح کو یہ ایک شگوفے کی شکل میں تھا۔یہ عین اسی وقت کھلنے والا ہو سکتا تھا اور ابھی صرف میز پر زرد ریشے موجود تھے۔ میں نے حیرت کے ساتھ بہت نزدیکی سے زرد ریشوں کو دیکھا۔ جب میں نے ایک رو کو اٹھا کر غور سے دیکھا تو لڑکی کے بازو نے، جو میز پر پڑا تھا، متحرک ہونا شروع کیا، اس کی انگلیاں کنڈل کیچوے کی طرح تھیں۔اس نے زرد ریشوں کو اپنے ہاتھ میں سمیٹا۔ میں انھیں کوڑے دان میں پھینکنے کے لیے آگے بڑھا۔

''کتنی تیز بو ہے۔یہ میری جلد میں پیوست ہو رہی ہے۔میری مدد کرو۔''

''تم تھک گئے ہو گے۔یہ کوئی آسان ٹرپ نہیں تھا۔میرے خیال میں، تمھیں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنا چاہیے۔''

میں نے بازو کو بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اسے نرمی سے تھپکا۔

''یہ کتنا خوب صورت ہے۔یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔''بازو بستر کی چادر پر سے بولے گا۔نیلگوں آسمانی زمین پر تین رنگوں کے پھول پرنٹ کیے گئے تھے۔جو شخص تنہا رہتا ہو، اس کے لیے کسی قدر رخوش کن تھے۔

''تو یہ ہے وہ جگہ، جہاں ہم رات گزاریں گے۔ میں بہت خاموش رہوں گا۔''

''اوہ۔''

''میں تمھارے پہلو میں ہوں گا اور نہیں بھی ہوں گا۔''

ہاتھ نے نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ناخن جو احتیاط سے پالش کیے گئے تھے، ہلکے گلابی تھے نوکیں انگلیوں سے کافی آگے تک بڑھائی گئی تھیں۔

میرے اپنے چھوٹے اور موٹے ناخنوں کے برعکس، اس کے ناخن بڑی عجیب خوب صورتی کے حامل تھے، جیسے ان کا تعلق کسی انسانی مخلوق سے نہ ہو، ایسی انگلیوں کی نوکوں والی، ایک عورت صرف انسانیت کی بلندی پر ہی فائز ہو سکتی تھی۔یا یہ کہ وہ خود کو عورت پن کی طرف مائل کر رہی تھی؟اس کے اندر کے نمونے سے ایک چمک دار چھلکا، شبنم میں بنائی ہوئی ایک پتی، میں نے (اس کے بارے میں)واضح

پسندیدگیوں کے بارے میں سوچا۔ حالاں کہ میں ابھی تک ایسے چھلکے اور پتی کے بارے میں نہیں سوچ سکا تھا، جس کا رنگ اور شکل، ان سے ملتی جلتی تھی۔ یہ لڑکی کی انگلیوں کے ناخن تھے، جن کا موازنہ کسی اور چیز سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک پتلی سی پتی اور نازک سے چھلکے کی حد سے زیادہ نیم شفاف، یہ چیزیں کسی ایسے جیسی، شبنم کو اپنے اندر سنبھالے ہوئے لگتی تھیں۔ ہر دن اور ہر رات میں، اس کی تمام تر قوت، اس غم ناک خوب صورتی کو چمکاتے ہوئے انڈیلی جارہی تھی۔ یہ میری تنہائی میں دھنس گئی۔ شاید میرے اشتیاق ،میری تنہائی نے، ان کو شبنم میں تبدیل کر دیا تھا۔

میں نے اس کے پتلے لمبے ناخن کی طرف دیکھتے ہوئے، جسے میں نے اپنے انگوٹھے سے رگڑا تھا اپنے خودمختار ہاتھ کی انگشتِ شہادت پر، اس کی چھوٹی انگلی کو رکھ دیا۔ میری انگلی نے، اس کی انگلی کی نوک کو، جو ناخن کی آڑ میں تھی، چھوا۔ انگلی اور کہنی بھی جھک گئی۔

''کیا یہ گدگداتی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اسے ایسا کرنا چاہیے۔''

میں نے لاپرواہی سے کہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عورت کی انگلیوں کی نوکیں، اس وقت بہت حساس ہوتی ہیں، جب کہ ان کے ناخن لمبے ہوں۔ اور اس طرح میں نے لڑکی کے بازو کو بتایا کہ میں دوسری عورتوں کو بھی جانتا تھا۔

ایک وہ جو کہ اس لڑکی سے، جس نے مجھے بازو ادھار دیا تھا، بہت زیادہ بڑی عمر کی نہیں تھی لیکن وہ مردوں کے تجربے کے حوالے سے کہیں زیادہ پختگی کی حامل تھی، میں نے اس سے سنا تھا کہ انگلیوں کی نوکیں، جو ناخنوں سے ڈھکی ہوتی ہیں، اکثر بہت زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک تھی، جو چیزوں کو سرِ انگشت سے نہیں بل کہ ناخنوں سے چھوتی تھی اور اسی لیے جب کوئی چیز ان کے مقابل آتی تھی تو یہ گدگداتی تھیں۔

میں نے اس انکشاف پر، حیرانی کا اظہار کیا تھا تو وہ کہتی چلی گئی: ''مثلاً تم کھانا پکا رہے ہو یا کھانا کھا رہے ہو، کوئی چیز ہماری انگلیوں کو چھو جائے تو تم اپنے کندھے کو جھکا دیتے ہو، یہ بہت گندا لگتا ہے۔''

کیا یہ غذا تھی، جو ناصاف محسوس ہوئی تھی، یا کہ سرِ انگشت؟ جو کوئی چیز بھی اس کی انگلیوں کو چھوتی تو وہ اس کے ناصاف ہونے کی بنا پر تلملا اٹھتی۔ اس کی اپنی صفائی ایک الم ناک شبنم کے قطرے کے پیچھے جو کہ ناخن کے لمبے سائے کے نیچے موجود ہوتی تھی، کی اوٹ میں رہ جاتی تھی۔ کسی کو یہ تصور

نہیں کرنا چاہیے کہ دس انگلیوں میں سے، ہر انگلی کے لیے ایک علاحدہ شبنم کا قطرہ ہوگا۔

یہ فطری بات تھی کہ مجھے ان سرِ انگشت کو زیادہ سے زیادہ چھونا چاہیے تھا لیکن میں نے خود کو روکے رکھا۔میری تنہائی نے مجھے پیچھے کردیا۔وہ ایک ایسی عورت تھی، جس کے بدن پر چند نازک سے نشان رہ جانے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

اور وہ لڑکی، جس نے مجھے اپنا بازو عاریتاً دیا تھا یہ ان گنت ہو سکتے تھے۔شاید ایسی کسی لڑکی کے انگلیوں کی نوکوں سے کھیلنے سے، مجھے احساسِ ندامت نہیں مل کہ الفت محسوس ہوگی۔لیکن اس نے مجھے اپنا بازو ایسا کوئی کھیل کھیلنے کے لیے نہیں دیا تھا۔ مجھے اس کے اس انداز کو مزاحیہ رنگ نہیں دینا چاہیے۔

''کھڑکی۔''میں نے دھیان نہیں دیا کہ کھڑکی تو پہلے ہی کھلی ہوئی تھی لیکن پردہ نیچے نہیں گرا ہوا تھا۔

''کیا کوئی دیکھ لے گا؟''لڑکی کے بازو نے پوچھا۔

''کوئی مرد یا عورت،اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''کوئی انسان مجھے نہیں دیکھ سکتا۔اگر کوئی چیز ہوسکتی ہے تو وہ اپنی ذات ہوگی، تمھاری۔''

''اپنی ذات''یہ کیا ہے؟ یہ کہاں ہے؟''

''بہت دور۔''بازو نے کہا جیسے کہ وہ تسلی دینے کے لیے گا رہا ہو:''لوگ خود کو اپنی ذات کو پانے کے لیے گھومتے رہتے ہیں، بہت دور۔''

''اور کیا وہ ایسا کر پاتے ہیں؟''

''بہت دور۔''بازو نے ایک بار پھر کہا۔

مجھے محسوس ہوا کہ بازو اور لڑکی بذاتِ خود ایک دوسرے سے لامتناہی دوری پر تھے۔کیا اتنی دوری سے بازو لڑکی کی طرف لوٹ سکے گا؟ کیا اتنی دوری سے میں اسے واپس لے جانے کے قابل ہو سکوں گا؟ بازو مجھ پر اعتبار کرتے ہوئے، پرسکون انداز میں پڑا تھا اور کیا وہ لڑکی اس پرسکون اعتماد سے سو رہی ہوگی؟ کیا وہاں پر کھردرا پن ایک ڈراؤنا خواب نہیں ہوگا؟ کیا جب وہ اس سے جدا ہوئی تھی تو وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی تھی؟ بازو اب میرے کمرے میں تھا، جس سے لڑکی ابھی تک مل نہیں پائی تھی۔

نمی نے کھڑکی کو دھندلا دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ٹوڈ (مینڈک) نے اپنا پیٹ اس پر پھیلا رکھا ہو۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے دھند نے بارش کو، ہوا کے درمیان ہی روک رکھا ہے اور کھڑکی کے باہر فاصلہ معدوم ہو گیا تھا جو ایک لامحدود فاصلے میں لپٹا ہوا تھا۔ وہاں دیکھنے کے لیے چھتیں نہیں تھیں اور نہ ہی سننے کے لیے ہارن تھے۔

''میں کھڑکی بند کر دوں گا۔'' پردے تک پہنچتے ہوئے میں نے کہا۔ نمی بہت زیادہ تھی۔ میری تینتیس سالہ زندگی سے کم عمر نظر آنے والا، میرا چہرہ کھڑکی پر جھک گیا۔ تاہم میں نے پردہ کھینچنے میں کوئی تردد نہیں کیا تھا۔ میرا چہرہ غائب ہو گیا۔

اچانک ایک کھڑکی کی یاد مجھ تک پہنچی۔ ایک ہوٹل کے نویں فلور پر، دو چھوٹی لڑکیاں سرخ رنگ کے کھلے سکرٹس پہنے ہوئے کھڑکی کے قریب کھیل رہی تھیں۔ بالکل اس طرح کے بچے، ایسے ہی کپڑوں میں۔ شاید جڑواں۔ ان کا تعلق مغربی دنیا سے تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہوئے، وہ کندھوں کے ساتھا سے دھکیلتے ہوئے شیشے کے ساتھ ٹکرائے۔ ان کی ماں، جس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی، کچھ بننے میں مصروف تھی۔ اگر شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑے ڈھیلے ہو جاتے یا ٹوٹ جاتے تو انھوں نے نویں فلور سے نیچے گر جانا تھا۔ یہ میں ہی تھا، جس نے انھیں، اس خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ ان کی والدہ، اس سے بے خبر تھی۔ وہ شیشہ اصل میں اتنا مضبوط تھا کہ وہاں (گرنے کا) کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔

جب میں کھڑکی کی طرف سے مڑا تو بازو نے کہا: ''یہ بہت خوب صورت ہے۔ شاید وہ بستر کی طرز پر، بنائے گئے پھول کے نمونوں والے پردے کے متعلق کچھ کہہ رہی تھی۔

''اوہ، لیکن سورج کی وجہ سے، اس کا رنگ اڑ گیا ہے اور یہ تقریباً اپنی عمر پوری کرنے والا ہے۔'' میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور بازو کو اپنے گھٹنے پر رکھ دیا۔ یہ وہ چیز ہے جو خوب صورت ہے۔ کسی بھی چیز سے زیادہ خوب صورت۔''

اس ہاتھ کی ہتھیلی کو، اپنی دائیں ہتھیلی پر اور کندھے کو، اپنے بائیں ہاتھ پر لیتے ہوئے، میں نے کہنی کو خم کیا اور پھر دوبارہ ایسا کیا۔

بازو نے مسکرانے کے انداز میں کہا: ''ذرا تمیز سے، کیا تم کوئی کھیل کھیل رہے ہو؟''

''کم از کم ایسا تو نہیں ہے۔''

روشنی کی طرح گزر جانے والی مسکراہٹ بازو پر ابھر آئی ۔ یہ لڑکی کے گال پر ابھرنے والی بالکل تازہ مسکراہٹ تھی ۔

میں مسکراہٹ کو جانتا تھا۔ کہنیاں میز پر لٹکائے ہوئے، وہ ڈھیلے انداز میں اپنے ہاتھوں کو بند کرے گی اور اپنی ٹھوڑی یا گال، ان پر رکھ دے گی ۔ یہ پوز ایک نوجوان لڑکی کے لیے خوش نما نہیں ہونا چاہیے حالاں کہ ایسا کرنے میں ایک ہلکا سا معیار ضرور موجود تھا۔ پھر بھی ''کہنیاں میز پر'' والا اظہار غیر مناسب انداز میں پیش کیا گیا لگتا تھا۔ کندھوں کی گولائی، انگلیاں، ٹھوڑی، گال، کان، لمبی پتلی گردن، بال یہ سب ایک واحد متناسب حرکت کے ساتھ اکٹھے آئے تھے۔ چھوٹی اور پہلی انگلی کو جھکا کر مہارت سے چھری کانٹے کو استعمال کرتے ہوئے، وہ وقتاً فوقتاً نہایت آہستگی سے، اوپر اٹھائے گی۔ غذا، چھوٹے ہونٹوں سے گزارے گی اور اسے کھائے گی۔ میرے سامنے کھانے پر موجود، کسی انسان سے زیادہ گلے، چہرے اور ہاتھوں کی موسیقی مدعو تھی۔ اس کی مسکراہٹ کی روشنی، اس کے بازو کی جلد میں سے گزرتی ہوئی بہہ رہی تھی ۔

بازو مسکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کیوں کہ جب میں نے اسے خم کیا تو ہموار جلد کے اوپر سائے اور روشنی کی لہریں بھیجنے کے لیے مضبوط اور نازک پٹھوں پر سے بہت نرم لہریں گزر گئیں۔ اس سے پہلے جب میں نے لمبے ناخنوں کے نیچے انگلیوں کی نوکوں کو چھوا تو بازو کے اوپر سے گزرتی روشنی نے کہنی کے جھکاؤ پر میری توجہ مبذول کر لی۔ اور یہ کسی کھیل پر مبنی جذبے کی وجہ سے نہیں تھا بل کہ یہ وہی تھا، جس نے مجھے اسے جھکانے یا نہ جھکانے پر لگا دیا تھا۔ میں رک گیا اور میں نے اپنے گھٹنے پر پھیل کر پڑے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ تازہ روشنیاں اور سائے ابھی تک اس پر سے گزر رہے تھے۔

''تم کہہ سکتے ہو کہ میں کوئی کھیل کھیل رہا ہوں ۔ تم محسوس کرتے ہو کہ مجھے اپنا بازو تمھارے بازو سے بدلنے کی اجازت ہے؟''

''میں اجازت دیتا ہوں ۔''

''میں کسی وجہ سے ایسا کرنے سے ڈرتا ہوں ۔''

''اوہ!''

''کیا میں کر سکتا ہوں؟''

''پلیز ۔''

میں نے سن لیا تھا کہ مجھے اجازت مل گئی تھی، میں متردد تھا کہ آیا، میں اس بات کو قبول کروں یا نہ کروں۔ ''دوبارہ کہو، کہو، پلیز۔''

''پلیز، پلیز۔''

مجھے یاد آیا۔ یہ اس عورت جیسی آواز تھی، جس نے مجھے اپنا آپ سونپ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لڑکی نے، جس نے مجھے اپنا بازو دیا تھا، یہ عورت اس جیسی خوب صورت نہیں تھی۔ شاید اس کے ساتھ کچھ تھوڑی سی عجیب بات تھی۔

''پلیز۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے اپنی انگلیاں اس کے پپوٹوں پر رکھیں اور انھیں بند کر دیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''خداوند خدا، رو دیا۔ تب یہودی بولے، لو دیکھو وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔''

''وہ' اس کے لیے ایک غلطی تھی۔ یہ مردہ فقیر کی کہانی تھی۔ شاید ایک عورت کی طرح، اس نے اسے غلط سوچا تھا۔ شاید جانتے بوجھتے ہوئے اس کا متبادل بنایا تھا۔

اس منظر کے لیے اتنے نامناسب الفاظ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے ایسے حیرانی سے گھورا، جیسے ابھی آنسو اس کی بند آنکھوں سے نکل پڑیں گے۔

اس نے انھیں کھولا اور اپنے کندھوں کو اٹھایا۔ میں نے اس کو اپنے بازو سے پیچھے کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر کے پیچھے رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے تکلیف پہنچا رہے ہو۔''

سفید تکیے پر خون کا ایک چھوٹا سا دھبا موجود تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو پرے کرتے ہوئے، اس کے سر پر پھیلتے ہوئے خون کے قطرے پر اپنے ہونٹ رکھے۔

اس نے اپنی تمام ہیئر پنیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ معمولی سے چھونے پر میرا خون آسانی سے بہہ نکلتا ہے۔''

ایک ہیئر پن اس کی جلد میں چبھ گئی تھی۔ ایک کپکپی اس کے اندر چھڑتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

اگرچہ میں سوچتا ہوں، مجھے سمجھ ہے کہ جب ایک عورت کسی کو اپنا آپ سونپ دیتی ہے تو وہ کیسا محسوس کرتی ہے، پھر بھی ابھی تک اس عمل کے متعلق کچھ ہے جو غیر وضاحت شدہ ہی ہے۔ یہ اس کے لیے کیا ہے؟ وہ کیوں ایسا کرنا چاہتی ہے، کیوں اسے ہی پہل کرنی چاہیے؟ میں اصل میں کبھی پسپائی

اختیار نہیں کر سکتا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر عورت کا جسم اس کے لیے بنایا گیا تھا۔حتیٰ کہ اب بھی، میرے جیسے بوڑھے کے لیے، یہ ایک عجیب بات ہے۔اور جیسا کہ مختلف عورتیں جو انداز اختیار کرتی ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی، یا بعینہ شاید، یا حتیٰ کہ مماثلت کے ساتھ۔کیا یہ عجیب نہیں ہے؟ شاید جو اجنبیت، میں اس سارے عمل میں پاتا ہوں وہ ایک نوجوان شخص جیسا تجسس ہے،شاید کسی شخص کی وہ مایوسی جو سالوں کے اندر بڑھ جاتی ہے یا شاید ایسی روحانی کمزوری جس میں، میں مبتلا ہوں۔

پیچھے ہٹنے کے عمل میں،اس کو جو دکھ تھا،وہ سب عورتوں میں مشترک نہیں تھا۔اور ایک وقت میں یہ صرف،اسی کے ساتھ تھا۔نقرئی دھاگا کٹ چکا تھا۔سونے کا پیالہ تباہ ہو چکا تھا۔

''پلیز'بازو نے کہا تھا اور اس طرح،اس نے مجھے دوسری لڑکی کے بارے میں یاد دلایا تھا۔

لیکن کیا دونوں آوازیں ایک جیسی نہیں؟ کیا وہ ایک ہی طرح نہیں سنائی دیتی تھیں؟ کیوں کہ لفظ تو ایک جیسے ہی تھے۔کیا بازو نے پورے جسم کے ناپ میں سے،اپنے لیے خود مختاری حاصل کر لی تھی،جس سے کہ یہ علاحدہ ہوا تھا؟اور کیا الفاظ،ندامت،ذمہ داری یا ضبط کے بغیر،اس کے اپنے آپ کو تج دینے کا عمل،کسی بھی چیز کے لیے تیاری کی طرح نہیں تھا؟ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اگر میں،اس کے بازو سے،اپنے بازو کی تبدیلی کی دعوت کو قبول کرتا ہوں تو، میں لڑکی کو ناقابلِ بیان درد میں مبتلا کر دوں گا۔

میں نے اپنے گھٹنے پر موجود بازو کو غور سے دیکھا۔کہنی کے اندر ایک سایہ تھا۔مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کو چوس سکتا ہوں۔میں نے سایے کو سمیٹنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو اس پر رکھا۔

''یہ گدگداتا ہے۔ذرا تمیز اختیار کرو۔''بازو میرے ہونٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میری گردن کے گرد موجود تھا۔

''تب، جب میں ایک اچھی سی مے نوشی کر رہا تھا۔''

''اور تم کیا پی رہے تھے؟''

میں نے جواب نہیں دیا۔

''تم کیا پی رہے تھے؟''

''روشنی کی جلد کی خوشبو۔''

دھند اور زیادہ دبیز ہو گئی تھی کیوں کہ میگنولیا کے پتے گیلے ہو چکے تھے اور پتہ نہیں کون سی وارننگیں ریڈیو سے نشر ہوں گی؟ میں اپنے میز پر رکھے ریڈیو کی طرف بڑھا اور رک گیا۔اسے سننے کے

لیے، جب کہ بازو میری گردن کے گرد موجود تھا۔لیکن مجھے شبہ تھا کہ میں کچھ ایسا سن سکوں گا کیوں کہ گیلی شاخوں اور خود ان کے گیلے پاؤں اور پروں کی وجہ سے چھوٹے پرندے نیچے گرے ہوئے ہیں اور اڑ نہیں سکتے ۔پارکوں میں سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو احتیاط کرنی چاہیے، کہیں وہ ان کو روند نہ ڈالیں۔ اور اگر گرم ہوا چلتی ہے تو دھند شاید اپنا رنگ تبدیل کر لے گی۔ سننے والوں کو چاہیے کہ اگر دھند گلابی یا ارغوانی رنگ اختیار کر لے تو وہ اپنے دروازوں پر تالے ڈال دیں۔

''رنگ کی تبدیلی؟'' میں بڑبڑایا: ''ارغوانی اور گلابی رنگت اختیار کرنا؟''

میں نے پردہ ہٹایا اور باہر دیکھا۔ دھند بے وزنی کی حالت میں نیچے اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ۔کیا یہ اس ہوا کی وجہ سے تھا کہ ایک پتلا اندھیرا، رات کے کالے پن سے مختلف، یہاں وہاں متحرک تھا۔ دھند کی دبازت لامتناہی محسوس ہوتی تھی اور اس سے آگے کوئی ڈراؤنی چیز، کنڈلی مارے بیٹھی تلملا رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے، جب میں اس ادھار لیے گئے بازو کے ساتھ، گھر کی طرف آ رہا تھا تو ارغوانی ملبوس والی، وہ عورت جو کار چلا رہی تھی، اس کی اگلی اور پچھلی لائٹس کی کرنیں، دھند میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ایک مدھم ارغوانی رنگ کی پھیلی ہوئی عظیم گولائی، مجھے اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے پردہ نیچے کر دیا۔

''بستر پر جانا چاہیے، ہمیں بھی۔''

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت دنیا میں کوئی بھی جاگ نہیں رہا ہوگا۔جاگتے رہنے میں ایک خوف تھا۔بازو کو اپنی گردن سے علاحدہ کر کے میں نے میز پر رکھ دیا۔ میں نے سوتی پرنٹ والا غیر استعمال شدہ لباس پہن لیا۔جب میں کپڑے بدل رہا تھا تو بازو مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس طرح دیکھنے پر شرم محسوس کر رہا تھا۔کمرے میں، اس طرح بے لباس حالت میں، مجھے آج تک کسی عورت نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس بازو کے ساتھ میں بستر پر آ گیا۔ میں اس کا سامنا کر رہا تھا اور پھر آہستگی سے ، میں اسے اپنی چھاتی کے قریب لایا۔یہ خاموش لیٹا رہا۔ وقفے وقفے سے میں بارش کی کم ہوتی آواز سن رہا تھا۔ایک بہت ہلکی سی آواز جیسے دھند بارش میں تبدیل ہو رہی ہو بلکہ وہ خود ہی قطروں کی شکل اختیار کر رہی ہو۔کمبل کے نیچے انگلیوں نے میرے ہاتھ کو پکڑ رکھا تھا وہ اب گرم ہو اٹھی تھیں اور اس طرح مجھے احساس کی بے حد خاموش حدت مل رہی تھی۔حقیقت یہ تھی کہ انھوں نے مجھے میری اپنی حرارت کے برابر

گرم نہیں کیا تھا۔

''کیا تم سو گئے ہو؟''

''نہیں۔'' بازو نے جواب دیا۔

''تم اتنے خاموش تھے کہ میں نے سمجھا تم سو گئے ہو۔''

''تم...... کیا ایسا چاہتے ہو کہ میں وہ کروں؟''

اپنے کمونو کو کھولتے ہوئے میں بازو کو اپنے سینے کی طرف لایا۔ گرمائش میں جو فرق تھا وہ اس میں مدغم ہو گیا۔ کسی حد تک حبس والی، کسی حد تک ٹھنڈی رات، میں جلد کی ملائمت بہت خوش کن تھی۔

لائٹس ابھی تک جل رہی تھیں۔ میں بستر پر آنے سے پہلے انھیں بجھانا بھول گیا تھا۔

''لائٹس۔'' میں اٹھا اور بازو میری چھاتی سے گر گیا۔

میں نے اسے اٹھانے میں جلدی کی۔ ''کیا تم لائٹس آف کرو گے؟'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔

''تم اندھیرے میں سوتے ہو یا روشنی میں؟''

بازو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ یقیناً جانتا تھا کہ اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ میں اس کے شبینہ معمولات کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے دو تصاویر کا آپس میں موازنہ کیا۔ ایک میں وہ اندھیرے میں تھی اور دوسری میں روشنی میں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات اپنے بازو کے بغیر وہ روشنیاں جلائے رکھے گی۔ کسی حد تک، میں خود بھی انھیں جلتا ہوا، رہنے دینا چاہتا تھا۔ میں بازو کو بغور دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے میں، اس کے سو جانے تک، جاگتے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میری انگلیاں دروازے کے ساتھ لگے، سوئچ کو آف کرنے کے لیے پھیل گئیں۔

بازو میرے سینے سے لگا ہوا تھا اور میں واپس آ کر اندھیرے میں لیٹ گیا تھا۔ میں خاموشی سے لیٹا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ وہ سو جائے۔ شاید اندھیرے کی بے اطمینانی یا ڈر کی وجہ سے، ہاتھ کھلی حالت میں، میرے پہلو میں پڑا تھا اور اس وقت پانچوں انگلیاں میرے سینے پر چڑھ رہی تھیں۔ کہنی از خود خم ہوئی اور وہ مجھ سے ہم آغوش ہو گئی۔

لڑکی کی کلائی پر نبض ایک نازک سے انداز میں چل رہی تھی۔ یہ میرے دل پر پڑا رہا، اور یوں دو نبضیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ اس کی نبض میری نبض سے کچھ آہستہ چل رہی تھی، پھر یہ دونوں

اکٹھی ہوگئیں۔اور تب مجھے صرف اپنی ہی کا احساس ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کون سی آہستہ تھی اور کون سی تیز تھی۔

شاید اس نبض اور دل کی دھڑکن کی پہچان مختصر عرصے کے لیے ایک ہوگئی تھی جب کہ میں اپنے بازو کو، اس کے بازو سے تبدیل کر سکتا تھا۔یا شاید وہ سو گیا تھا۔ایک بار میں نے ایک عورت کو کہتے سنا تھا کہ عورتیں سرمستی کے درد میں کم خوش ہوتی ہیں، بہ نسبت اپنے مردوں کے پہلو میں سکون کی نیند لینے کے۔لیکن میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو اپنے ساتھ، اتنے سکون سے سویا ہوا نہیں پایا تھا؛ جیسے کہ یہ بازو اس وقت سو رہا تھا۔

میں اس کے اوپر موجود نبض کی رفتار کی وجہ سے اپنے دل کی دھڑکن کے بارے میں آگاہ تھا۔ایک دھڑکن اور اگلی دھڑکن کے درمیان فاصلے پر بھی کچھ چل رہا تھا اور پھر واپس بھی ہو رہا تھا۔جب میں یہ دھڑکن سن رہا تھا تو فاصلہ بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔تاہم جو دور چلا گیا تھا وہ لامتناہی فاصلے پر کسی منزل کو نہیں پا رہا تھا۔اگلی دھڑکن نے اسے واپس بلا لیا۔مجھے ڈر لگنا چاہیے تھا لیکن میں نہ ڈرا۔تب میں نے تکیے کے قریب موجود سوئچ کو ٹٹولا۔

اسے آن کرنے سے پہلے میں نے خاموشی سے کمبل کو تہہ کر دیا۔جو کچھ ہو رہا تھا، بازو اس سے بے خبر، سو رہا تھا۔ایک مدھم سی سفیدی کی نرم سی ٹکڑی نے میرے ننگے سینے کو زغے میں لے رکھا تھا جیسے کہ وہ خود میرے اندر سے برآمد ہو رہی ہو اور یہ صبح کے وقت کے چھوٹے سے سورج کی طرح چمک رہی تھی۔

میں نے لائٹ جلائی، اپنا ہاتھ انگلیوں اور کندھے پر رکھا، اور بازو کو سیدھی طرف کھینچا۔میں نے روشنی اور سائے کے کھیل پر غور کرتے ہوئے، اسے خاموشی سے، اپنے ہاتھوں میں موڑا۔کلائی کی تنگی اور پھیلاؤ سے، اوپر کندھے کی گولائی تک، کہنی کی ہلکی سی گولائی پر، دوبارہ سے تنگی تک، کہنی کی اندرونی طرف ہلکی سی پستی تک، کلائی کی طرف تنگ ہوتی ہوئی گولائی تک ہتھیلی اور پشت کی طرف اور انگلیوں تک۔

''میں اسے اپناؤں گا۔'' میں لفظوں کی بڑبڑاہٹ سے آگاہ نہیں تھا۔بے خودی کے عالم میں، میں نے اپنا دایاں بازو علاحدہ کیا اور اسے لڑکی کے بازو کے ساتھ تبدیل کر لیا۔ایک ہلکا سا سانس لیا گیا۔یہ بازو کا سانس تھا یا میرا، میں بتا نہیں سکتا۔میرے کندھے کا سکڑاؤ بھی موجود تھا اور میں اس تبدیلی

سے آگاہ تھا۔لڑکی کا بازو، جو کہ اب میرا تھا،کانپ رہا تھااور اسے ہوا کی طلب تھی ۔اسے جھکاتے ہوئے ، میں اسے،اپنے منہ کے قریب لایا۔

''کیا یہ تکلیف دیتا ہے۔کیا تمھیں تکلیف پہنچی؟''

''نہیں ۔بالکل نہیں،بالکل نہیں۔''الفاظ مکمل تھے۔

آسمانی بجلی کی طرح،ایک جھرجھری میرے اندر ابھری۔میں انگلیاں اپنے منہ میں لے گیا۔ میں نے کسی قدر اپنی خوشی کا اظہار کیا لیکن لڑکی کی انگلیاں میری زبان پر تھیں اور جو کچھ میں نے کہا تھا، وہ لفظوں میں نہ ڈھل سکا تھا۔

''پلیز،سب ٹھیک ہے۔''بازو نے جواب دیا۔کپکپی ختم ہو گئی۔

''مجھے کہا گیا تھا کہ تم کر سکتے ہو اور اب ـ ـ ـ ـ ـ''

میں نے کسی چیز کو بھانپ لیا۔میں لڑکی کی انگلیوں کو اپنے منہ میں محسوس کر سکتا تھا لیکن اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں، جو اب اس کے اپنے ہاتھ کی تھیں،میرے ہونٹوں اور دانتوں کو محسوس نہ کر پائیں۔میں نے اپنے دائیں بازو کو جھٹکا اور میں اس جھٹکے کا احساس نہ کر سکا۔بازو اور کندھے کے درمیان ایک سٹاپ تھا، ریک تھی۔

''خون نہیں چل رہا۔''میں پھٹ پڑا:''یہ چل رہا ہے یا نہیں؟''

میں پہلی دفعہ خوفزدہ ہوا تھا لہٰذا بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔میرا اپنا بازو میرے قریب گرا پڑا تھا۔مجھ سے الگ، یہ ایک نظر نہ آنے والی چیز تھی۔لیکن زیادہ اہم یہ تھا کہ کیا نبض تو نہیں رکی تھی؟لڑکی کا بازو گرم تھااور اس کی نبض چل رہی تھی اور میرا، جو اپنا تھا، وہ ٹھنڈا اور سخت ہوا جا رہا تھا۔لڑکی کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے دائیں بازو کو بھی پکڑ لیا۔میں نے اسے پکڑ تو لیا لیکن وہاں کوئی محسوسات نہیں تھے۔

''کیا ادھر نبض ہے؟میں نے بازو سے پوچھا:''کیا یہ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔؟''

''تھوڑی سی۔تھوڑی سی مجھ سے زیادہ ٹھنڈی ہے۔میں بہت زیادہ گرم کو بھلا بیٹھا تھا۔''

زیروبم میں کچھ خاص سا عورت پن تھا۔اب جب کہ میرا بازو میرے کندھے کے ساتھ بندھ گیا تھا،اور یہ میرا بن گیا تھا،یہ عورت کی طرح کا تھا، جو پہلے ایسا نہیں تھا۔

''نبض نہیں رکی ہے۔''

''تمھیں زیادہ پر اعتماد ہونا چاہیے۔''

''کس چیز کے بارے میں؟''

تم نے میرے ساتھ اپنا بازو بدلا، کیا تم نے ایسا نہیں کیا؟''

''کیا خون چل رہا ہے؟''

Woman whom seekest thou? you know the passage?

Woman why weepest thou? Whom seekest thou?

''اکثر اوقات جب میں خواب دیکھتا ہوں تو رات کو بیدار ہونے پر میں خود سے سرگوشی کرتا ہوں۔''اس بار بے شک یہ''میں''میرے کندھے سے لگے دلکش بازو کے مالک کا ہوگا۔

انجیل کے یہ الفاظ ایسے تھے، جو کسی ازلی آواز میں کسی ازلی جگہ سے کہے گئے تھے۔

''کیا اس کی نیند خراب ہوگی؟''میں نے بھی لڑکی کی طرح کہہ دیا۔کیا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوگی۔یہ دھند ہے، جس میں ڈراؤنے خوابوں کے غول آوارہ گردی کرتے ہیں۔لیکن نمی شیاطین کو بھی کھانسنے پر مجبور کرے گی۔

ان کو سننے سے پرے رکھنے کے لیےلڑکی کے بازو نے، جس کے پاس ابھی تک میرا ہاتھ تھا، میرے دائیں کان کو ڈھانپ رکھا تھا۔

یہ اب میرا نیا دایاں بازو تھا لیکن اس کی حرکت اب میری مرضی کی پابند نہیں تھی بلکہ یہ اس کی اپنی تھی،اس کے اپنے ہی دل کی لگتی تھی۔بہرحال یہ علاحدگی کسی طرح بھی مکمل نہیں تھی۔

''نبض،نبض کی آواز۔''

میرے پاس میرے اپنے داہنے بازو کی نبض تھی۔لڑکی کا بازو، جس کے ہاتھ میں میرا اپنا بازو تھا،میرے کان تک آیا اور میری اپنی کلائی میرے کان پر تھی۔بازو کیوں گرم تھا۔جیسا کہ لڑکی کے بازو نے کہا تھا،صرف اس کی انگلیوں اور میرے کانوں سے محسوساتی طور پر زیادہ ٹھنڈا تھا۔

''میں بدروحوں کو دور رکھوں گا۔''لڑکی کی چھوٹی انگلی کے لمبے ناخن نے شریفانہ شوخی سے میرے کان میں ہلچل مچائی۔میں نے اپنے سر کو جھٹکا۔میرے بائیں ہاتھ نے، جو شروع سے میرا تھا، میری دائیں کلائی پکڑی جو درحقیقت اس لڑکی کی تھی۔جیسے ہی میں نے اپنا سر پیچھے کھینچا، میں نے لڑکی کی چھوٹی انگلی کو دیکھا۔اس کے ہاتھ کی چار انگلیوں نے بازو کو پکڑ رکھا تھا۔میں نے اسے اپنے دائیں کندھے سے لیا تھا۔چھوٹی انگلی (کیا ہمیں کہنا چاہیے کہ اس اکیلی کو آزادانہ طور پر کھیلنے کی اجازت دی گئی

تھی؟) اکیلی ہاتھ کی پشت کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ناخن کی نوک نے ہلکے سے میرے دائیں بازو کو چھوا۔انگلی کسی لڑکی کے نازک ہاتھ جیسی ممکنہ پوزیشن میں جھکی ہوئی تھی،سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک نازک لڑکی کا نرم ہاتھ،میرے جیسے شخص کے سخت ہوئے جوڑ جیسا ہو۔اپنی بنیاد سے یہ صحیح زاویوں میں اٹھا ہوا تھا۔پہلے جوڑ پر،ایک دوسرے زاویے پر،جھکا ہوا تھا اور اس سے اگلے پر،پھر ایک اور زاویے پر۔پھر اس نے ایک مربع شکل بنائی:یعنی چوتھی سمت،جو انگوٹھی والی انگلی نے بنائی تھی،اس نے میری آنکھ کی سطح تک،ایک تکونی کھڑکی بنائی۔یا پھر یہ نسبتاً ایک جھانکنے والا روزن تھا،یا یہ ایک آنکھ کا عدسہ تھا جو کہ ایک لڑکی کے لیے بہت چھوٹا تھا،جسے کہ میں نے کھڑکی جیسا سمجھ لیا تھا۔اس طرح کی کھڑکی،جس سے کہ ایک بنفشے کا پودا ہی باہر جھانک سکتا تھا۔چھوٹی انگلی (آنکھ کے عدسے کے حاشیے والی انگلی) کی کھڑکی اتنی سفید تھی کہ وہ ایک ہلکی سی روشنی دے رہی تھی۔میں اسے اپنی آنکھ کے قریب لایا۔میں نے دوسری آنکھ کو بند کر لیا۔

''ایک متحرک تصویروں کا تماشا،''بازو نے کہا:''اور تم کیا دیکھ رہے ہو؟''

''میرا نیم گرم تاریک کمرہ۔اس کی پانچ لائٹس۔''اپنا فقرہ مکمل کرنے سے پہلے میں چیخ رہا تھا:''نہیں،نہیں۔''

''میں اسے دیکھ رہا ہوں۔''

''اور تم کیا دیکھ رہے ہو؟''

''یہ غائب ہو گیا ہے۔''

''اور تم نے کیا دیکھنا تھا؟''

''ایک رنگ۔ایک پھیلتا ہوا ارغوانی رنگ،اور اس کے اندر چھوٹے دائرے،سرخ اور سونے کے منکے تھے جو کہ گھومے جا رہے تھے،گھومے جا رہے تھے۔

''تم تھک گئے ہو۔''لڑکی کے بازو نے میرا دایاں بازو نیچے رکھ دیا اور اس کی انگلیوں نے نرمی سے میرے پپوٹوں کو تھپکا۔

''کیا سرخ اور سونے کے منکے ایک بہت بڑے دندانے دار پہیے کے گرد گھوم رہے تھے۔کیا میں نے دندانے دار پہیے میں کچھ دیکھا تھا؟ جو کہ آ اور جا رہا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے اصل میں وہاں کچھ دیکھا تھا یا مجھے ایسا لگا تھا۔ایک تیزی سے

گزرتا ہوا،سراب جو کہ یادداشت میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں یاد نہ کرسکا کہ وہ کیا ہوسکتا تھا۔

''کیا یہ ایک سراب تھا جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے؟''

''نہیں، میں اسے مٹانے کے لیے آیا تھا۔''

''گزرے دنوں کے بارے میں،خواہشات اور تمنی کے بارے میں۔''

میرے پپوٹوں پرلڑکی کی انگلیوں کی حرکت رک گئی۔

میں نے ایک غیر متوقع سوال کیا:''جب تم اپنے بالوں کو کھلا چھوڑتی ہو تو کیا یہ کندھوں کو ڈھانپ لیتے ہیں؟''

ایسا ہوتا ہے۔میں انھیں گرم پانی سے دھوتی ہوں (ہوسکتا ہے یہ میری کوئی چالاکی ہو) میں ان کے اوپر ٹھنڈا پانی ڈالتی ہوں۔میں اپنے کندھوں،بازوؤں اور چھاتیوں پر بھی ٹھنڈے بالوں کے احساس کو پسند کرتی ہوں۔

یہ اب دوبارہ ایک لڑکی جیسی ہوگی۔اس کی چھاتیوں کو ابھی تک کسی مرد نے نہیں چھوا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی چھاتیوں پر گیلے بالوں کی ٹھنڈک کے احساس کو بیان کرنے میں وہ مشکل محسوس کررہی ہوگی۔جسم سے علاحدہ ہونے والا بازو کیا حیا اور حجاب سے بھی جدا ہو چکا ہوگا؟

میں نے چپکے سے کندھے کی نرم گولائی کو اپنے بائیں ہاتھ میں لیا، جواب میرا اپنا تھا۔مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ میں موجود،اس کی گولائی ابھی اس کی چھاتیوں سے زیادہ بڑی نہیں۔اس کے کندھے کی گولائی،اس کی چھاتیوں کی نرم گولائی کی طرح تھی۔

اس کا ہاتھ نرمی سے میرے پپوٹوں پر ٹکا رہا۔ہاتھ اور انگلیاں نرمی سے چمٹی اور دھنسی ہوئی تھیں اور پپوٹوں کے اندر گرمائش کا اثر ہورہا تھا۔یہ گرمائش میری آنکھوں میں اتر آئی۔

''اب خون رواں ہے۔''میں نے آہستہ سے کہا:''یہ رواں ہے۔''

یہ حیرانی والی چیخ نہیں تھی، جب مجھے احساس ہوا کہ میرا بازو،اس کے بازو میں تبدیل ہوگیا ہے تو جو چیخ میرے منہ سے نکلی تھی، وہ حیرانی والی نہیں تھی،میرے کندھے یا لڑکی کے بازو میں کوئی اینٹھن یا تھرتھری نہیں تھی۔بازو میں میرا خون اور اس کا خون،کب چلنا شروع ہوا؟ کندھے کا ٹوٹنا ہونا،کب ختم ہوا؟ عین اس لمحے لڑکی کا صاف خون مجھ میں رواں تھا،لیکن کیا جب یہ بازو لڑکی کی طرف لوٹے گا تو کیا یہ ناخوش گوار احساس نہ ہوگا یعنی گندا مردانہ خون اس میں رواں ہوگا؟ جب یہ اس لڑکی کے

کندھے سے نہیں جڑے گا تو تب کیا ہوگا؟

''کیا یہ دھوکا نہیں ہوگا۔''میں بڑبڑایا۔

''سب کچھ ٹھیک رہے گا۔''بازو نے سرگوشی کی۔

یہ کوئی ڈرامائی آگاہی نہیں تھی کہ میرے کندھے اور بازو کے درمیان خون آجا رہا تھا۔میرا بایاں ہاتھ، میرے دائیں کندھے سے بغل گیر ہو رہا تھا اور میرے کندھے نے جو کہ اب خود میرا اپنا تھا حقیقت سے فطری سمجھوتہ کر لیا تھا۔انھوں نے اس چیز کو سمجھ لیا تھا۔اس علم نے انھیں غنودگی میں مبتلا کر دیا۔

میں ایک بڑی لہر پر تیرنے لگا۔یہ گھیرنے والی دھند تھی، جو ہلکے ارغوانی رنگ میں تبدیل ہوگئی تھی اور جہاں میں اکیلا، اس بڑی لہر پر تیر رہا تھا، وہاں کی لہریں سبز پیلی تھیں۔میرے کمرے کی گیلی تنہائی ختم ہو چکی تھی۔میرا بایاں ہاتھ لڑکی کے دائیں بازو پر آہستہ سے پڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ایسے لگتا تھا، جیسے اس کی انگلیوں نے میکولیا کے زرد، ریشے کو پکڑ رکھا ہو۔میں انھیں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میں انھیں سونگھ سکتا تھا۔

☆☆☆☆

یوکیو مشی ما

حب الوطنی

28فروری 1936 کو(اتفاق سے 26فروری کے تیسرے دن)کونوٹرانسپورٹ بٹالین کے لیفٹیننٹ شنجی تیکیاما نے ،اس اطلاع سے بہت زیادہ پریشان ہو کر کہ اس کے بہت سے قریبی ساتھی جو آغاز میں باغیوں کے ساتھ تھے اور شاہی فوجوں کی ناگزیر پیش اندازی پر بہت طیش میں تھے' شاہی فوجوں پر حملہ آور ہو گئے تھے،اپنی افسروں والی تلوار سے یتسویاوارڈ میں آؤباشو کے بلاک چھ میں واقع، اپنی پرائیویٹ رہائش گاہ کے آٹھ چٹائیوں والے کمرے میں،اپنے پیٹ کی آنتیں نکال دیں۔اس کی بیوی ریکو نے اس کی تقلید میں خود کو خنجر مار کر ہلاک کر لیا۔لیفٹیننٹ کی آخری تحریر صرف ایک جملے پر مشتمل تھی ''شاہی فوجوں کی عمر دراز ہو۔''اس کی بیوی نے اپنے مرحوم والدین سے اپنی ناخلفی کی معافی مانگتے ہوئے اختتامی کلمہ کہا:''وہ دن جسے ایک سپاہی کی بیوی کی زندگی میں آنا تھا، آ گیا ہے۔''ایسی دلیرانہ نذر پیش کرنے والے جوڑے کے آخری لمحات ایسے تھے کہ جنھوں نے خود دیوتاؤں کو بھی رلا دیا تھا۔ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ لیفٹیننٹ کی عمر اکتیس سال اور اس کی بیوی کی عمر تئیس سال تھی اور ایسا ان کی شادی کی تقریب کے صرف ایک سال بعد ہوا تھا۔

وہ جنھوں نے ، یادگاری تصویر میں دولہا اور دلہن کو دیکھا تھا(شاید ان سے کسی طرح بھی کم نہیں جنھوں نے بذات خود لیفٹیننٹ کی شادی میں شرکت کی تھی)انھوں نے اس خوب صورت جوڑے کی نسبت کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا تھا۔لیفٹیننٹ اپنی فوجی یونی فارم میں اپنی دلہن کے ساتھ اس کے محافظ کے طور پر کھڑا تھا اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی تلوار پر رکھا ہوا تھا اور سرکاری کیپ کو،اس نے بائیں طرف پکڑا ہوا تھا۔اس کے ظاہر میں سنجیدگی تھی اور اس کی کالی بھنویں اور گھورتی ہوئی آنکھیں ،اس کی نو جوانی کی راست بازی کی غماز تھیں۔سفید پوشاک پہنے ہوئے دلہن کی خوب صورتی کا کوئی موازنہ کسی سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اس کی آنکھیں،نرم بھنوؤں کے نیچے کی گولائی،اس کی باریک عمدہ شباہت والی ناک،اور اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر شہوانیت اور لطافت ایک ساتھ موجود تھی۔جو ہاتھ لبادے سے باہر

تھااس میں،اس نے ایک پنکھا پکڑا ہوا تھااور اس کی انگلیوں کے سرے چاند مکھی کی کلی کی طرز کا ایک نازک گچھا لگ رہے تھے۔

خودکشی کے بعد لوگ اس تصویر کو سامنے رکھ کر تجزیہ کرتے تو اس چیز کی عکاسی ہوتی کہ اس بے عیب ملاپ میں زیادہ تر ایک بددعا کا اثر دکھائی دیتا ہے۔شاید یہ ایک عمومی تاثر ہی تھا لیکن اس حادثے کے بعد ،اس تصویر کو دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کہ دونوجوان لوگ سونے جیسی پالش والی سکرین پر ایک دوسرے کونہایت واضح انداز میں،اس موت کے حوالے سے ، جوانھیں پیش آنے والی تھی، دیکھ رہے تھے۔لیفٹیننٹ جنرل اوزکی کا بھلا ہو کہ اس کی وساطت سے وہ تیسویا میں آؤباشو کے مقام پر،ایک نیا گھر بنانے کے قابل ہوگئے تھے۔اسے نیا گھر کہنا شاید مناسب نہ ہوگا۔یہ کرائے کا تین کمروں پر مشتمل گھر تھا،جس کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔جب کہ نہ تو چھ چٹایوں اور نہ ہی ساڑھے چار چٹایوں والے(لمبائی چوڑائی) نچلی منزل کے کمرے میں سورج کی روشنی آتی تھی اس لیے وہ اوپر والی منزل کے آٹھ چٹایوں والے کمرے کو باتھ روم اور مہمانوں کے کمرے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ان کے پاس کوئی نوکرانی نہیں تھی،اس لیے ریکو کواپنے شوہر کی غیر حاضری میں،خودہی گھر کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔

وہ اس بنیاد پر ہنی مون ٹرپ پرنہیں گئے تھے کہ یہ فوجی سطح پر ایمرجنسی کے دن تھے۔ان دونوں نے اپنی شادی کی پہلی رات اسی گھر میں بسر کی تھی۔بستر پر جانے سے پہلے،شنجی نے اپنی تلوار اپنے سامنے رکھتے ہوئے،فرش پر سیدھا بیٹھ کر اپنی بیوی کوایک سپاہی والا لیکچر دیا تھا۔ایک عورت، جوایک سپاہی کی بیوی بن گئی ہو،اسے سمجھنا چاہیے اور اسے ثابت قدمی سے قبول کر لینا چاہیے کہ اس کے شوہر کی موت کسی وقت بھی واقع ہوسکتی ہے۔یہ کل آسکتی ہے۔یہ اس سے اگلے دن آسکتی ہے۔یہاں یہ سوال پیدانہیں ہوتا کہ یہ کب آئے گی۔اس نے پوچھا کہ کیا وہ مستقل مزاجی کے ساتھ ثابت قدم رہے گی؟ ریکواٹھ کھڑی ہوئی اس نے الماری کا ایک دراز کھولا اور اس نے اسے نکالا، جواس کی ملکیت میں آنے والی ساری چیزوں سے زیادہ قیمتی تھا؛یعنی اس کی ماں کا دیا ہوا خنجر۔اپنی جگہ پر واپس جاتے ہوئے،اس نے کوئی لفظ کہے بغیر خنجر کو چٹائی پر یوں رکھ دیا؛ جیسے اس کے شوہر نے اپنی تلوار کو رکھا تھا۔فوری طور پر ایک خاموش رضامندی ظاہر ہوگئی اور لیفٹیننٹ نے دوبارہ کبھی اپنی بیوی کی ثابت قدمی کا امتحان نہیں لیا۔

شادی کے پہلے چند مہینوں میں ریکو کی خوب صورتی دن بدن بارش کے بعد چاند کی طرح

زیادہ خاموش، چمکدار اور روشن انداز سے بڑھی۔ چوں کہ دونوں کے جسم جوان اور قوی تھے اس لیے ان کے تعلقات میں جوش تھا۔ یہ محض رات کا مسئلہ نہیں تھا۔ ایک سے زیادہ مواقع پر، جنگی مشقوں سے واپسی پر براہ راست، دل نہ کر رہا ہو تو پھر بھی اتنے وقت میں، جتنے میں کیچڑ کے چھینٹوں سے گندی ہوئی یونی فارم کو اتارا جائے، لیفٹیننٹ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی بیوی کو فرش پر دھکیل دیتا۔ ریکو بھی جواباً بالکل اسی طرح پر جوش تھی۔ ایک مہینے سے کچھ کم یا زیادہ وقت میں ریکو اپنی شادی کی پہلی رات کے بعد سے خوشی کو سمجھتی تھی اور لیفٹیننٹ بھی یہ سب محسوس کر کے بہت خوش تھا۔

ریکو کا جسم سفید اور بے داغ تھا، اس کی خوب بھری بھری چھاتیاں، اپنے اندر ایک مستحکم حیا والا انکار لیے ہوئے تھیں لیکن اپنی مرضی پر جوش کو دعوت دیتے ہوئے یہ چھاتیاں اپنے محرم دل کے لیے بہت فراخ دل ثابت ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ بستر میں دونوں جھجک اور رعب کے ساتھ نہایت سنجیدہ ہوتے تھے۔ اپنے وحشی اور خمار آلودہ جذبات کے عین درمیان وہ سنجیدہ اور متین رہتے تھے۔ دن کے اختتام تک تربیت کے وقفوں کے درمیان مختصر عرصے کے لیے آرام کرتے ہوئے لیفٹیننٹ اپنی بیوی کے متعلق سوچتا رہتا تھا اور سارا دن گھر پر ریکو اپنے شوہر کے تصورات میں کھوئی رہتی۔ تاہم جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے تو وہ اپنی خوشی کی اور زیادہ تصدیق کرتے ہوئے اپنی شادی والی تصویر کو دیکھا کرتے تھے۔ ریکو کو اس بات پر ذرہ برابر بھی حیرانی نہیں تھی کہ ایک شخص جو صرف چند ماہ پہلے تک اس کے لیے مکمل طور پر ایک اجنبی تھا وہ اب ایک ایسا سورج تھا، جس کے گرد اس کی ساری دنیا گھوم رہی تھی۔

ان ساری باتوں کا ایک اخلاقی جواز تھا' ان کو تعلیم دیے گئے سرکاری حکم نامے کے مطابق میاں اور بیوی کو ہم آہنگ ہونا چاہیے تھا۔ ایک بار بھی ریکو نے اپنے خاوند سے اختلاف نہیں کیا اور نہ ہی لیفٹیننٹ نے کبھی اپنی بیوی کو گالی دینا مناسب سمجھا۔ سیڑھیوں کے نیچے خدا کی عبادت والی جگہ پر، عظیم آئسے کے مزار سے حاصل کی گئی لوح کے جلو میں، ان کے شاہی فرماں رواؤں کی تصاویر رکھی گئی تھیں اور ڈیوٹی پر جانے سے پہلے ہر صبح لیفٹیننٹ حسبِ معمول اپنی بیوی کے ساتھ اس مقدس جگہ پر کھڑا ہوتا اور اکٹھے ان کے سر نیچے جھک جاتے تھے۔ نذر والا پانی ہر صبح کو تازہ کیا جاتا اور ساساکی کی مقدس شاخ ہمیشہ سبز اور تازہ ہوتی تھی۔ ان کی زندگیاں مقدس دیوتاؤں کی طلسمی حفاظت میں تھیں اور از حد خوشی سے معمور تھیں جو ان کے جسموں کے ہر ریشے کو تھرتھرائے رکھتی تھیں۔

اگرچہ لارڈ پر ہیوی سیل سیٹو کا گھر ان کی ہمسائیگی میں تھا لیکن 26 فروری کی صبح کو کسی نے بھی

گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔ برف باری والی صبح کے وقت، فوجی ملاحظے کی بگل بجنے کی ہلکی سی آواز تھی تب یہ دس منٹ پر محیط ٹریجڈی پہلے ہی اختتام پذیر ہو چکی تھی، جس نے کہ لیفٹیننٹ کی نیند میں پہلے ہی خلل ڈال دیا تھا۔ فوراً اپنے بستر سے باہر ہوتے ہوئے اور کچھ کہے بغیر لیفٹیننٹ نے اپنی یونی فارم، جو اس کی بیوی نے پہلے ہی تیار کر رکھی تھی، پہن کر، اپنے پہلو میں تلوار لٹکائی اور اس صبح کو جب کہ ابھی اندھیرا ہی تھا، برف سے ڈھکے راستوں پر تیزی سے گامزن ہو گیا۔ وہ اٹھائیس کی شام تک واپس نہ آیا۔

بعد میں ریڈیو کی خبروں کے ذریعے ریکو کو، اس اچانک ابھر آنے والے تشدد کی تمام تفاصیل سے آگاہی ہوئی تھی۔ اپنی زندگی کے ان بعد کے دو مکمل دنوں کے دوران میں، وہ مکمل آسودگی کے ساتھ اپنے بند دروازوں کے پیچھے موجود رہی تھی۔

اس برف باری والی صبح کو، جب وہ خاموشی کے ساتھ تیزی سے باہر نکل رہا تھا تو ریکو نے لیفٹیننٹ کے چہرے پر مر جانے کے ارادے کو پڑھ لیا تھا۔ اگر اس کا خاوند واپس نہ آیا تو اس کا اپنا فیصلہ یہی تھا کہ وہ بھی موت کو گلے لگا لے گی۔ اس نے خاموشی سے اپنی ذاتی اشیا کو خود سے علاحدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے گھر سے باہر پہنے جانے والے کمونو کے سیٹ یادگار کے طور پر، اپنے سکول کے دنوں کے دوستوں کے لیے چن لیے۔ اس نے ان سخت کاغذی لفافوں پر جن میں وہ ایک ایک کر کے رکھے گئے تھے اپنا نام اور پتہ لکھ دیا۔ اس کے شوہر نے، اسے ہر لمحے یہ سمجھایا تھا کہ کل کے بارے میں مت سوچو، ریکو نے کوئی ڈائری تک اپنے پاس نہیں رکھی تھی اور اب وہ پچھلے چند ماہ کی خوشی کے حامل ریکارڈ کو مستقل مزاجی سے دوبارہ پڑھنے سے محروم تھی اور اس نے اس سلسلے میں اس کے ہر صفحے کو آگ کے سپرد کر دیا تھا۔ ریڈیو کے اوپر ایک چھوٹا سا چائنی کتا، ایک خرگوش، ایک گلہری، ایک بھالو اور ایک لومڑی قطار میں رکھے گئے تھے۔ وہاں ایک چھوٹا گلدان اور ایک پانی والا گھڑا بھی تھا۔ یہ ریکو کی ایک اور واحد کولیکشن تھی۔ لیکن وہ ان ساری چیزوں کو بہ مشکل ہی یادگار کے طور پر تصور کر سکتی تھی۔ اور نہ ہی بعد میں یہ مناسب ہوگا کہ ان کو خاص طور پر تابوت میں رکھا جائے۔ ریکو کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایسے خیالات اس کے ذہن میں یوں ابھر رہے ہیں، جیسے ان چھوٹے جانوروں کے چہروں سے، یہ تاثرات غائب اور فراموش کر دیے گئے ہوں۔

ریکو نے گلہری کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی طرف دیکھا۔ اور تب اس کے خیالات بچوں کے سامان سے بہت پرے موجود، ایک سلطنت کی طرف مڑ گئے، اس نے ایک عظیم سورج جیسے اصول

کے تحت دوری میں جھانکا؛ جسے اس کے شوہر نے مجسم کردیا تھا۔ وہ تیار تھی اور خوش تھی اور اس چمک دار رتھ میں اپنی تباہی کے سنگ پھینکی گئی تھی، لیکن اب تنہائی کے ان چند لمحات میں، اس نے خود کو معمولی چیزوں کے ساتھ معصوم تعلق کے حوالے سے جشن پر آمادہ ہونے دیا۔ وہ وقت جب وہ ان اشیا سے بجا طور پر محبت کرتی تھی، ایک قصہ پارینہ تھا۔ اب وہ محض ان سے محبت کرنے کی یاد سے محبت کرتی تھی اور اس کے دل میں ان کی جگہ ایک زیادہ جنونی خوشی کے ساتھ، ایک بہت زیادہ جذبے کے ساتھ بھر گئی تھی۔ ریکو نے حتیٰ کہ اپنے لیے صرف جسمانی خوشی جیسے غم انگیز لطف کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ فروری کی ٹھنڈ اور چینی کی بنی ہوئی گلہری نے ریکو کی پتلی انگلیوں کو سن کر دیا تھا مگر اس کے اعضائے اسفل میں نمونے کی دہرائی کے اسلوب کے نیچے جو کہ بنے ٹھنے انداز کے بہترین کمونو کے کنارے سے ترچھی ہو کر گزر رہی تھی۔ اب وہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے لیفٹیننٹ کے طاقتور بازوؤں کا خیال کر کے اس کے گرم نم آلود جسم کو محسوس کر سکتی تھی جو اسے برفوں کی سردی سے بچا سکتا تھا۔

وہ اپنے ذہن میں منڈلاتی موت کے تصور سے بہت کم ہی خوف زدہ تھی۔ ریکو کو پورا یقین تھا کہ ہر چیز، جو اس کا شوہر محسوس کر رہا تھا، یا سوچ رہا تھا؛ یعنی اس کی تکلیف اور دکھ، یقینی طور پر اس کے جسم کی طاقت ہی کی طرح، اسے اس کی موت کو خوش آمدید کہنے کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا جسم آرام سے پگھل جائے گا اور اس کے شوہر کے نہایت معمولی سے خیال میں تبدیل ہو جائے گا۔

ریڈیو پر مختلف قسم کے اعلانات سنتے ہوئے، اس نے اپنے شوہر کے بہت سے ہم کاروں کے نام باغیوں کے طور پر سنے۔ یہ موت کی خبر تھی۔ وہ حیرانی اور پریشانی کے ساتھ ان ساری سرگرمیوں کا بہت غور سے جائزہ لے رہی تھی کیوں کہ حالات روز بروز ناقابل تردید ہو رہے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ کیوں ایک شاہی فرمان جاری نہیں کیا گیا اور کیوں پہلے ہی سے، اس چیز کو نہیں دیکھا گیا اور بغاوت کے غیر معروف نام کی چھاپ کے ساتھ، جب آہستہ آہستہ ملکی وقار کو داؤ پر لگایا جا رہا تھا تو اس کی بحالی کے لیے بروقت اقدامات کیوں نہیں کیے گئے۔ رجمنٹ کی طرف سے کوئی پیغام رسانی نہیں ہو رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شہر کی ان گلیوں میں جہاں ابھی برف کی باقیات موجود تھیں لڑائی چھڑ سکتی تھی۔

28 فروری کا سورج غروب ہوتے ہی، ریکو سامنے والے دروازے پر ایک درشت آواز سن

کر پریشان ہوگئی۔وہ سیڑھیوں سے نیچے اتری اوراس نے لرزتی انگلیوں کے ساتھ چٹخنی کھولی۔ برف سے آلودہ کواڑ کے تختے کی مدھم سی شکل والے خاکے کے پار کوئی آواز نہیں تھی، لیکن وہ جانتی تھی یہ اس کا شوہر تھا۔ریکو کو نہیں معلوم تھا کہ سلائیڈنگ ڈور کی چٹخنی اتنی سخت ہوگی۔رکاوٹ اور بڑھ گئی تھی۔دروازہ نہیں کھلا۔

ایک لمحے میں،اس سے پہلے کہ وہ جان لیتی، وہ کامیاب ہوگئی۔پورچ کے اندر سیمنٹ کے فرش پر ایک خاکی رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہوئے اس کے سامنے لیفٹیننٹ کھڑا تھا اوراس کے لمبے بوٹ گلی کے کیچڑ سے بھاری ہورہے تھے۔اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے،اس نے دوبارہ کنڈی لگادی۔ اس کی کیا اہمیت تھی، ریکو نہ سمجھ سکی۔

''خوش آمدید۔''

اگرچہ لیفٹیننٹ گومگو کی حالت میں تھا،لیکن پہلے ہی سے،اس کے ذہن میں پس وپیش کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔تاہم ان کے درمیان خاموشی سے بہتی ندی تھی جو کہ پگھلنے والی شفاف برف کی طرح ہی شفاف تھی۔دودن کی طویل آزمائش کے بعد،وہ اپنے گھر میں بیٹھا تھا اوراپنی بیوی کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، پہلی بار لیفٹیننٹ ذہنی سکون محسوس کررہا تھا گو کہ اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن ایک بار اسے پتہ چلا تھا کہ اس کی بیوی اس کے پختہ ارادے کو، جو اس کے الفاظ کے پیچھے چھپا ہوا تھا،مقدس جانتی تھی۔

''اچھا تو اب ۔۔۔۔'' لیفٹیننٹ کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔اس کی تھکن کے باوجود،وہ طاقتور اورواضح تھیں اوراب وہ پہلی بار سیدھا اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔''آج کی رات میں اپنا پیٹ پھاڑ دوں گا۔''

ریکو نے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔

اس کی گول آنکھوں میں ایک جیسی جھنجھناہٹ اورالجھن دکھائی دیتی تھی۔

''میں تیار ہوں۔''اس نے کہا۔''میں تمھارا ساتھ دینے کی اجازت چاہتی ہوں۔''

لیفٹیننٹ نے خود کو ان آنکھوں کی طاقت سے مسحور ہوتے ہوئے پایا۔

ایک شخص جو نشے کی حالت میں ہو،اس کے کہے ہوئے کی طرح آسانی اورتیزی سے،اس کے الفاظ بہہ رہے تھے اور یہ بات سمجھ سے باہر تھی کہ کوئی ایسا معاملہ جو بہت گراں ہو اس کی اجازت

بالکل ایک عام سے انداز میں کیسے دی جاسکتی ہے۔

''تو ٹھیک ہے۔ہم دونوں اکٹھے جائیں گے۔لیکن پہلے میں اپنی خودکشی کے لیے تمھاری گواہی چاہتا ہوں۔تمھیں اتفاق ہے۔''

جب وہ یہ کہہ چکے تو اچانک ایک بے اندازہ خوشی ان دونوں کے دلوں میں بھر گئی۔

اس کی ذات میں اعتماد کرنے پر، ریکو اپنے شوہر کی عظمت سے بے حد متاثر ہوئی۔کچھ بھی ہو جائے لیفٹیننٹ کے لیے ضروری تھا کہ اس کی موت میں کوئی بے قاعدگی نہیں ہونی چاہیے۔اسی لیے ایک گواہی کی ضرورت تھی۔اس نے اس کام کے لیے اپنی بیوی کا چناؤ کیا تھا یہ اس کے اعتماد کا پہلا اظہار تھا۔اور دوسرا اظہار جو کہ اور بھی عظیم تھا، وہ یہ تھا کہ اگرچہ اس نے اکٹھے مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی خود کو پہلے نہ مارے۔وہ اس کی موت کو، اس وقت تک کے لیے التوا میں رکھنا چاہتا تھا جب تک کہ وہ خود اس کی تصدیق کرنے کے لیے موجود نہ ہو۔اگر وہ ایک شکی مزاج شوہر ہوتا تو اس نے عام خودکشی کے معاہدے کے تحت اپنی بیوی کو پہلے مارنے کے لیے چنا ہوتا۔

جب ریکو نے کہا: ''میں تمھارا ساتھ دینے کے لیے اجازت چاہتی ہوں'' تو لیفٹیننٹ نے محسوس کیا کہ یہ اس تعلیم کا حتمی ثمر تھا، جو اس نے اپنی شادی کی پہلی رات سے ہی اپنی بیوی کو دی تھی اور جب وہ لمحہ آیا تو اس کی وجہ سے، اس کی یہ تعلیم ہوئی کہ وہ کسی جھجک کے شائبے کے بغیر یہ کہہ سکے۔اس بات نے، لیفٹیننٹ کو اپنی ذات پر انحصار کرنے والے شخص کے طور پر، اس کی رائے کو تقویت دی تھی۔وہ اتنا رومانی اور خود بیں شخص نہیں تھا کہ وہ تصور کرے کہ اس کی طرف سے فوری طور پر ادا کیے جانے والے الفاظ اس کے شوہر کے لیے محبت کا اظہار تھے۔

اپنے دلوں میں بہت زیادہ خوشی محسوس کرتے ہوئے، وہ ایک دوسرے کے لیے مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ریکو نے محسوس کیا جیسے وہ اپنی شادی والی رات کی طرف لوٹ گئی ہو۔

اس کی آنکھوں کے سامنے نہ درد تھا نہ موت تھی۔اسے محسوس ہوا جیسے وہ وسیع دوری پر ایک آزاد اور لامحدود کھلے پن کو دیکھ رہی تھی۔

''پانی گرم نہیں ہے۔کیا تم ابھی غسل کرو گے؟''

''ہاں، بالکل۔''

''اور کھانا ــــ۔''

الفاظ اس سطح پر اتنے گھریلو انداز میں کہے گئے تھے کہ لیفٹیننٹ ایک لمحے کے لیے یہ سوچنے کے قریب ہوا کہ ہر چیز ایک نظری دھوکا تھی۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں کھانا کھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

لیکن شاید تم تھوڑا سا، سا کی گرم کر سکتی ہو۔

''جیسے تمھاری مرضی۔''

ریکو اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے نہانے کے بعد پہننے والا فرن، گاؤن الماری میں سے نکالا۔ اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے شوہر کی توجہ کھلے ہوئے دراز کی طرف مبذول کی۔ لیفٹیننٹ اٹھا، الماری تک پہنچا اور اس کے اندر جھانکا۔ لفافوں کو دی گئی ترتیب پر لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کو اس نے پڑھا۔ وہاں یاد آنے والوں کے پتے تھے۔ اس دلیرانہ ارادے کے حوالے سے لیفٹیننٹ کی طرف سے کسی دکھ کا اظہار نہیں تھا۔ اس کا دل نازکی سے بھر گیا تھا۔ اس شوہر کی طرح، جس کی نوجوان بیوی فخر کے ساتھ اپنی بچوں جیسی خریداری کو دکھا رہی ہو، لیفٹیننٹ نے محبت سے مغلوب ہو کر پیار کے ساتھ اپنی بیوی کو پیچھے سے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کی گردن پر بوسہ دیا۔

ریکو نے اپنی گردن پر لیفٹیننٹ کی غیر شیو شدہ جلد کی کھردرہٹ کو محسوس کیا۔ محض اس دنیا کی چیز ہونے سے زیادہ، ریکو کے جذبات اس کے لیے خود ہی ایک دنیا کی طرح تھے لیکن، اس احساس کے ساتھ کہ اب یہ ہمیشہ کے لیے کھو جانے والی تھی، اس نے تمام تجربوں سے بہت آگے کی تازگی پالی تھی۔ ہر لمحے کی ایک اپنی اہم طاقت تھی اور اس کے جسم کے ہر حصے میں جذبات پھر سے بیدار ہو رہے تھے۔ پیچھے سے اپنے شوہر کے پیار کرنے کے انداز کو قبول لیتے ہوئے ریکو نے خود کو پنجوں کے بل اٹھایا اور اپنے پورے جسم میں، اس کے طاقتور دباؤ کو آنے دیا۔

''سب سے پہلے غسل اور پھر اس کے بعد تھوڑا سا، سا کی ۔۔۔۔ بستر کو اوپر والی منزل پر لے جاؤ، کیا تم لے جاسکو گی؟''

لیفٹیننٹ نے یہ الفاظ اپنی بیوی کے کان میں کہے۔ ریکو نے خاموشی سے رضامندی ظاہر کی۔ وردی کو اتار کر پرے پھینکتے ہوئے لیفٹیننٹ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ پس منظر میں نیچے گرنے والے پانی کے مدھم شور کے جلو میں ریکو نے رہائشی کمرے میں پڑی چار کول کی انگیٹھی کی طرف دھیان دیا اور سا کی کو گرم کرنے کی تیاری کی۔ گاؤن، کمر بند اور چند زیر جامے لیے ہوئے، وہ یہ پوچھنے کے لیے

کہ پانی کیسا ہے' باتھ روم کی طرف بڑھی۔ بھاپ کے حلقہ دار بادل کے بیچ میں لیفٹیننٹ چوکڑی مارے بیٹھا شیو کررہا تھااور وہ اس کی طاقتور رنگیلی کمر کے پٹھوں کی حرکت کا کسی قدر ہی ادراک کرسکتی تھی جو اس کے بازوؤں کی حرکت کے ساتھ موافقت کررہے تھے۔

یہاں کسی خصوصی اہمیت کے لمحات کا اشارہ تک نہیں تھا۔اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے، ریکو گھر میں موجود سٹاک کو کھنگالتے ہوئے ،سائیڈ ڈشوں کی تیاری کررہی تھی۔اس کے ہاتھ کانپ نہیں رہے تھے۔بلکہ وہ معمول سے بھی زیادہ سکون اور پھرتی سے یہ سارا انتظام کررہی تھی۔یہ سچ ہے کہ وقفے وقفے سے،اس کے سینے کے اندر ایک عجیب طرح کی گہری پھڑکن تھی۔دوری پر چمکتی ہوئی آسمانی بجلی کی طرح،اس کی شدت بہت زیادہ تھی اور پھر یہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب بھی ہوجاتی تھی۔اس کے علاوہ معمول کے خلاف کوئی بات نہیں تھی۔

باتھ روم میں شیو کرتے ہوئے لیفٹیننٹ نے معجزانہ طور پر، آخر کار پچھلے بے فیصلہ دنوں کی، اپنے گرم جسم کی تھکن سے چھٹکارا حاصل کرلیا تھااور اس کے باوجود کہ آنے والی موت اس کے سر پر کھڑی تھی، وہ خوش کردینے والی آرزو سے بھرا ہوا تھا۔اس کی بیوی کے گھر میں چلنے پھرنے کی مدھم آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔اس صحت مند جسم کی دلی خواہش، جو پچھلے دو دنوں سے دب سی گئی تھی پھر عود کر آئی تھی۔

لیفٹیننٹ پُراعتماد تھا کہ اس خوشی میں کوئی ناخالص پن نہیں تھا،جس کا تجربہ،اسے موت کے بارے میں پکا ارادہ کرلینے پر ہوا تھا۔ہوش مندی کے واضح انداز میں تو بے شک نہیں،لیکن اس لمحے ان دونوں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ جائز خوشیاں،جن کو وہ اپنے پرائیویٹ لمحات میں حاصل کرتے تھے،وہ ایک بار پھر تقدس اور پارسائی کی محافظت میں تھیں اور وہ اخلاقیات، جن کو ختم نہیں کیا جاسکتا تھا،مکمل طور پر ان کے زیر اثر تھیں۔ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اور ان میں ایک قابلِ فخر موت کو دریافت کرتے ہوئے،انھوں نے ایک بار پھر خود کو فولادی دیواروں کے پیچھے محفوظ خیال کیا،جن کو کوئی تباہ نہیں کرسکتا تھا' جو خوب صورتی اور سچائی کی غیر نفوذ شدہ زرہ بکتر کے غلاف کے اندر موجود تھیں۔اس لیے اپنی حب الوطنی کے اخلاص اور جسم کی خواہشات کے درمیان کسی تضاد اور نا موافقت کو محسوس کرتے ہوئے بھی لیفٹیننٹ،ان دونوں کو ایک ہی چیز کے دو حصے سمجھ رہا تھا۔سیاہ ٹوٹے ہوئے دیواری آئینے میں اپنا چہرہ گھسائے ہوئے، لیفٹیننٹ نے بہت احتیاط کے ساتھ شیو کی۔یہ اس کی موت کا چہرہ ہوسکتا

تھا۔وہاں پر نظر نہ آنے والے الزامات کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔کلین شیو چہرہ ایک بار پھر نو جوانی کی روشنی میں لپٹا نظر آ رہا تھا،اس سے شیشے کی سیاہی چمکنے لگی تھی ۔حتیٰ کہ اس نے محسوس کیا کہ اس صحت مند چہرے کے ساتھ،موت کی مصاحبت میں ایک یقینی خوش وضعی تھی ۔

جیسا کہ وہ اس وقت دکھائی دے رہا تھا، یہ اس کی موت والا چہرہ بن جائے گا۔حقیقت میں، یہ پہلے ہی لیفٹیننٹ کے ذاتی تصرف سے آدھا نکل چکا تھا اور یہ ایک فوت شدہ سپاہی کی یاد میں بنایا گیا مجسمہ لگ رہا تھا۔تجربے کے طور پر اس نے اپنی آنکھوں کو سختی کے ساتھ بند کر لیا۔ہر چیز اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی اور اب وہ ایک زندہ دیکھنے والی مخلوق نہیں تھا۔

وہ باتھ روم سے نکل کر آیا تو اس کے ہموار گالوں کے نیچے شیو کے مدھم سے نیلے نشانات نظر آ رہے تھے،وہ آگ سے خوب روشن کوئلوں والی انگیٹھی کے قریب بیٹھ گیا۔اس نے دیکھا کہ اگر چہ ریکو اپنے کام کاج میں مصروف رہی تھی پھر بھی اس کے پاس اتنا وقت ضرور تھا کہ اس نے اپنے چہرے کو تھوڑا سا درست کر لیا تھا۔اس کے گال زیبائشی تھے اور اس کے ہونٹ نم تھے ۔وہاں غم کا کوئی سایہ تک نہیں تھا۔لیفٹیننٹ نے سچائی کے ساتھ اپنی نوجوان بیوی کی جذباتی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی بیوی کا انتخاب کیا تھا جیسا کہ اسے کرنا چاہیے تھا۔

جیسے ہی لیفٹیننٹ نے اپنے ساکی کپ کو بھرا،اس نے ریکو کو بھی پینے کی دعوت دی۔ریکو نے اس سے پہلے ساکی کو نہیں چکھا تھا لیکن اس نے اسے بغیر کسی جھجک کے قبول کیا اور ڈرتے ڈرتے اس کے گھونٹ بھرنے لگی۔

''اِدھر آؤ''،لیفٹیننٹ نے کہا۔

ریکو اپنے شوہر کی سمت میں سرکی اور جب وہ اس کی گود کی طرف پیچھے کو جھکی تو اسے بھینچ لیا گیا۔اس کی چھاتیاں،نہایت شدت سے تھرتھرائیں ۔غم،خوشی اور ساکی کی طاقت نے آپس میں مدغم ہو کر،اس کے اندر ہلچل مچا دی۔لیفٹیننٹ نے اپنی بیوی کے چہرے کی جانب دیکھا۔یہ دنیا کا وہ واحد آخری چہرہ تھا جو وہ اب دیکھ رہا تھا،آخری چہرہ وہ دیکھے گا جو کہ اس کی بیوی کا ہو گا۔لیفٹیننٹ،اس چہرے کو لمحاتی طور پر اپنی آنکھوں سے اس مسافر کی طرح دیکھ رہا تھا، جو شاندار مناظر کو الوداع کہہ رہا ہو اور جن کو وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا ۔یہ وہ چہرہ تھا، جس کو دیکھتے ہوئے وہ تھک نہیں سکتا تھا، جس کے خدوخال درست تھے،ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے،اس کے ہونٹ ایک نرم سی قوت کے ساتھ سختی سے بند تھے۔

لیفٹیننٹ نے بغیر کسی سوچ کے ان ہونٹوں کو چوم لیا۔ اور اچانک' حالاں کہ چہرے پر نظر آنے والی سسکیوں کی وجہ سے کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوا تھا، پھر بھی اس نے محسوس کیا کہ بند آنکھوں کی لمبی پلکوں کے نیچے، آہستگی سے آنسو امڈ رہے ہیں اور ایک چمک دار ندی کی طرح چھلکنے لگے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد جب لیفٹیننٹ نے اوپر والی منزل پر واقع بیڈروم میں جانے کی خواہش کی، اس کی بیوی نے کہا کہ وہ ایسا ہی کرے گی، لیکن نہانے کے بعد۔ بیڈروم کی طرف جانے کے لیے اکیلے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، جہاں کی فضا پہلے ہی گیس ہیٹر کی وجہ سے گرم ہو چکی تھی، لیفٹیننٹ بازوؤں اور ٹانگوں کو کھولتے ہوئے بستر پا جالیٹا۔ تاہم وہ وقت جب کہ وہ لیٹا اپنی بیوی کا منتظر تھا کہ وہ اسے آملے، اس کا وقت معمول کے لحاظ سے نہ تو زیادہ تھا اور نہ ہی کم تھا۔ اس نے اپنے بازو اپنے سر کے نیچے تہہ کیے اور اسٹینڈرڈ لیمپ کی رسائی سے دور، مدھم پن میں چھت کے سیاہ تختوں کی طرف دیکھا۔ کیا یہ موت تھی جس کا وہ اب انتظار کر رہا تھا؟ یا پھر یہ حواس کی خود رووارفتگی تھی؟ یہ دونوں ایک دوسرے کے اوپر آرہے تھے ویسے ہی جیسے اس جسمانی خواہش کا مقصد بجائے خود موت ہو۔ لیکن تاہم یہ ممکن اور یقینی تھا کہ لیفٹیننٹ نے اس سے پہلے ایسی آزادی کا مزہ نہیں چکھا تھا۔

باہر کھڑکی کے قریب ایک کار کی آواز آئی۔ وہ گلی میں جمع شدہ برف پر سے، اس کے ٹائروں کے پھسلنے اور چیخنے کو سن رہا تھا۔ دیواروں کے قریب سے، اس کے ہارن کی بار بار آواز آئی۔ ان آوازوں کو سن کر اس کا تاثر یہ تھا کہ معمول کے مطابق، مکان اپنی بےچینی کے سمندر میں تنہا جزیرے جیسے معاشرے کی طرح ابھر آیا تھا۔ چاروں طرف، وسیع طور پر ناصاف حالت میں سارا ملک موجود تھا جس کے لیے وہ غم زدہ تھا۔ وہ اس کے لیے اپنی جان دینے والا تھا۔ لیکن کیا یہ عظیم ملک، جس کی خاطر وہ اپنے آپ کو پیش کرنے جا رہا تھا' اس کی موت پر معمولی سی بھی توجہ دے گا؟ وہ نہیں جانتا تھا اور یہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا میدانِ جنگ عظمت والا نہیں تھا۔ یہ وہ میدانِ جنگ تھا جہاں کوئی اپنی شجاعت کے کارنامے دکھا سکتا تھا، یہ روح کا محاذ تھا۔

سیڑھیوں پر ریکو کے قدموں کی آواز ابھری۔ اس پرانے گھر میں ڈھلوانی سیڑھیاں بہت آواز پیدا کرتی تھیں۔ اس آواز کے ساتھ کچھ اچھی یادیں بھی وابستہ تھیں اور بہت سے مواقع پر، بستر میں انتظار کرتے ہوئے لیفٹیننٹ اس کی خوش آمدید ی آواز کو سنتا تھا۔ اس خیال پر کہ اب وہ اسے دوبارہ نہیں سن سکے گا، اس نے، اس کو بہت زیادہ توجہ کے ساتھ سنا، تا کہ اس قیمتی وقت کا ہر ہر لمحہ سیڑھیوں کی کڑ

کڑاہٹ کے ساتھ پاؤں کی نرمی کی آواز کو بھی سن سکے۔ یہ لمحات اندر کی روشنی کے جگمگاتے موتیوں میں تبدیل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

ریکو نے اپنے یوکاتا کی کمر پر ناگویا کمر بند پہن رکھا تھا لیکن جب لیفٹیننٹ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو روشنی کے مدھم ہونے کی بنا پر اس کی سرخی سنجیدہ ہو اٹھی۔ ریکو کا ہاتھ اس کی مدد کے لیے بڑھا اور کمر بند نیچے گر پڑا اور تیزی سے پھسلتا ہوا فرش پر آ گیا۔ جب کہ وہ اب بھی اپنے یوکاتا میں ملبوس اس کے سامنے کھڑی تھی۔ لیفٹیننٹ نے دونوں آستینوں کے اطراف میں موجود جھریوں میں اپنے ہاتھ ڈالے، وہ اسے گلے لگانا چاہتا تھا جب کہ اس (ریکو) کا ننگا گرم جسم، اس کی انگلیوں کے سروں کے لمس کے قریب تھا، اچانک اس کا سارا جسم بھڑک اٹھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ دونوں روشن گیس ہیٹر کے سامنے ننگے لیٹے تھے۔

احساسات نے گفتگو نہیں کی، صرف ان کے دل بولے، ان دونوں کے جسم اور ان کی آپس میں ٹکراتی چھاتیاں، اس آگاہی سے شعلہ زن ہوئیں کہ یہ بالکل آخری وقت تھا۔ 'آخری وقت'' یہ الفاظ ان کے جسموں کے ہر انچ پر نظر آنے والے برش سٹروکس جیسے انداز میں نظر آتے تھے۔

لیفٹیننٹ نے اپنی بیوی کو قریب کیا اور پر جوش انداز میں اس کو چوما۔ جب ان کی زبانیں ایک دوسرے کے منہ کی نم آلود اندرونی طرف، ایک طلب کے ساتھ آگے بڑھیں تو انھیں محسوس ہوا، جیسے موت کی ابھی تک نہ محسوس کی جا سکتی تکلیف نے، سرخ حد تک گرم سٹیل جیسی سختی کو، ان کے حواس کی معتدلی میں بدل دیا تھا۔ ان تکالیف نے، جنھیں انھوں نے ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا یعنی فاصلے پر موجود موت کے درد کی تکالیف کو اس نے ان کی خوشی کی آگاہی کو بہت عمدہ بنا دیا تھا۔

''یہ آخری بار ہو گا کہ میں تمھارے جسم کو دیکھ سکوں گا۔'' لیفٹیننٹ نے کہا: ''مجھے اس کو قریب سے دیکھنے دو۔'' اس نے لیمپ سٹینڈ کی سائیڈ کو، اس انداز میں بدلا کہ روشنی کی کرنوں نے، ریکو کے پھیلے ہوئے جسم کو، پورے طور پر عیاں کر دیا۔

ریکو اپنی بند آنکھوں کے ساتھ ساکن پڑی تھی۔ لیمپ کا زاویہ بدلنے کی وجہ سے، اس کے سفید جسم کی شاہانہ شان و شوکت بالکل واضح ہو گئی تھی۔ ان فرصت کے لمحات میں لیفٹیننٹ نے اس ناقابلِ فراموش نظارے کو، اپنے ذہن پر مرتسم ہونے دیا۔ ایک ہاتھ سے، اس نے اس کے بالوں کو سہلایا اور دوسرے سے، اس کے شاندار چہرے کو، نرمی سے تھپکتے ہوئے، اس نے اسے یہاں وہاں،

جہاں تک اس کی آنکھوں کی پہنچ تھی، چوما۔

نیچے کی طرف جھکاؤ رکھنے والے،اس کے بلند ماتھے کی خاموش ٹھنڈک، ہلکے سے نقش ونگار والا انداز لیے ہوئے،اس کی بھنووں کے نیچے لمبی پلکوں کے ساتھ بند آنکھیں،اپنی وضع میں ایک مکمل ناک،بھرے بھرے ہونٹوں کے درمیان چمک دار دانتوں کی جھلک،نرم گال اور ایک ننھی سی ذہین ٹھوڑی ،ان ساری چیزوں نے اور اس کے ساتھ،روشن موت والے چہرے کی جھلک نے،اس کو مسحور کر دیا تھا اور وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو ریکو کے سفید گلے پر رکھ رہا تھا،جہاں جلد ہی ریکو کا اپنا ہاتھ ٹکرانے والا تھا اور اس کے بوسوں سے اس کا گلا ہلکا سُرخ ہو رہا تھا۔اس کے منہ کی طرف مڑتے ہوئے،اس نے اس پر اپنے ہونٹوں کا ہلکا سا دباؤ ڈالا اور اس نے ریکو کے جسم پر ایک ردھم کے ساتھ یوں حرکت دی،جیسے کسی چھوٹی کشتی کی گھومنے والی روشنی حرکت کرتی ہے۔اس کے آنکھیں بند کرنے پر،دنیا اسے ایک حرکت کرتے،پنگھوڑے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

جہاں کہیں لیفٹیننٹ کی آنکھیں حرکت کرتیں،وہاں وہاں اس کے ہونٹ ایمان داری سے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔تنی ہوئی بھری بھری چھاتیاں اور جنگلی چیری کے شگوفوں جیسی ڈوڈیاں،جن پر لیفٹیننٹ کے لب تھے اور وہ ان کی وجہ سے سرخ ہو چکی تھیں۔اس کے بازو کلائیوں کی ڈھلانوں کے ساتھ دونوں چھاتیوں کے اطراف میں نہایت آہستگی سے نیچے کی طرف جاتے تھے،ابھی تک انھوں نے اپنا تناسب اور گولائی نہیں کھوئی تھی اور ان کے آخر میں وہ نازک انگلیاں تھیں،جنھوں نے شادی کی تقریب میں پنکھا تھام رکھا تھا۔ایک ایک کر کے لیفٹیننٹ نے انھیں چوما تو انگلیوں نے شرم کے مارے اپنے آپ کو پکڑ لیا۔۔۔۔چھاتیوں اور پیٹ کے درمیان موجود قدرتی خالی خم اور پیٹ پر موجود لکیریں نہ صرف اس کی نرمی کو ظاہر کرتی تھیں بلکہ یہ اس کی طاقت کی بھی مظہر تھیں اور وہ اس کے کولہوں کے آس پاس موجود،اپنی شان دار موجودگی کو ظاہر کرتی تھیں،ان کے دیکھنے میں ایک جھجک اور صحیح ڈسپلن تھا۔پیٹ اور کولہوں کی سفیدی اور شان وشوکت ایسی تھی جیسے وہ دودھ سے لبالب بھرا ہوا،ایک بڑا پیالہ ہو،اور تیزی سے سایوں میں غوطہ زن ہوتی ہوئی ناف اسی موقع پر گرنے والے بارش کے قطرے کی اثر پذیری جیسی تھی۔جہاں سایے جمع ہو کر زیادہ گہرے ہو رہے تھے،بالوں کا نرم اور حساس جھنڈ تھا جہاں اضطراب بڑھ رہا تھا اور اب یہ کوئی مفعول جسم نہ تھا اس حصے میں کھلتے ہوئے شگوفے جیسی خوشبو کی آتش؛جس کی اثر پذیری بتدریج بڑھ رہی تھی؛ایک مہک کی طرح منڈلا رہی تھی۔

آخر کار، ریکو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"مجھے دکھاؤ' آخری بار مجھے بھی دیکھنے دو۔"

اس نے اس سے پہلے کبھی اپنی بیوی کے ہونٹوں سے اتنی مضبوط اور غیر مبہم درخواست نہیں سنی تھی ۔یہ ایک ایسی چیز تھی، جسے اس کی حیا آخر تک چھپائے رکھنا چاہتی تھی لیکن اب یہ اچانک اپنے صبر کی تمام حدوں کو پھلانگ گئی تھی ۔لیفٹیننٹ اپنی کمر کے بل لیٹا رہا اور اس نے بیوی کی بات مان لی ۔نازک انداز سے،اس نے اپنے سفید لرزتے ہوئے جسم کو اٹھایا (اور اپنے خاوند کی طرف مڑتے ہوئے اپنی معصومانہ خواہش کی تپش میں اتھڑے ہوئے'جو کچھ کہ وہ اس کے لیے کر چکا تھا)اور اس نے اپنی سفید انگلیاں لیفٹیننٹ کی آنکھوں پر رکھیں، جو اسے مسلسل دیکھ رہی تھیں'اس نے انھیں آہستہ سے تھپک کر بند کیا۔اچانک،نازکیت سے مغلوب ہو کر،اس کے گال مدہوش کر دینے والے جذبات کے امڈ آنے پر سرخ ہو اٹھے۔ ریکو نے لیفٹیننٹ کا سر، جو بہت قریب سے مونڈا گیا تھا، پر اپنے بازو رکھے۔کھڑے بالوں نے اس کی چھاتیوں سے مس ہو کر،اسے تھوڑی سی تکلیف پہنچائی ۔اس کے جسم میں کھبی ہوئی اس کی مشہور ناک ٹھنڈی تھی اور اس کا سانس گرم تھا۔اپنی بغل گیری میں سکون لیتے ہوئے،اس نے اپنے شوہر کے مردانہ چہرے کو دیکھا۔کھردری بھنویں، بند آنکھیں، ناک کا شاندار بانسہ،خوش وضع ہونٹ ،جو سختی سے بھنچے ہوئے تھے، نیلے کلین شیو گال جو روشنی میں منعکس ہوتے تھے اور یکسانی سے چمک رہے تھے،ریکو نے انھیں چوما ۔ریکو نے گردن کی چوڑی گدی'اور اٹھے ہوئے کندھوں،طاقتور چھاتی کے دو دائروں، جو ڈھال کی طرح تھے اور اس کی بھورے رنگ کی نپلوں کو،چوما۔بغلوں میں،شانوں اور چھاتی کے کشادہ گوشت کی سایہ زدہ گہرائی میں بالوں کی بڑھوتری سے ایک میٹھی اداس بو برآمد ہو رہی تھی اور اس بو کی مٹھاس اپنے میں' کسی حد تک،ایک نوجوان موت کا جوہر رکھتی تھی ۔لیفٹیننٹ کے ننگے جسم کی جلد جو کے کھیت کی طرح چمک رہی تھی اور ہر طرف پٹھے ایک فوری سکون کا اظہار کر رہے تھے اور پیٹ کے نچلے حصے میں کسی غرور کے بغیر چھوٹی سی ناف کی طرف جھک رہے تھی ۔ایک مضبوط اور نوجوان پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جو گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا، ریکو نے سوچا کہ جلد ہی اسے ظالمانہ طریقے سے تلوار کے ساتھ کاٹ دیا جائے گا اور اس نے اپنا سر اس پر رکھ دیا۔اس نے ترنم کے انداز میں سسکیاں لیتے ہوئے اپنے بوسوں سے اسے نہلا دیا۔

لیفٹیننٹ نے اپنے پیٹ پر اپنی بیوی کے آنسوؤں کے گرنے کو محسوس کرنے پر، خودکشی کی

ظالمانہ تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے خود کو تیار پایا۔

انھوں نے ان سرمستیوں کے تبادلے کے نتیجے میں کیسی سرمستیاں حاصل کی ہوں گی، ان کو تصور میں لایا جا سکتا ہے۔ لیفٹیننٹ اٹھا اور اس نے ایک طاقتور بغل گیری میں اپنی بیوی کے جسم کو موڑا اس کا جسم جو اس کے غم اور آنسوؤں کے بعد تھک کر بے جان ہو رہا تھا۔ جذباتی انداز میں، انھوں نے اپنے چہرے ایک دوسرے کے قریب کر لیے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے گال رگڑنے لگے۔ ریکو کا جسم کانپ رہا تھا۔ ان کی چھاتیاں پسینے سے نمی پکڑ کر ایک دوسرے میں پیوست تھیں اور ان نوجوان اور خوب صورت جسموں کا ہر ہر حصہ ایک دوسرے میں جذب ہو کر یوں ایک ہو گیا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب کبھی دوبارہ ان میں علاحدگی نہیں ہو گی۔ ریکو رو پڑی۔ بلندیوں سے وہ عمیق گہرائیوں میں جا گرے اور گہرائیوں سے وہ پروں کے ذریعے، ابھر کر زیادہ مدہوش کر دینے والی اونچائیوں تک پہنچے۔ لیفٹیننٹ اپنے روٹ مارچ رجمنٹ کا جھنڈا اٹھا کر چلنے والے کی طرح ہانپنے لگا، ایک چکر کے ختم ہونے پر تقریباً فوراً ہی جذبے کی ایک نئی لہر پیدا ہو گی اور وہ اکٹھے کسی تھکن کے بغیر اس چوٹی کو طے کر لیں گے۔

آخر کار لیفٹیننٹ پرے ہوا تو اس کی وجہ اس کی تھکن نہیں تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ اسے پریشانی تھی کہ جتنی ضروری قوت کی بہتات اسے خودکشی کے لیے درکار تھی وہ اس کو کم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک اور وجہ بھی تھی وہ یہ کہ نفس پرستی کی وجہ سے وہ اپنی آخری یادوں کی مٹھاس کو مسخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب لیفٹیننٹ نے واضح طور پر اپنے عمل سے پرہیز کیا تو ریکو نے بھی، جو عمومی طور پر تابع داری کرتی تھی، اس کی مثال پر عمل کیا۔ وہ دونوں کمر کے بل ننگے لیٹے ہوئے تھے اور ان کی انگلیاں آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔ کمرہ ہیٹر کی وجہ سے گرم تھا اور حتیٰ کہ جب ان کا پسینہ، ان کے جسموں سے برآمد ہونا بند بھی ہو گیا تو تب بھی انھوں نے ٹھنڈ محسوس نہیں کی۔ باہر اس خاموش رات میں، گزرتی ٹریفک کی آواز مفقود تھی۔ حتیٰ کہ یتسویا اسٹیشن کے گرد سڑکوں پر چلتی کاروں اور ٹرینوں کا شور، اتنی دور تک اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ خندق میں گھرے ہوئے علاقے کی بازگشت کی اثر اندازی کے بعد وہ آکاسا کا پیلس کے سامنے بڑی شاہراہ کا سامنا کرنے والے گھنے درختوں والے پارک میں گم ہو رہے تھے۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس مقام پر، جسے کہ ایک دباؤ نے جکڑ رکھا تھا، یہاں آپس میں شدید طور پر شاہی فوجوں کے دو دھڑے جنگ پر آمادہ تھے۔

وہ اپنے باطن کی گرم روشن خوشبو کے جلو میں لیٹے ہوئے ابھی تھوڑی دیر پہلے کی سرمستی کو یاد کر

رہے تھے۔اس تجربے کے ہر لمحے کوانھوں نے دوبارہ سے بسر کیا تھا۔انھوں نے بوسوں کے اس ذائقے کو یاد کیا،جس میں کوئی جھکن نہیں تھی اورانھوں نے اپنے برہنہ جسموں کے ملاپ اور مدہوش کردینے والی پے درپے خوشی کوبھی محسوس کیا۔لیکن پہلے ہی سے محبت کے سیاہ تختوں میں سے موت کا چہرہ جھانک رہا تھا۔یہ مسرت حتمی تھی اوران کے جسم اس کو دوبارہ نہ پاسکیں گے۔اس شدت کی خوشی (اور یہ ایک جیسا خیال ان کوایک ساتھ آیا تھا) دوبارہ انھیں ملنے والی نہیں تھی، چاہے وہ اپنے بڑھاپے کو ہی کیوں نہ چھولیں۔

ان کی انگلیوں کا آپس میں الجھاؤ بھی، جلد ہی گم ہو جانے والا تھا۔محبت کے سیاہ ہوتے ہوئے لکڑی کے تختوں پر جونمونے بنے ہوئے تھے اب انہیں،ان کو دوبارہ نہیں دیکھنا تھا۔وہ موت کو اپنی طرف سرکتے ہوئے محسوس کررہے تھےاوروہ ان کے اورنزدیک آئے جارہی تھی۔اب کوئی جھجک نہیں رہ گئی تھی۔ان کو آگے بڑھ کرموت کو گلے لگانے کے لیے،اپنے آپ میں حوصلہ پیدا کرنا تھااورا سے دبوچ لینا تھا۔

''تو ٹھیک ہے۔اب ہمیں اپنی تیاری کرنی چاہیے۔''لیفٹیننٹ نے کہا۔

لفظوں میں ارادے کی پختگی کی کیفیت غلطی سے مبرّا تھی۔لیکن ساتھ ہی ریکو نے پہلے کبھی بھی اپنے شوہر کی آواز اتنی گرم اور نازک محسوس نہیں کی تھی۔جب وہ اٹھ گئے تو بہت سے کام ان کے منتظر تھے۔

لیفٹیننٹ جس نے آج تک اس کی،بستر کی بچھائی کے ضمن میں،کوئی مدد نہیں کی تھی،اب اس نے خوشی خوشی الماری کے دروازے کو بند کیا،اس نے کمرے میں بچھی ہوئی چٹائی کو خود اٹھایا اوراس نے اسے تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ریکو نے گیس ہیٹر کو بند کیا اور لیمپ کو بجھا دیا۔لیفٹیننٹ کی غیر حاضری میں وہ احتیاط سے کمرے کی صفائی کرتی تھی،چیزوں کو جھاڑتی پونچھتی تھی تا کہ ایک تازہ صفائی محسوس کی جا سکے اوراب (اگر کوئی کمرے کے ایک کونے کی طرف سرکا دیے گئے روز وڈ ٹیبل کونظر انداز کردے تو) آٹھ چٹائیوں والا کمرہ ایک ریسپشن روم کی طرح دکھائی دیتا تھا،جہاں کسی بہت ہی محترم مہمان کا انتظار کیا جارہا ہو۔

''ہم نے یہاں مےنوشی دیکھی ہے،کیانھیں؟ کانو،ہوما اورنگوشی کے ساتھ۔''

''ہاں وہ سارے کے سارے بڑے اعلیٰ پائے کے مےنوش تھے۔''

"ہم جلد ہی ان سے دوسری دنیا میں ملنے والے ہیں ۔ جب انھیں پتہ چلے گا کہ میں تمھیں اپنے ساتھ لایا ہوں تو وہ ہمیں چھیڑیں گے۔"

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے لیفٹیننٹ نے مڑ کر خاموش اور صاف ستھرے کمرے کو دیکھا، جواب چھت میں لگے لیمپ کی روشنی میں خوب چمک رہا تھا۔اس کے ذہن میں ان نوجوان افسروں کے چہرے تیر رہے تھے،جنھوں نے کل یہاں شراب نوشی کی تھی، وہ یہاں بیٹھے تھے اور وہ ادھر معصومیت کے ساتھ ڈینگیں مار رہے تھے۔اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہ اسی کمرے میں اپنا پیٹ پھاڑ لے گا۔سیڑھیوں کے نیچے والے دو کمروں میں شوہر اور بیوی نے خود کو یکسانی اور طمانیت کے ساتھ متوقع تیاری میں مصروف کر لیا۔لیفٹیننٹ پہلے ٹائلٹ میں گیا اور پھر باتھ روم میں خود کو صاف کرنے کے لیے ۔اسی اثنا میں ریکو نے اپنے شوہر کا گدی دار پیرا ہن تہہ کیا،اس کی یونی فارم والے چوغے کو، ایک جگہ پر رکھا، اس کی پتلون ،ایک بالکل نئے سیے ہوئے جانگیے کو باتھ روم میں رکھا اور رہائشی کمرے کی میز پر الوداعی کلمات کہنے کے لیے کاغذ کی شیٹس کو رکھا۔تب اس نے رائٹنگ باکس کا ڈھکن اٹھایا اور اس نے روشنائی کو رگڑنا شروع کیا۔اس نے اپنے نوٹ کے الفاظ کو پہلے ہی ذہن میں طے کر لیا تھا۔

ریکو نے روشنائی پر ملمع کیے گئے الفاظ کو، انگلیوں کی سختی سے دبایا اور یہ پانی اس دوات کی گہرائی میں پہنچتے ہی اتنا سیاہ ہو گیا جیسے کوئی کالا سیاہ بادل اس میں داخل ہو گیا ہو۔اس نے یہ سوچنا بند کر دیا کہ دہرایا جانے والا عمل ،اس کی انگلیوں کا دباؤ، یہ مدھم آواز کا اتار چڑھاؤ؛ یہ سب مکمل طور پر موت کے لیے تھا۔یہ معمول کا گھریلو کام تھا، یہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہونے والی موت سے پہلے کا آخری کام ہونا چاہیے تھا۔لیکن کسی حد تک پتھر پر ٹکیہ کے رگڑنے کی بڑھتی ہوئی ہموار حرکت میں اور گاڑھی ہوتی سیاہی کی بو میں ایک ناگفتہ انداز کا اندھیرا تھا۔وہ صاف ستھری یونی فارم کے ساتھ، جواب فوری طور پر لیفٹیننٹ نے اپنے جسم پر پہن لی تھی، باتھ روم سے باہر آیا۔کوئی لفظ کہے بغیر وہ میز کے قریب بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔اس نے بالوں والا قلم اپنے ہاتھ میں لیا اور کوئی فیصلہ کیے بغیر،اس نے اپنے سامنے پڑے کاغذ کو گھورا۔

ریکو نے سفید سلک والا کمونو لیا اور باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ جب وہ سفید کمونو پہنے ہوئے چمکتے چہرے کے ساتھ رہائشی کمرے میں آئی تو لیمپ کے نیچے میز پر ایک مکمل الوداعی نوٹ موجود تھا۔

یہ کالے موٹے موٹے قلم سے لکھے گئے سادہ الفاظ تھے:

''شاہی افواج کی عمر دراز ہو۔۔۔۔آرمی لیفٹیننٹ ٹیکیاماشنجی۔''

جب ریکو اپنا نوٹ درج کرنے کے لیے، اس کے سامنے بیٹھ گئی تو لیفٹیننٹ نے خاموشی اور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بیوی کی زرد انگلیوں کے ضبط کو، جب وہ برش کو استعمال کر رہی تھیں، دیکھا۔

ان کے اپنے اپنے نوٹ ہاتھوں میں تھے۔ لیفٹیننٹ کی تلوار اس کے پہلو میں تسمہ بند تھی، ریکو کا چھوٹا سا خنجر، اس کے سفید کمونو کے پٹکے میں اڑسا ہوا تھا۔ وہ دونوں خدا کی عبادت والی جگہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے خاموشی سے عبادت کی۔ تب انھوں نے نچلی منزل کی ساری روشنیاں گل کر دیں۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو اس نے اپنا سر موڑا اور وہ اپنے پیچھے اوپر چڑھ کر آتی اپنی بیوی کے جسم پر موجود سفید لبادے کی سرسراہٹ کی طرف متوجہ ہوا، جس کی نگاہیں نیچے کے اندھیرے میں جھکی ہوئی تھیں۔

اوپر والی منزل کے کمرے کے کنج میں، الوادعی نوٹ ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ آیا انھیں اس لٹکے ہوئے مسودے کو، جو لیفٹیننٹ جنرل اوزکی نے لکھا تھا، ہٹا نہیں دینا چاہیے تھا اور جو کہ صرف دو چینی خصوصیات کو ظاہر کرتا تھا، انھوں نے اسے جہاں وہ موجود تھا، وہیں رہنے دیا۔ حالاں کہ اس نے وہاں پر خون کے چھینٹوں سے داغ دار ہو جانا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ لیفٹیننٹ جنرل سمجھ جائے گا۔

سیدھے بیٹھے ہوئے لیفٹیننٹ نے، جس نے کمرے حجرے کے پچھلے حصے سے لگا رکھی تھی، اپنی تلوار اپنے سامنے فرش پر رکھ دی۔

ایک چٹائی کی دوری پر، ریکو اس کے روبرو بیٹھی تھی کیوں کہ اس کا باقی کا سراپا حد سے زیادہ سفید تھا اس لیے غازے کی وجہ سے، اس کے ہونٹ نمایاں انداز میں بہک رہے تھے۔ ایک دوسرے سے علاحدہ کرنے والی چٹائی کے پار، وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ لیفٹیننٹ کی تلوار اس کے گھٹنوں کے آگے پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر ریکو نے، اپنے ملن کی پہلی رات کو یاد کیا اور اسے غم نے گھیر لیا۔

لیفٹیننٹ کھردری آواز میں بولا:

''اب چوں کہ میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں بچا تو مجھے ایسے میں گھبراگھاؤ لگانا ہوگا۔ یہ

کوئی اچھا منظر نہیں ہوگا لیکن براہِ مہربانی خوف زدہ مت ہونا۔کسی بھی قسم کی موت کو دیکھنا، ایک ڈراؤنا عمل ہے۔تم جو کچھ دیکھو، اس سے بے حوصلہ مت ہونا۔ٹھیک ہے ہاں؟''

''ہاں۔''ریکو نے خاصی گہرائی تک خود کو جھکایا۔

اپنی دبلی پتلی بیوی کے سراپے کی طرف دیکھتے ہوئے لیفٹینٹ کو ایک بازاری قسم کا جوشیلا تجربہ ہوا۔جو کچھ وہ کرنے جا رہا تھا وہ ایک عوامی قسم کے سپاہی جیسا عمل تھا اور ایسا مظاہرہ، اس نے اس سے پہلے اپنی بیوی کے سامنے نہیں کیا تھا۔یہ کوئی لڑائی لڑنے کے حوصلے کے برابر ایک ارادہ تھا۔یہ کسی فرنٹ لائن پر واقع ہونے والی موت کے درجے سے کوئی کم کوئی موت نہیں تھی۔یہ اس کا میدانِ جنگ میں وہ عمل تھا، جس کا مظاہرہ، وہ اب کرنے والا تھا۔

لحاتی طور پر لیفٹینٹ کا یہ خیال، اسے ایک عجیب فینٹسی کی طرف لے گیا۔میدانِ جنگ میں ایک اکیلی موت، اس کی خوب صورت بیوی کی آنکھوں کے سامنے ایک موت ----ایک جوش کہ اسے دو طرح کی موت کا سامنا تھا۔وہ یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ یہ دونوں کا ایک ناممکن ملن تھا اور ایسے میں جو میٹھا پن تھا وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس نے سوچا، اسے خوش قسمتی کا ایک اعلیٰ اصول ہونا چاہیے۔ان خوب صورت آنکھوں سے دیکھے جانے والے موت کے اس عمل کے ہر لمحے کا ہونا، یہ ایک خوشبودار نرم سمندری ہوا کے جلو میں، ایک موت کے سامنے جنم لینے کے مترادف تھا۔یہاں ایک طرح کی خصوصی حمایت بھی موجود تھی۔اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ اصل میں تھی کیا، لیکن یہ ایک ایسی عمل داری تھی جس سے دوسرے بے خبر تھے۔یہ ایک ایسی چیز تھی جو کسی اور کو نہیں، بس اسے ہی ملی تھی۔لیفٹنیٹ کی یہ سفید لبادے والی دلہنوں جیسی روشن بیوی ایسی تمام چیزیں دیکھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جن کے ساتھ اسے محبت تھی اور جس کے لیے وہ اپنی زندگی کو قربان کر رہا تھا یعنی: شاہی خاندان، قوم اور فوجی جھنڈا۔

ریکو اپنے شوہر کو ہمہ تن غور سے دیکھ رہی تھی، جو بہت جلد مر جانے والا تھا، اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے دنیا میں، اس جیسی خوب صورت چیز کبھی نہیں دیکھی۔لیفٹینٹ ہمیشہ اپنی یونیفارم میں اچھا لگتا تھا لیکن اب جب کہ وہ اپنی کھنچی ہوئی بھنوؤں اور مضبوطی سے بند ہونٹوں کے ساتھ، موت کے مراقبے میں تھا تو اس وقت وہ شاید مردانہ خوب صورتی کے عین عروج پر تھا۔

''جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''آخر کار لیفٹینٹ نے کہا۔

ریکو نے چٹائی پر اپنے جسم کو بہت زیادہ گہرائی تک جھکا دیا۔وہ اپنا سر نہ اٹھا سکی۔وہ اپنے

آنسوؤں کی وجہ سے، اپنے میک اپ کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔

اور آخر کار جب اس نے اوپر دیکھا تو اس نے آنسوؤں کے دھندلے پن میں سے دیکھا کہ اس کے شوہر نے، اب ناصاف شدہ اپنی تلوار کے بلیڈ کے گرد ایک سفید پٹی لپیٹ رکھی ہے اور اس کے آخری سرے پر پانچ چھ انچ کے سٹیل کو ننگا چھوڑ دیا گیا ہے۔

چٹائی پر کپڑے میں لپٹی ہوئی تلوار کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے، لیفٹیننٹ اپنے گھٹنوں کے بل اٹھ کھڑا ہوا، اس نے خود کو ایک دوسری کے اوپر ٹانگ دھرنے کا انداز، دوبارہ اختیار کیا اور اپنی یونی فارم کے کالر کے ہکس کو کھول دیا۔ اس کی آنکھیں اب اپنی بیوی کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ آہستہ سے، ایک ایک کر کے، اس نے پیتل کے چپٹے بٹنوں کو کھولا اس کی دھندلی براؤن چھاتی نظر آنے لگی اور اس کا پیٹ بھی ظاہر ہو گیا۔ اس نے اپنی بیلٹ کھولی اور پتلون کے بٹن بھی کھول دیے۔ اس کے بے حد سفید رنگت والے لچھے دار موٹے جانگیے کی جھلک دکھائی دی۔ لیفٹیننٹ نے دونوں ہاتھوں سے کپڑے کو کھینچا تا کہ اس کا پیٹ زیادہ نمایاں ہو اٹھے اور پھر سفید پٹی والے بلیڈ والی، تلوار سنبھالی۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے پیٹ کے نچلے حصے کو مساج کیا اور ایسا کرتے ہوئے، اس نے نیچے کی طرف نگاہ دوڑائی۔

یہ یقین کرنے کے لیے کہ اس کی تلوار کا کاٹنے والا سرا خاصا تیز ہے۔ لیفٹیننٹ نے اپنی پتلون کے پلے کو اوپر کی طرف موڑا، اس طرح اس کی ران کا تھوڑا سا حصہ نظر آنے لگا۔ اس نے آہستگی سے پھل کو جلد پر چلایا۔ فوراً ہی خون اس کے زخم سے ابل پڑا اور کئی سرخ دھاریں نیچے کی طرف بہنے لگیں اور تیز روشنی میں چمکنے لگیں۔

یہ پہلی بار تھا کہ ریکو نے اپنے شوہر کے خون کو دیکھا تھا اور اس نے اپنے سینے میں ایک زوردار دھڑکن کو محسوس کیا۔ اس نے اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیفٹیننٹ خون کو ایک خاموش تعریفی انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے، اگرچہ وہ بیک وقت یہ سوچ رہی تھی کہ یہ ایک ریاکار سکون تھا، ریکو نے اطمینان کا سانس لیا۔

لیفٹیننٹ نے باز کی طرح دیکھنے کے سخت انداز سے بیوی پر، پھر اپنی نگاہیں مرکوز کیں۔ تلوار کو اپنے سامنے موڑتے ہوئے اس نے خود کو آہستہ سے زانوؤں پر اٹھایا اور اپنے جسم کو تلوار کے سرے پر جھکنے دیا۔ وہ اپنی ساری طاقت کو مجتمع کر رہا تھا اور یہ کندھوں پر سے اس کی یونی فارم کے تند تناؤ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیفٹیننٹ نے اپنے پیٹ کے بائیں جانب گہرا وار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کی تیز چیخ نے کمرے

کی خاموشی کو چھید ڈالا۔ اس کی کوشش کے باوجود جو کہ اس نے اس وار کے لیے کی تھی، لیفٹیننٹ کا تاثر یہ تھا کہ کسی اور نے اذیت ناک طریقے سے لوہے کے ایک موٹے ڈنڈے کو اس کے پیٹ کے بائیں طرف دے مارا ہے۔ ایک سیکنڈ جتنے وقت کے لیے اس کا سر ڈگمگایا اور اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا تھا۔ پانچ یا چھ انچ کا ننگا سرا اس کے جسم میں مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا اور اس کی مٹھی میں جکڑی ہوئی سفید پٹی سیدھی اس کے پیٹ میں دبی ہوئی تھی۔

وہ ہوش میں آیا۔ اس نے سوچا بلیڈ نے یقینی طور پر، اس کے پیٹ کی دیوار کو پھاڑ دیا ہے۔ اس کا سانس بہ مشکل چل رہا تھا، اس کی چھاتی شدت سے پھڑک رہی تھی اور ذرا دور کے علاقے میں، جس پر اسے مشکل ہی سے یقین تھا کہ کیا واقعی یہ اسی کا تھا، ایک خوف زدہ کرنے والا اور جان لیوا درد ایسے امڈ رہا تھا جیسے زمین پھٹ رہی چٹان کی ابلتی ہوئی ندی اگلنے کے لیے بہہ نکلی ہو۔ اچانک درد بہت نزدیک سے خوف زدہ کرنے والی رفتار سے ہونے لگا۔ لیفٹیننٹ نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹا اور ایک جبلی کراہ کو دبا دیا۔

وہ سوچ رہا تھا۔۔۔۔ ''کیا یہ سپوکا، ہاراکاری ہے؟''

یہ ایک بے حد انتشار کا جوش تھا جیسے کہ آسمان اس کے سر پر آ گرا ہو اور دنیا شراب کے نشے میں ڈگمگا رہی ہو۔ اس کی قوتِ ارادی اور حوصلہ، جو اس کے گھاؤ لگانے سے پہلے مضبوط تھا اب وہ ایک بال جیسے فولادی دھاگے کی طرح کم ہو گیا تھا اور اب وہ ایک تنگ کرنے والے احساس تلے دب گیا تھا کہ اب اسے مایوسی سے چمٹ کر، اس دھاگے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ اس کی مٹھی کی گرفت میں نمی بڑھ رہی تھی۔ اس نے نیچے نگاہ کی، اس کا جانگیہ بھی گہرا سرخ ہو رہا تھا۔ اسے یہ بات ناقابلِ یقین لگی کہ ابھی تک اس خوف ناک درد کے بیچ میں، چیزیں جنھیں نظر آنا چاہیے، نظر آ رہی تھیں اور چیزیں جنھیں موجود ہونا چاہیے تھا موجود تھیں۔

اس لمحے، جب لیفٹیننٹ نے تلوار کو اپنی بائیں جانب گھونپا، اس کی بیوی نے، اس کے چہرے پر لہراتی موت کی زردی کو دیکھا جیسے کوئی پردہ فوری طور پر گرا دیا گیا ہو۔ ریکو نے خود کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی۔ جو کچھ پیش آیا تھا، اسے وہ دیکھنا تھا۔ اسے اس کا گواہ بننا تھا۔ یہ وہ فرض تھا، جو اس کے شوہر نے اس کے ذمے لگایا تھا۔ اس کی مخالف سمت میں وہ، ایک چٹائی کی دوری پر اپنے شوہر کو درد دباتے ہوئے، اپنے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے، دیکھ رہی تھی۔ درد تو ایک حتمی حقیقت کی

طرح اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور ریکو کے پاس، اسے، اس سے نجات دلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اس کے شوہر کے ماتھے پر پسینہ اُمڈ آیا۔ لیفٹیننٹ نے آنکھیں بند کیں اور پھر انھیں کھولا جیسے وہ کوئی تجربہ کر رہا ہو۔ آنکھوں نے اپنی روشنی کھو دی تھی اور ایک چھوٹے جانور کے مانند خالی اور معصوم لگ رہی تھیں۔

ریکو کی آنکھوں کے سامنے تکلیف کی جلن اتنی طاقتور تھی جتنی کہ گرمیوں کے سورج کی ہو سکتی ہے، یہ سراسر اس غم سے بہت دور تھی جو اس کے اندر سے، اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ درد آہستگی سے اپنے وضعی حوالے سے بڑھتے ہوئے، اوپر کی طرف پھیل رہا تھا۔ ریکو نے محسوس کیا کہ اس کا شوہر اب کسی اور ہی دنیا کا فرد بن گیا ہے، ایک ایسا شخص، جس کا سب کچھ، اب ایک درد میں تبدیل ہو چکا تھا، وہ اب درد کے پنجرے کا قیدی تھا، جہاں کوئی ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ریکو نے درد کو بالکل محسوس نہیں کیا۔ اس کا غم درد نہیں تھا۔ جب وہ اس کے متعلق سوچتی تو ریکو محسوس کرتی کہ ایک بہت اونچے شیشے کی ظالم دیوار، اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان اٹھا دی گئی ہے۔

شادی سے لے کر اب تک اس کے شوہر کا ہونا، خود اس کا ہونا تھا اور اس کے شوہر کا سانس لینا خود اس کا سانس لینا تھا۔ لیکن اب جب کہ درد میں اس کے خاوند کا ہونا ایک واضح حقیقت تھی تو ریکو اپنے اس غم میں اپنے ہونے کے یقینی ثبوت کے طور پر محسوس کر سکتی تھی۔

لیفٹیننٹ کا ہاتھ جو کہ تلوار پر تھا، اس نے اسے اپنے پیٹ کے اندر دائیں بائیں گھمانا شروع کر دیا۔ لیکن جب تلوار انتڑیوں میں الجھ گئی تو وہ متواتر ایک نرمی کے انداز میں، باہر کی طرف دھکیلی جا رہی تھی اور لیفٹیننٹ نے محسوس کیا کہ جیسے اس نے کاٹ لیا تھا، اس کو دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کے اندر اس مقام تک، اسے دبائے رکھنا چاہیے تھا۔ اس نے پھل کو آڑے انداز میں کھینچا۔ جتنی کہ اسے توقع تھی اس نے اس طرح نہیں کاٹا۔ اس نے اپنے پورے جسم کی طاقت اپنے دائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اسے دوبارہ کھینچا۔ یہ تین یا چار انچ کا گھاؤ تھا۔

اندرونی گہرائیوں سے درد آہستہ سے باہر کی طرف پھیل گیا حتیٰ کہ سارے پیٹ میں اس کی گونج محسوس ہوئی۔ یہ ایک گھنٹی کی وحشی جھنجھناہٹ کی طرح تھی۔ یا اس کے ہر سانس کے ساتھ جو وہ لے رہا تھا ایک ہزار گھنٹیوں کی کرخت آواز جیسی تھی اور اس کی نبض کی ہر پھڑکن اس کے سارے وجود کو گھما رہی تھی۔ لیفٹیننٹ اب اپنے آپ کو کراہنے سے باز نہ رکھ سکا۔ لیکن اب تک پھل نے اس کی ناف

کے نیچے تک گھاؤ کو بڑھالیا تھا اور جب اس نے یہ جانا تو اس نے اطمینان محسوس کیا اور اس کا حوصلہ پھر سے بڑھ گیا۔

خون کی مقدار آہستہ سے بڑھ گئی اور اب وہ زخم سے اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا جیسے وہ نبض کی ہر دھڑکن کے ساتھ بڑھ رہا ہو۔ لیفٹیننٹ کے سامنے والی چٹائی، وہاں پھیلے ہوئے خون سے بھیگ چکی تھی اور خون کی بہت زیادہ مقدار برآمد ہو رہی تھی جو لیفٹیننٹ کی پتلون کی تہوں میں جمع ہو گئی تھی۔ ایک پرندے کی طرح اڑتا ہوا ایک دھبا ریکو کی طرف آیا، جو اس کے سفید سلکی کمونو پر اس کی گود تک چلا آیا تھا۔ اس وقت جب لیفٹیننٹ نے آخر کار تلوار کو پیٹ کی دائیں طرف کھینچا تو پھل نے تھوڑی کم گہرائی تک کاٹا تھا اور اس کی نوک ننگی ہو گئی تھی جو خون اور چربی سے چکنی ہو گئی تھی۔ لیکن اچانک متلی کے ایک دورے کے زیر اثر لیفٹیننٹ کی پھٹی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ متلی نے شدید درد کی شدت کو اور بڑھا دیا اور پیٹ جو اب تک مضبوط اور مستحکم رہا تھا، اب اچانک پھولنے لگا اور اس کا زخم بالکل کھل گیا اور انتڑیاں اس سے باہر آ گئیں جیسے زخموں کو بھی قے آ گئی ہو۔ اپنے مالک کی تکلیف سے لاعلم رہتے ہوئے، انتڑیوں نے صحت کی مضبوطی کا اظہار کیا تھا اور انھوں نے آہستہ سے باہر آتے ہوئے قوتِ جان داری سے تقریباً ناموافقت کا اظہار کیا اور دوشاخے پر پھیل گئیں۔ لیفٹیننٹ کا سر جھک گیا، اس کے کندھے ابھر گئے، اس کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں، اور اس کے منہ سے رال بہنے لگی۔ اس کے وردی کے کندھے پر لگے اعزازی نشانات روشن ہو کر چمکنے لگے۔

خون ہر طرف پھیل گیا۔ لیفٹیننٹ اس میں اپنے گھٹنوں تک گیلا ہو گیا اور اب وہ ایک لاپرواہ انداز سے جھک گیا تھا، اس کا ایک ہاتھ فرش پر تھا۔ ایک خام سی بو سے کمرہ بھر گیا تھا۔ لیفٹیننٹ جس کا سر جھکا ہوا تھا، بار بار قے کر رہا تھا اور اس کے کندھوں کی حرکت واضح نظر آ رہی تھی۔ تلوار کے پھل کا سرا، جسے اب انتڑیوں نے پیچھے دھکیل دیا تھا اور جو لیفٹیننٹ کے دائیں ہاتھ میں تھا، نمایاں ہو رہا تھا۔ جیسا کہ اس وقت لیفٹیننٹ دکھائی دیتا تھا، اس سے زیادہ دلیرانہ نظارے کا تصور محال تھا، اس نے اپنی قوت کو جمع کیا اور اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک رہا تھا۔ حرکت میں اچانک شدت آ گئی تھی اور اس کا سر حجرے کے ستون کے ساتھ ایک تیز آواز کے ساتھ ٹکرایا۔ ریکو اب تک اپنے سر کو جھکائے ہوئے، اپنے گھٹنوں کی طرف آتے خون کے اتار چڑھاؤ کو، سحر زدہ ہو کر دیکھ رہی تھی لیکن آواز سے حیران ہو کر، اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

لیفٹیننٹ کا چہرہ ایک زندہ شخص کا چہرہ نہیں تھا۔آنکھیں کھوکھلی لگ رہی تھیں، جلد بُھن گئی تھی، اس کے گال اور ہونٹ جو کبھی روشن ہوا کرتے تھے، اب ان کا رنگ سوکھے کیچڑ جیسا تھا۔اس کا صرف دایاں ہاتھ حرکت کر رہا تھا۔بڑی مشقت کے ساتھ تلوار پکڑے ہوئے ،اس کا ہاتھ کٹھ پتلی کے ہاتھ کی طرح ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ لیفٹیننٹ کے گلے کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ریکو اپنے شوہر کی اس آخری دل توڑ دینے والی ،نا کام جدوجہد کو دیکھ رہی تھی ۔خون اور چربی سے چمکتے ہوئے ،اس نے گلے پر بار بار وار کیا۔اور ہر بار اس کا نشانہ خطا گیا۔جو طاقت اس کام میں درکار تھی مفقود تھی۔خالی جاتے وار، اس کے کالر اور کالر بیجوں سے ٹکرائے ۔اگرچہ اس کے ہک کھلے ہوئے تھے ۔اکڑے ہوئے فوجی کالر، دوبارہ بند ہو جاتے تھے اور وہ گلے کی حفاظت کر رہے تھے۔

ریکو اس سے زیادہ یہ نظارہ برداشت نہ کر سکی ۔اس نے اپنے شوہر کی مدد کرنا چاہی لیکن وہ کھڑی نہ ہو سکی ۔وہ خون میں سے اپنے گھٹنوں کے بل چلی اور اس کا سفید سکرٹ خون سے گہرا سرخ ہو اٹھا۔وہ اپنے شوہر کے عقب میں آ کر صرف اتنا کر سکی کہ اس نے اس کے کالر کو ڈھیلا کر دیا۔ادھر اُدھر پڑتے پھل نے آخر کار گلے کے ننگے گوشت سے ملاپ کیا۔اس لمحے ریکو کا احساس یہ تھا کہ خود اس نے اپنے شوہر کو آگے دھکیلا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔یہ حرکت خود لیفٹیننٹ کی طرف سے تھی یعنی یہ اس کی طاقت کی آخری جدوجہد تھی ۔اچانک اس نے ،اپنے جسم کو پھل پر گرا دیا اور پھل اس کی گردن میں گھس گیا اور یہ گدی میں سے باہر نکل گیا۔خون کا ایک فوارہ ابل پڑا اور لیفٹیننٹ ساکن ہو گیا، یہ اس کی گردن کی پچھلی طرف سے باہر نکلا ہوا نیلے رنگ میں رنگا ٹھنڈا فولاد تھا۔

ریکو جس کی جرابیں خون میں لت پت تھیں وہ آہستہ سے سیڑھیوں سے نیچے اتری، اوپر والی منزل والا کمرہ اب مکمل طور پر خاموش تھا۔

ریکو نے گراؤنڈ فلور کی لائٹس آن کیں ۔اس نے گیس جیٹ اور گیس کے مین پلگ کو چیک کیا اور اس نے انگیٹھی میں نیچے دبے ہوئے سلگتے کوئلوں پر پانی ڈالا ۔وہ ساڑھے چار چٹائیوں والے کمرے میں سیدھے انداز میں رکھے گئے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنے سکرٹ کو پکڑے رکھا۔خون کے چھینٹے اس طرح دکھائی دیتے تھے جیسے وہاں ان کا واضح اور تیز رنگوں والا نمونہ بنایا گیا ہو۔اور یہ اس کے سفید کمونو کے نچلے آدھے حصے پر پھیلا ہوا تھا۔جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھ گئی تو وہ اپنے زانوؤں کے آس پاس موجود اپنے شوہر کے خون کی نمی اور ٹھنڈک سے آگاہ تھی اور وہ کانپ رہی تھی ۔پھر

وہ کسی قدر لمبے عرصے تک، اپنے سنگھار کی تیاریوں کے حوالے سے سستی برتتی رہی تھی۔ اس نے اپنے گالوں پر خاصی زیادہ مقدار میں غازہ لگایا اور اس نے اپنے ہونٹوں کو بھی خوب رنگا۔ یہ اس کے شوہر کو خوش کرنے والا میک اپ نہیں تھا۔ یہ ایسا میک اپ تھا جو دنیا کے لیے تھا اور جسے اس نے پیچھے چھوڑ جانا تھا، یہ شان دار تھا اور اس کا برش ورک قابلِ دید تھا۔ جب وہ اٹھی تو آئینے کے سامنے والی چٹائی خون سے بھیگی ہوئی تھی۔ ریکو کو اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔

سنگھار ختم کر کے بالآخر وہ پورچ کے سیمنٹ والے فرش پر کھڑی ہوگئی۔ جب رات کو اس کے شوہر نے دروازے کو چٹخنی لگادی تھی تو یہ موت کی تیاری کے لیے تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ سادہ سے مسئلے کے غور میں مستغرق کھڑی رہی۔ کیا اسے اب چٹخنی کو کھول دینا چاہیے؟ اگر وہ دروازے پر تالا لگائے رکھتی تو اس طرح، ان کے ہمسایوں کو کئی دنوں تک ان کی خودکشی کی اطلاع نہیں ہوسکتی تھی۔ ریکو اس بات کا مزہ نہیں لے سکتی تھی کہ دریافت ہونے تک دولاشیں یہاں پڑی سڑتی رہیں۔ بہرحال اس نے محسوس کیا کہ اسے کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔ اس نے چٹخنی ہٹائی اور اس نے دھند سے آلودہ دروازے کو ذرا سا کھلا رہنے دیا۔ فوراً ہی یخ ہوا کا ایک جھونکا اندر آ گیا۔ آدھی رات کے وقت باہر کسی فرد کا شائبہ تک نہ تھا اور مخالف سمت میں موجود بڑے سے گھر کے درختوں میں برف کی طرح ٹھنڈا چاند چمک رہا تھا۔ دروازے کو اسی حالت میں چھوڑ کر ریکو سیڑھیاں طے کر کے اوپر گئی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ادھر اُدھر پھرتی رہی، اب اس کی جرابوں میں پھسلن موجود نہیں تھی۔ اوپر آدھے راستے پر، اس کے نتھنوں سے ایک خاص قسم کی بو ٹکرائی۔

لیفٹیننٹ وہاں پڑا تھا، اس کا چہرہ خون کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی گردن کے آگے کی طرف نکلا ہوا حصہ، اب پہلے سے زیادہ نمایاں ہوا اٹھا تھا۔ ریکو بے دھیانی سے خون میں سے گزری۔ لیفٹیننٹ کی لاش کے پاس بیٹھتے ہوئے، اس نے اس کے چہرے کو، جو ایک گال کے رخ پر چٹائی پر پڑا تھا، ہمہ تن مصروفیت کے ساتھ دیکھا۔ لیفٹیننٹ کی آنکھیں اس طرح پوری کھلی ہوئی تھیں جیسے کسی چیز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہو۔ اس نے سر کو اٹھایا اور اپنی آستین سے، اس کے ہونٹوں کو صاف کیا اور ان کو چوما۔ تب وہ اٹھی اور اس نے الماری سے ایک نیا سفید کمبل اور ایک کمر کی ڈوری لی۔ اپنی سکرٹ کے بکھراؤ کو روکنے کے لیے۔ اس نے کمبل کو اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور اسے مضبوطی سے ڈوری کے ساتھ باندھ دیا۔

ریکو، لیفٹیننٹ کے جسم سے، ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اپنے لبادے سے خنجر نکال کر اس

نے اس کے چمکتے ہوئے پھل کا بغور معائنہ کیا اور اسے اپنی زبان کے قریب لے گئی۔ پالش شدہ سٹیل کسی قدر خوش ذائقہ تھا۔

ریکو نے سستی نہیں دکھائی۔ جب اس نے سوچا کہ کس طرح، اس سے پہلے اس کے مرنے والے شوہر اور اس کے درمیان ایک خلیج در آئی تھی، اور اب یہ خود اس کے تجربے کا ایک حصہ بننے والی تھی، اس کے سامنے بس اب ایک ہی لطف والی بات تھی کہ وہ اس قلمرو میں داخل ہونے والی تھی، جسے اس کے شوہر نے پہلے ہی سے، اپنے لیے چن لیا تھا۔ اس کے خاوند کے تکلیف اٹھائے ہوئے چہرے پر کچھ ایسا تھا، جسے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا اور جس کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اب وہ اس معمے کو حل کرے گی۔ اس کو احساس ہو گیا تھا کہ آخر کار وہ خود بھی اس عظیم اخلاقی اصول کی کڑواہٹ اور مٹھاس کے ذائقے کو محسوس کرنے کے قابل ہو گئی ہے، جس پر اس کے شوہر کو یقین تھا۔ جو ذائقہ اس نے اب تک چکھا تھا یہ موہوم سے انداز میں، اس کے شوہر کی مثال کے حوالے سے تھا۔ اب وہ خود اپنی زبان سے اس خوشبو کو چکھنے والی تھی۔

ریکو نے خنجر کے پھل کی نوک کو اپنے گلے کے نچلے حصے پر رکھا۔ اس نے شدت سے اسے گھونپا۔ زخم کم گہرا تھا۔ اس کے سر میں شعلہ سا بھڑکا اور اس کے ہاتھ بے اختیاری سے ہلے۔ اس نے پھل کو دونوں اطراف میں سختی سے کھینچا۔ ایک گرم مواد سے اس کا منہ بھر گیا اور اس کے سامنے کی ہر چیز سرخ ہو گئی اسے خون کا ایک فوارہ ابلتا دکھائی دیا۔ اس نے ساری طاقت کو مجتمع کیا اور پھل کی نوک کو اپنے گلے میں گہرائی تک ڈبو دیا۔

☆☆☆☆

وولف گانگ بروشر

رک جاؤ، زرافہ

وہ بڑے سے بھورے کا لک زدہ تنہا چاند ہال میں شور مچاتی ہوا اور رات جیسے خالی پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ رات کے وقت خالی اسٹیشن بے معنی اور معدوم ہوتے ہوئے زندگی کا اختتام لگتے ہیں۔ اور کالعدم، کالعدم، کالعدم، کالعدم۔ لیکن اگر تم اور آگے بڑھو تو تم کھو جاؤ گے۔

تب تم اپنا وجود کھو دو گے کیوں کہ اندھیرے کی ایک ہولناک آواز ہوتی ہے۔ تم اس سے بچ نہیں سکتے اور چشم زدن میں یہ تم پر حاوی ہو جائے گا۔ یہ تمھارے گزشتہ روز کیے گئے قتل کی یاد کے ساتھ حملہ کرتا ہے۔ اور وہ قتل جو ابھی تم کل کرو گے، اس کے پیشگی علم کے ساتھ تم پر دھاوا بولتا ہے۔ اور یہ تمھارے اندر ایک چیخ کو دباتا ہے۔ تنہا جانور جیسی نہ سنی جانے والی مچھلی کی چیخ، جو کہ خود اپنے سمندر سے مغلوب ہو گئی ہو۔ اور یہ چیخ دوسروں کو ڈرانے کے خطرے سے آگے لے جاتی ہے اور تمھارے چہرے کو پوری طرح سے چیر پھاڑ کر اس میں غار سا پیدا کر دیتی ہے۔ سوا اپنے ہی سمندر میں تنہا جانور کی چیخ، خوف زدہ کر دینے والے اندھیرے کی خاموشی ہے۔ اور یہ چٹان توڑ دینے والے دھمکی آمیز انداز اور سیاہ پروں والے سیلاب کی طرح تم پر چڑھ دوڑتا ہے اور جھاگ کی طرح شرارتی انداز سے پھنکارتا ہے۔

وہ دنیا کے آخری سرے پر کھڑا تھا۔ ٹھنڈے سفید محرابی لیمپ بے رحم تھے اور وہ ہر چیز کو غم ناک اور برہنہ کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے پیچھے ایک خوفناک اندھیرا پنپتا ہے۔ رات جیسے خالی پلیٹ فارموں کے سفید لیمپوں کے گرد اندھیرا اتنا سیاہ ہوتا ہے کہ کوئی سیاہی بھی اتنی کالی نہیں ہو سکتی۔

''میرے خیال میں تمھارے پاس سگریٹ ہیں۔'' ایک پیلے چہرے پر موجود سرخ منہ والی لڑکی نے کہا۔

''ہاں'' اس نے کہا، ''میرے پاس چند ایک ہیں۔''

''تو پھر تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟'' اس نے نزدیک آ کر سرگوشی کی۔

''نہیں'' اس نے کہا، ''کس لیے؟''

''تم نہیں جانتے کہ میں کس قماش کی ہوں۔''اس نے چاروں طرف سے سونگھا۔

''میں سمجھتا ہوں۔''اس نے جواب دیا:''تم بھی ان سب کی طرح ہی ہو''

''اے لمبو تم ایک زرافہ ہو،ایک ضدی زرافہ جیسے۔کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں کیسی لگتی ہوں، ہیں! بھوکی''،اس نے کہا:''ننگی اور تمھارے جسم پر نقش ونگار ہیں ان کی طرح۔''

''زرافے،تم لمبے اور گونگے ہو۔''وہ بے ہودہ انداز میں اس کے قریب ہوگئی۔''لیکن تم اچھے لگتے ہو،اور تمھارے پاس سگریٹ ہیں۔لڑکے بات کو سمجھو،یہ رات ہے۔''

تب اس نے اس کی طرف دیکھا۔ٹھیک ہے،وہ ہنسا۔''تم سگریٹ لے لو اور میں تمھارا بوسہ لیتا ہوں،لیکن اگر میں تمھارے لباس پر ہاتھ ڈال دوں تو پھر؟''

''تب میں شرما جاؤں گی۔''اس نے کہا۔

اس نے سوچا،اس کی ہنسی میں گنوار پن تھا۔

ایک مال گاڑی ماتمی انداز میں چیختی ہوئی اسٹیشن پر آئی۔اور زن سے گزر گئی۔اس کی کمبخت ٹمٹماتی ہوئی ٹیل لائٹ اپنی گھبراہٹ کو اندھیرے میں چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔دھماکا،ہُوک،توڑ پھوڑ، گڑگڑاہٹ اور رہ گئی۔تب وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔

پھر اس کے بعد ہاتھ،چہرے اور ہونٹ تھے۔لیکن اس کے خیال میں،ان سارے چہروں سے خون بہہ رہا تھا،ان کے منہ خون آلودہ تھے اور ان ہاتھوں میں دستی بم تھے۔لیکن تب اس کو میک اپ کا اندازہ ہوا اور عورت کے ہاتھ نے اس کے ہڈیالے بازو کو پکڑ لیا۔پھر ایک کراہ سنائی دی اور ایک اسٹیل کا بنا ہیلمٹ گرا اور ایک آنکھ پھوٹ گئی۔

''تم مر رہی ہو۔''وہ چیخا۔

''مر رہی ہوں۔''اس نے اسے ندیدوں کی طرح دیکھا۔''شاید کچھ ایسا ہی ہو۔''

تب اس نے ہیلمٹ پیچھے ماتھے کی طرف دھکیلا۔اس کے کالے بال ملائمت سے چمکے۔

''واہ تمھارے بال۔''وہ آہستگی سے بولا۔

''کیا تم رُکو گے؟''

''ہاں۔''

''زیادہ دیر تک؟''

"ہاں۔"

"ہمیشہ کے لیے؟"

"تمھارے بالوں سے گیلی شاخ جیسی خوشبو آتی ہے۔" وہ بولا۔

"ہمیشہ کے لیے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

اور تب قریبی فاصلے سے ایک موٹی اور عظیم چیخ ابھری۔ مچھلی چیخ، چمگادڑ چیخ، گوبر مکھی چیخ، ایک کبھی نہ سنی جانے والی انجن کی حیوانی چیخ۔ کیا اس چیخ سے پوری طرح ڈری ہوئی ٹرین، اپنے راستے پر چلتی ہوئی جھول رہی تھی؟ معدوم ہوتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ کے نیچے موجود نئی، انجانی پیلی سبز چیخ۔ کیا یہ چیخ سن کر ستارے کانپنے لگتے تھے؟

تب اس نے کھڑکی کو کھول دیا۔ اور اس طرح رات کے ٹھنڈے ہاتھوں نے اس کی ننگی چھاتیوں کو پکڑ لیا۔ اور اس نے کہا: "اب مجھے جانا چاہیے۔"

"زرافہ، رک جاؤ۔" اس کے پیلے چہرے پر اس کا پژمردہ سرخ منہ چمکا لیکن زرافہ بازگشتی آواز پیدا کرتے ہوئے کھوکھلے قدموں سے فٹ پاتھ پر چپکے سے چلتا گیا۔ اور اس کے پیچھے بھورے چاند جیسی گلی ایک بار پھر پتھرا دینے والی تنہائی میں جا گری۔ رینگنے والے جانور جیسی آنکھوں والی کھڑکیاں دودھیا دھند میں لپٹی، مردہ نظر آنے لگیں۔ نرمی سے ہلکورے لیتے، رازداری سے سانس لیتے پپوٹے اور پردے گہری نیند سو رہے ہیں۔ پیچھے گرتے ہوئے، سفید، نرم اور غمگین انداز میں اس کے پیچھے لہراتے ہوئے۔

شہر نے میاؤں میاؤں جیسی آواز نکالی اور عورت کا سینہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کے شیشے کے پیچھے بھی ایک سرخ چہرہ موجود تھا۔ زرافہ رو دیا۔

☆☆☆☆

میلان کنڈیرا

پرانے مُردوں کو نئے مُردوں کے لیے جگہ بنانی چاہیے

(۱)

وہ ایک چھوٹے سے چیک (Czeck) ٹاؤن کی اُس گلی میں موجود، اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا، جہاں وہ سالوں پہلے سے رہتا چلا آیا تھا۔ وہ کسی جوش کے بغیر اپنی زندگی، چغل خور ہمسایوں اور اپنے کام کے اوقات کے بے زار کن جھگڑوں میں گھرے ہونے کو یاد کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے بغیر (جیسے کہ کوئی سینکڑوں بار آڑا ترچھا ہو کر چل رہا ہو) اس کے قریب سے تقریباً گزر نے ہی والا تھا لیکن اس نے اسے دور ہی سے پہچان لیا تھا اور وہ اس کی طرف آتے ہوئے اسی اپنی نرم ادا سے مسکرا رہی تھی۔ عین اسی لمحے، جب وہ ایک دوسرے کے پاس سے تقریباً گزر رہی گئے تھے، اس مسکراہٹ نے اس کی یادوں میں ایک گھنٹی سی بجا دی اور اسے اس کی غنودگی سے اچک لیا۔

''میں شاید تمھیں پہچان نہیں سکا۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ لیکن یہ ایک احمقانہ معذرت تھی کیوں کہ اس عمل نے انھیں تیزی سے اس دردناک صورتِ حال کی طرف لوٹا دیا تھا، جس کی بنا پر، ان کا خاموش رہنا بہتر ہوتا۔ انھوں نے پچھلے پندرہ سال سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا اور اس دوران میں وہ دونوں عمر رسیدہ ہو گئے تھے۔ ''کیا میں بہت زیادہ بدل گئی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔ وہ بولا کہ نہیں ایسا نہیں تھا۔ اور حتیٰ کہ اگر یہ جھوٹ تھا تو بھی مکمل جھوٹ نہیں تھا کیوں کہ اس کی وہ نرم مسکراہٹ (جو کہ شرمگیں انداز کی دبی ہوئی ایسی مسکراہٹ تھی، جس میں ہمیشہ قائم رہنے والے جوش کی کشادگی موجود تھی) جو کئی سالوں کے فاصلے سے بغیر تبدیل ہوئے نمودار ہوئی تھی اور جس نے کہ اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس (مسکراہٹ) نے واضح طور پر اس سے پہلے جیسی مشابہت والی عورت کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا کہ اسے یقینی طور پر اس سے بے اعتنائی اختیار کرنا تھی اور اسے ایسے دیکھنا تھا جیسے کہ وہ آج دکھتی تھی۔ اب وہ تقریباً ایک بوڑھی عورت تھی۔

اس نے اسے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی تھی اور اسے کیا کام تھا۔ اس نے جواب دیا کہ اسے

اور کچھ نہیں کرنا تھا،سوائے اس کے کہ اس ٹرین کا انتظار کرے، جو شام کو اسے پراگ لے جانے والی تھی ۔اس نے اس غیر متوقع ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا اور کیوں کہ (ایک معقول وجہ کی بنا پر)انھوں نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ دونوں مقامی کینٹے گندے اور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے،اس لیے اس نے اسے اپنے اکیلے گھر میں، جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھا،آنے کی دعوت دی۔اس نے چائے اور کافی دونوں پیش کیں اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ ایک صاف ستھری اور پُرسکون ملاقات تھی۔

(۲)

آغاز ہی سے یہ ایک برا دن تھا۔ پچیس سال پہلے ایک نئی دلھن کے طور پر وہ یہاں تھوڑی سی مدت کے لیے رہتی رہی تھی ۔پھر وہ پراگ چلے آئے ۔ جہاں وہ دس سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔اسے اس کی ایک عجیب وغریب آخری وصیت کے تحت مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔اس وقت اس نے قبر کے لیے دس سال کی پیشگی لیز حاصل کی تھی لیکن چند دن پہلے وہ اسی بات سے ڈر گئی تھی کہ اس لیز کی مدت ختم ہو چکی تھی اور وہ اس کی تجدید کروانا بھول گئی تھی ۔سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ اس کے بارے میں قبرستان کی انتظامیہ کو لکھے،لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس معاملے میں حکام سے خط وکتابت کرنا کتنا بے معنی تھا اور وہ باہر نکل آئی ۔

وہ اپنی یادداشت کے بھروسے سے،اپنے خاوند کی قبر کی طرف جانے والے راستے کو جانتی تھی لیکن آج اچانک اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ قبرستان میں پہلی بار آئی ہو ۔وہ قبر کو نہ ڈھونڈ سکی اور اسے لگا جیسے وہ بھٹک گئی ہو۔اسے سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔وہاں جہاں کہ سنہری حروف سے مزین،اس کے خاوند کے نام والا خاکستری رنگ کا پتھر والا کتبہ تھا۔عین اس جگہ (اس نے یقینی انداز میں اردگرد موجود دو قبروں کو پہچان لیا تھا)اب ایک کالے رنگ کے سنگِ مرمر کا کتبہ ایک بالکل مختلف قسم کی ملمع زدہ لکھائی میں موجود تھا۔

پریشان سی ہو کر وہ قبرستان کی انتظامیہ کے پاس آئی ۔وہاں انھوں نے اسے بتایا کہ پٹوں کی مدت ختم ہو جانے پر قبروں کو معدوم کر دیا جاتا تھا۔اس نے ان پر الزام لگایا کہ انھوں نے اسے پٹے کی تجدید کے لیے کوئی ہدایت نہیں دی تھیں ۔انھوں نے جواب دیا کہ قبرستان میں جگہ کی کمی تھی اس لیے پرانے مُردوں کو نئے مُردوں کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے۔اسے غصہ آ گیا اور اس نے انھیں اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا کہ وہ انسان اور انسانیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ۔لیکن جلد ہی وہ سمجھ گئی کہ ان سے کچھ کہنا بے فائدہ تھا۔جیسے کہ وہ اپنے شوہر کی موت کو روک نہیں سکتی تھی ،اس لیے وہ اس کی اس

دوسری موت یعنی "پرانے آدمی کی موت" کے حوالے سے بھی بے کس ہی تھی کہ جس کی بنا پر وہ اب ایک مرے ہوئے آدمی کی حیثیت بھی کھو چکا تھا۔

وہ وہاں سے پلٹ آئی اور اس کی پریشانی جلد ہی اس کے غم میں گھل مل گئی۔ اس نے تصور کیا کہ کیسے وہ اپنی غفلت کا جواز پیش کر سکے گی۔ آخر کار تھکن اس پر غالب آ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ٹرین کی روانگی تک کے لمبے اوقات کو کیسے گزارے۔ وہ یہاں کسی کو نہیں جانتی تھی اور اسے کسی چیز نے جذباتی قسم کی چہل قدمی پر بھی نہیں ابھارا کیوں کہ وقت کی گزران نے شہر کو بہت حد تک تبدیل کر دیا تھا اور پہلے والی مانوس جگہیں اب اسے اجنبی لگ رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس پرانے واقف کار کی (جسے وہ تقریباً بھول چکی تھی) دعوت قبول کر لی تھی، جو اسے اتفاقاً مل گیا تھا۔ اس نے اس کے واش روم میں اپنے ہاتھ دھوئے اور نرم سی بازوؤں والی کرسی پر (اس کی ٹانگیں درد کر رہی تھیں) بیٹھ گئی۔ اس نے کمرے میں نگاہیں دوڑائیں اور پردے کے پیچھے، پانی کے ابلنے کی آواز سننے لگی، جس نے کہ کمرے سے کچن کے گوشے کو علاحدہ کر رکھا تھا۔

(۳)

اسے پینتیس سال کا ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور عین اسی وقت، اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے سر کے اوپری حصے کے بال کم ہوتے دکھائی دینے لگے ہیں۔ ابھی وہاں گنجا پن نمایاں نہیں ہوا تھا لیکن یہ ظاہر ہونا شروع ہو چکا تھا (بالوں کے نیچے کھوپڑی نظر آنے لگی تھی) اور زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں تھا کہ جب اسے یقینی طور پر ظاہر ہونا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ کم ہوتے یا گرتے بالوں کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنانا ایک مضحکہ خیز بات تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ گنجا پن، اس کے چہرے کو بدل دے گا اور اس کی اس وقت تک کی ظاہری جوانی، (اس سے انکار نہیں تھا کہ یہ بہترین تھی) اپنے اختتام کی طرف گامزن تھی۔

اب ان تاملات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ، کیسے ایک ایسے شخص کی، (بالوں والا) جس کی جوانی اب رخصت ہونے والی تھی، فرد میزان میں کیا کچھ تھا۔ یعنی اس نے کیا تجربہ حاصل کیا تھا اور کیا لطف اٹھایا تھا۔ جس چیز نے اسے حیران کیا وہ یہ تھی کہ اس نے تجربہ قدرے کم حاصل کیا تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو اسے گھبراہٹ ہوئی۔ ہاں وہ شرم سار ہوا کہ اس نے اس زمین پر اتنا لمبا عرصہ گزار کر اتنا کم تجربہ حاصل کیا تھا، یہ رسوائی کی بات تھی۔

جب اس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اس نے زیادہ تجربہ حاصل نہیں کیا تو اس سے اس کی مراد کیا تھی؟ کیا اس سے سفر، کام، پبلک سروس، کھیل اور عورتیں، جیسا مطلب نکلتا تھا۔ بے شک اس کا مطلب یہ تمام چیزیں ہی تھیں لیکن پھر بھی ان سب سے بڑھ کر عورتیں تھیں کیوں کہ اگر اسے زندگی کے دوسرے میدانوں میں کچھ کمی کا سامنا کرنا پڑا تھا تو یقیناً اس کے لیے پریشان کن بات تھی، لیکن وہ اس سب کا الزام خود پر نہیں دھرتا تھا، اس کام پر بھی نہیں جو کہ غیر دلچسپ اور کسی ترقی کے بغیر تھا، نہ ہی اپنے سفروں کو مختصر کرنے پر کیوں کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے، نہ ہی معتبر معرفتی حوالوں پر اور آخر میں حتیٰ کہ اس حقیقت پر بھی نہیں کہ جب وہ بیس سال کا تھا تو اس نے اپنا گھٹنا زخمی کر لیا تھا اور اس کی وجہ سے اسے اپنا وہ کھیل جس سے کہ وہ لطف اندوز ہوتا تھا، چھوڑنا پڑا تھا۔ دوسری طرف، عورتوں کی سلطنت اس کے لیے نسبتاً آزادی کا میدان تھا کہ ایسا ہونے پر وہ کوئی بہانے بازی نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں وہ اپنی دولت مندی کا مظاہرہ کر سکتا تھا کیوں کہ اس کے نزدیک زندگی کے ٹھوس پن کی یہ جائز کسوٹی تھی۔

چوں کہ قسمت بُری بھی ہو سکتی تھی، اس لیے، اس کے لیے عورتوں کے حوالے سے حالات کسی قدر بُرے ہی رہے۔ پچیس سال کی عمر تک (اگر چہ وہ ایک اچھی شکل والا شخص تھا) شرمیلے پن نے اسے دشواری میں مبتلا رکھا، پھر وہ محبت میں مبتلا ہو گیا، اس نے شادی کر لی اور سات سال بعد، اس نے خود کو راغب کیا کہ کسی ایک عورت میں نہ ختم ہونے والے عشق کی توقعات کو پانا ناممکن ہے۔ تب اس نے اسے طلاق دے دی اور ایک ہی عورت پر انحصار کرنے کا عذر (اور کہیں نہ ختم ہونے والا سراب) بہہ نکلا اور اس کی جگہ رضامندی پر مبنی ذوق کے حوالے سے عورت کے حصول میں ایک جرأت مندی (ان کا رنگا رنگ محدود حصول) کا عنصر در آیا۔ بدقسمتی سے اس کی بُری مالی حالت نے، اس کی نئی دریافت شدہ خواہشات کو ناکامی میں بدل دیا (اسے اس کی پہلی بیوی سے موجود اپنے بچے کے نان نفقے کے لیے ادائیگی کرنی ہوتی تھی، جس سے کہ سال میں ایک یا دو بار اسے ملنے کی اجازت تھی) اور اس چھوٹے سے قصبے میں ہمسایوں کی دوسروں کی ٹوہ لینے کی عادت اتنی زیادہ تھی کہ عورت کے انتخاب کے مواقع محدود تھے۔

وقت پہلے ہی بہت تیزی سے گزر رہا تھا اور دفعتاً وہ غسل خانے میں واش بیسن کے اوپر نصب گول آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے سر کے اوپر دائیں ہاتھ میں ایک گول آئینہ تھام رکھا تھا اور حواس باختہ سا ہو کر اپنے گنجے پن کے دھبے کا معائنہ کر رہا تھا جو کہ اب ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نظارے نے اچانک (جس کے لیے وہ تیار نہ تھا) یہ کھلا سچ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا کہ جو وہ کھو چکا

تھا،اسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا اس لیے اس نے خود کو ایک پرانی گندی مضحک صورتِ حال میں گھرا پایا اور حتیٰ کہ خودکشی کے لعنتی خیال میں بھی گرفتار پایا۔فطرتاً (اور اس پر زور دینا ضروری ہے کہ ہمیں اسے ایک ہسٹیریا کے مریض اور ایک احمق شخص کے طور پر نہیں لینا چاہیے) اس نے ان خیالات کے مزاحیہ پہلوؤں کو سراہا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی ان کو اپنی خودکشی پر منتج نہیں ہونے دے گا (وہ اندر ہی اندر اپنی اس خودکشی والی کیفیت پر ہنسا، میں اپنے اس گنجے پن کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا، خدا حافظ) لیکن یہ کافی ہے کہ اس کے ان خیالات نے چاہے یہ کتنے افلاطونی ہی کیوں نہ تھے۔اسے خوب لعنت ملامت کی۔ہمیں اس کے اندر پنپتے ان خیالات کو سمجھنا چاہیے کہ دوڑ کو درمیان میں ہی ترک کر دینے کی اس کی بھرپور خواہش کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس طرح وہ خود کو کسی ایسی میراتھن ریس میں شریک سمجھتا ہے، جس کے ٹریک کے درمیان میں پہنچ کر، اس پر کھلتا ہے کہ وہ نہایت شرمناک طور پر (اور خود اس کی اپنی غلطی بلکہ اپنی فاش غلطی کی بنا پر) ہار رہا ہے۔اور تب وہ اس کو ایک ہاری ہوئی ریس سمجھتے ہوئے مزید دوڑنا نہیں چاہتا۔

اور تب ایک چھوٹی میز پر جھکتے ہوئے، اس نے کاؤچ کے سامنے اس پر کافی کا پیالہ رکھا (اس کاؤچ پر وہ بعد میں بیٹھ بھی گیا) وہ دوسرا یعنی اس کا ملاقاتی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔اس نے اپنے آپ سے کہا حقیقت میں عجیب قسم کی بداندیشی ہے کہ وہ اس عورت سے مل رہا تھا کہ جس کی محبت میں وہ سر سے پاؤں تک گرفتار رہا تھا اور ان دنوں اس نے اس کو دور جانے دیا (اپنی ایک بہت بڑی غلطی کی وجہ سے) ٹھیک طور پر، یہ وہ وقت تھا کہ جب اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ تب کسی بھی چیز کو درست رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔

(۴)

وہ بہ مشکل یہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ اس کے سامنے ایسی عورت کے طور پر موجود تھی، جس نے اس سے فرار حاصل کیا تھا اور وہ ہر وقت اس رات کے بارے میں آگاہ رہی تھی، جو انھوں نے اکٹھے گزری تھی۔وہ جانتی تھی کہ تب وہ کیسا دکھتا تھا۔(وہ بیس سال کا تھا،اسے لباس پہننا نہیں آتا تھا، وہ شرما جاتا تھا اور وہ اس کی طفلانہ حرکتوں سے محظوظ ہوتی تھی) اور اسے خود اپنے متعلق بھی یاد تھا۔(وہ پینتیس سال کی تھی اور خوب صورتی کو پانے کی ایک مخصوص خواہش اسے دوسرے مردوں کی باہوں میں لے جاتی تھی لیکن عین اسی وقت یہ اسے ان سے دور بھی لے جاتی تھی۔اس نے ہمیشہ یہ تصور کیا کہ وہ ایک خوب صورت گیند کی طرح تھی اور اسے ڈر تھا کہ اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی کہیں اسے ایک بھدی عادت میں نہ بدل دے۔)

ہاں وہ خوب صورتی کو اپنے لیے مشیتِ الٰہی سمجھتی تھی ،جیسے کہ لوگ اپنے لیے اخلاقی فرمودات کو سمجھتے تھے ۔اگر اس نے اپنی زندگی میں کوئی بدصورتی دیکھی ہوتی تو شاید وہ مایوس ہوگئی ہوتی اور کیوں کہ وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ پندرہ سال بعد اپنے میز بان کے نزدیک بوڑھی لگ رہی ہوگی (اس تمام بدصورتی کے ساتھ جو کہ اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی تھی)، وہ جلدی سے اپنے چہرے کے سامنے ایک تصوراتی پنکھا کھول لینا چاہتی تھی اور اس مقصد سے،اس نے اسے اپنے جلدی سے کیے گئے ،سوالات میں ڈبو دیا ۔اس نے اس سے پوچھا کہ اس کا اس قصبے میں کیسے آنا ہوا تھا ۔اس نے اس کے کام کے بارے میں پوچھا ۔اس نے اس کے بیچلر اپارٹمنٹ میں موجود آرام کو سراہا اور کھڑکی میں سے قصبے کے مکانوں کی چھتوں سے نظر آنے والے نظارے کی تعریف کی ۔(اس نے کہا یہ کوئی خصوصی نظارہ نہیں تھا لیکن وہاں ایک کھلا پن تھا اور آزادی تھی)اس نے تاثریت پسند مصوروں کی فریم شدہ خصوصی تصویروں کی نقلوں کے اصلی مصوروں کے نام لیے (ایسا کچھ غریب چیک دانشوروں کے لیے عام سی بات تھی ۔ آپ ایسے گھٹیا پرنٹ آسانی سے ان کے پاس دیکھ سکتے تھے ۔) تب وہ کافی کے اس کپ کو ہاتھ میں لیے ہوئے اٹھی جو کہ ابھی اس نے پورا نہیں پیا تھا اور وہ اس رائٹنگ ڈیسک پر جھک گئی جس پر چند فوٹو ایک سٹینڈ میں رکھے تھے (اس سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی کہ وہاں کسی نوجوان عورت کی فوٹو نہیں تھی)،اور اس نے پوچھا کہ ان میں ایک بوڑھی نظر آنے والی تصویر کیا اس کی والدہ کی تھی ۔مرد نے اس کی تصدیق کی ۔

تب اس نے پوچھا کہ جب اس نے کہا تھا وہ یہاں کچھ ''معاملات'' کونمٹانے آئی تھی تو اس سے اُس کی کیا مراد تھی ۔حقیقتاً وہ قبرستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی (اس پانچویں فلور پر نہ صرف وہ اپنے آپ کو چھتوں سے بہت اونچا محسوس کرتی تھی ،بل کہ خوش کن طور پر اپنی زندگی بھی اوپر سمجھتی تھی)۔جب اس نے اصرار کیا تو اس نے تسلیم کیا (لیکن نہایت اختصار کے ساتھ، کیوں کہ بے باک قسم کی فوری صاف گوئی ہمیشہ ہی اس کے لیے اجنبی سی رہتی تھی) کہ وہ بہت سالوں پہلے ادھر ہی رہتی تھی اور یہ کہ اس کا خاوند یہیں پر دفن تھا (وہ قبر کی منسوخی کے معاملے میں خاموش رہی تھی)اور یہ کہ پچھلے دس سالوں میں ہر یومِ ارواح کے موقع پر وہ اور اس کا بیٹا یہاں آتے رہتے تھے ۔

(۵)

''ہر سال؟''اس بیان نے اسے اداس کر دیا اور ایک بار پھر اس نے سوچا کہ ایک کینہ پرور دھوکا اس کے ساتھ کیا جاتا رہا تھا۔ جب وہ چھ سال پہلے آیا تھا تو اگر اس وقت وہ اس سے مل لیتا تو شاید اس کے لیے

ہر چیز کو بچانا ممکن ہوتا۔تب اس پر عمر کی یہ چھاپ نہ ہوتی اور اس کے ظاہر کا یہ تاثر اس عورت سے مختلف نہ ہوتا، جس سے اس نے پندرہ سال پہلے محبت کی تھی۔(ماضی اور حال)اس بعد کو پاٹنا یا محسوس کرنا اس کے اختیار میں بالکل ایک جیسا ہوتا لیکن اب وہ ایک مایوسانہ انداز میں ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتے ہیں۔

اس نے اپنی کافی پی لی تو باتیں کرنے لگی۔اس نے اس بدلے ہوئے رویے کا بالکل صحیح طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے وہ اب دوسری بار اس سے گریز کر رہی تھی۔اس کے چہرے پر جھریاں تھیں (جن کو اس نے پاؤڈر کی تہہ کے نیچے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی)اس کی گردن پر بھی جھریاں تھیں (اونچا کالر بھی انھیں چھپانے سے قاصر تھا)۔اس کے گال بھی ڈھلکے ہوئے سے لگتے تھے۔اس کے بال (لیکن یہ پھر بھی خوب صورت ہی لگتے تھے)خاکستری سے ہو رہے تھے۔تاہم اس کی توجہ زیادہ تر اس کے ہاتھوں نے اپنی طرف مبذول رکھی، (بدقسمتی سے ہاتھوں کو پاؤڈر کی تہہ یا کسی اور قسم کے میک اپ کے عمل سے چھپانا ناممکن تھا) جن پر نیلی رگوں کے گچھے یوں ابھرے ہوئے تھے کہ وہ کسی مرد کے ہاتھ لگ رہے تھے۔

اس کے اندر رحم اور غصے کے ملے جلے جذبات ابھرے اور اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ایک مدت سے ملتوی ہوتی ہوئی، ان کی اس ملاقات کو شراب میں ڈوبتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔اس نے اس سے پوچھا کیا وہ کونیاک (ایک قسم کی فرانسیسی شراب) میں کچھ دلچسپی رکھتی ہے۔(پردے کے پیچھے موجود الماری میں، اس کے پاس ایک کھلی بوتل رکھی ہوئی تھی۔)اس نے اسے جواب دیا کہ نہیں اور اسے یاد آیا: سالوں پہلے بھی وہ شراب بالکل نہیں پیتی تھی کہ کہیں شراب اس سے توقع کیے جانے والے، اچھے آداب اور دوسروں کے ساتھ اچھے سلوک کو بدل کر نہ رکھ دے۔اور جب اس نے اس کے ہاتھ کی اس موہوم حرکت کو دیکھا، جس کے ذریعے اس نے کونیاک کی پیش کش کو ٹھکرایا تھا، تو اس نے محسوس کیا کہ وہ حسن و جمال، جادو اور وقار جو اسے محظوظ کیا کرتا تھا، اس میں ویسے کا ویسا موجود تھا۔ اگرچہ وہ اب بڑھاپے کے نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور وہ ابھی تک من موہنا تھا، حالاں کہ وہ خود اس سے دوگنا طور پر دور جا چکا تھا۔

جب اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے اس سے دور ہو چکی تھی تو اسے وہ بہت قابلِ رحم محسوس ہوئی اور اس رحم نے، اسے، اس کے نزدیک کر دیا (وہ عورت جو کبھی اتنی خیرہ کن شخصیت کی مالک تھی کہ اس کے سامنے وہ گنگ ہو جاتا تھا)اور وہ اس کے ساتھ لمبی گفتگو کرنا چاہتا تھا اور

اس شخص کی طرح، اپنی گرل فرینڈ سے باتیں کرنا چاہتا تھا، جو اپنے آپ کو پست محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بات شروع کی (اور یہ بے شک ایک لمبی گفتگو میں بدل گئی) اور آخر کار، اسے ناامیدی کے ان خیالات تک لے گئی، جو بعد میں اسے درپیش رہے تھے۔ فطری طور پر، وہ اس گنجے پن سے متعلق خاموش رہا جو کہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا (یہ ایسے ہی تھا جیسے کہ اس (عورت) نے قبر کی منسوخی کے متعلق اختیار کر رکھی تھی)۔ دوسری طرف، گنجے پن کی جگہ کے نظارے نے ظاہراً اس فلسفیانہ مقولے کے اثر کے تحت ایسی قلبِ ماہیت کی صورت اختیار کر لی تھی کہ آدمی، جس انداز سے زندہ رہتا ہے، وقت اس سے زیادہ تیزی سے گزرتا ہے اور یہ کہ زندگی بھیانک ہے کیوں کہ اس کی ہر چیز لازمی طور پر اپنے انجام کی طرف گامزن رہتی ہے۔ اس نے ایسے ہی مقولوں کے متعلق صدا بلند کی، جن کے بارے میں وہ ہمدردانہ جواب کا منتظر تھا لیکن وہ اسے نہیں ملا۔

''میں اس طرح کی گفتگو پسند نہیں کرتی۔'' اس نے تقریباً جوشیلے انداز میں کہا: ''جو کچھ تم اب تک کہتے رہے ہو خوف ناک حد تک سطحی ہے۔''

(۲)

وہ عمر کے زیادہ ہو جانے یا مرنے کے متعلق باتیں پسند نہیں کرتی تھی کیوں کہ یہ جسمانی بدصورتی کے تصور کی حامل ہوتی تھیں اور اسے ناگوار گزرتی تھیں۔ کئی مواقع پر، مضطرب ہوتے ہوئے، اس نے اپنے میزبان کو بار بار کہا کہ اس کا نقطۂ نظر سطحی تھا۔ بہ ہر حال، اس نے کہا کہ انسان محض ایک جسم ہونے سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے جو کہ ضائع ہو جاتا ہے، ایک شخص کا کام ہی حقیقت رکھتا ہے اور یہی وہ اپنے پیچھے دوسروں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اپنے اس خیال کی تائید، اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی اور یہ خیال سب سے پہلے اسے، آج سے پچیس سال پہلے اس وقت آیا تھا، جب اس نے اپنے سابقہ شوہر سے محبت کی تھی، جو کہ اس سے انیس سال بڑا تھا۔ اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کی عزت کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ (اس کی بے وفائیوں کے باوجود کہ جن کے متعلق وہ یا تو جانتا ہی نہ تھا یا پھر وہ جاننا ہی نہ چاہتا تھا) اور وہ اپنے آپ کو قائل کرنے کا جتن کرتی تھی کہ اس کے شوہر کی دانش اور اہمیت اس کے ماہ وسال کے بھاری بوجھ کو مکمل طور پر ختم کر دے گی۔

''کس قسم کا کام، میں تم سے پوچھتا ہوں؟ کس قسم کا کام ہم اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتے ہیں؟'' ایک تکلیف دہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے میزبان نے احتجاج کیا۔

وہ اپنے مرے ہوئے شوہر کا ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی ،اگر چہ اس چیز کی پائے داری پر پکا یقین رکھتی تھی ،جس کی ،اس کے شوہر نے تکمیل کر لی تھی ۔اس لیے اس نے صرف اتنا کہا کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتا ہے، جو کہ بجائے خود بہت معمولی ہو سکتا ہے، لیکن اس میں صرف اور صرف اس کی اہمیت ہی مدِنظر ہوتی ہے ۔ پھر وہ اپنی ذات کے متعلق باتیں کرنے لگی کہ کیسے وہ پراگ کے نواح میں ایک ثقافتی مرکز میں کام کرتی رہی تھی اور کیسے اس نے پوئٹری ریڈنگ اور لیکچرز کا اہتمام کیا تھا۔اس نے (ایسے جوش کے ساتھ، جو اس کے "میزبان کے لیے" غیر مناسب معلوم ہوتا تھا) لوگوں کے "شکر گزار چہروں کے متعلق" بات کی اور اس کے فوراً بعد اس نے تفصیل سے بیان کیا کہ ایک بیٹے کو پانا کتنا خوب صورت عمل تھا اور پھر اپنے خدوخال کو دیکھنا جو کہ ایک مرد کے (اس کا بیٹا بالکل اسی کی طرح دکھائی دیتا تھا) چہرے میں ڈھل گئے تھے اور یہ کہ ایک بیٹے کو ایک ماں سب کچھ دے سکتی ہے ۔ یہ کتنی خوب صورت بات تھی اور پھر اسی ماں کا اپنی زندگی کے گوشۂ گمنامی میں چلے جانا ۔

یہ کوئی اتفاقیہ عمل نہیں تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کے متعلق باتیں کرنا شروع کر دی تھیں ۔ یہ اس لیے تھا کہ اس کا بیٹا سارا دن اس کے خیالوں میں رہا تھا ۔ یہ قبرستان میں اس کی آج کی ناکامی کی علامتی یادآوری کی بنا پر تھا ۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس نے کسی مرد کو اپنے اوپر ،اپنی مرضی تھوپنے نہیں دی تھی لیکن اس کے اپنے بیٹے نے اسے مغلوب کر لیا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ کیسے قبرستان میں ،اس کی ناکامی نے آج اسے سب سے بڑھ کر اتنا برہم کر دیا تھا کہ وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی اور اسے ڈر تھا کہ وہ اسے لعن طعن کرے گا ۔ بے شک اسے بہت پہلے سے شبہ تھا کہ اس کا بیٹا اپنے باپ کی یادوں کو، جن کی ،اس کی ماں قدر کرتی تھی، شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا (بہر حال یہ وہی تھا ،جس نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ انھیں کسی بھی یومِ ارواح پر قبرستان آنا نہیں بھولنا چاہیے)اور یہ عمل زیادہ تر اس کے مرے ہوئے باپ کی محبت کی وجہ سے اتنا نہیں تھا جتنا کہ اس کی ماں کی ،ان خواہشوں کو ضبط کرنے کی وجہ سے تھا، جو ایک بیوہ کے لیے ایک مناسب حد تفویض کرتی تھیں ۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جس کے متعلق اس نے کبھی کچھ کہا نہیں تھا اور اس نے (بغیر کامیابی کے)اسے جاننے کی کوشش نہیں کی ، یہ خیال کہ اس کی ماں اب بھی جنسی زندگی کی حامل ہو سکتی ہے، اسے متنفر کرتا تھا ۔ وہ ہر چیز ، جو اس میں جنسی حوالے سے موجود تھی (کم سے کم وہ جو ممکنات اور مواقع کی شکل میں موجود تھی) وہ اس کے لیے کراہت آمیز تھی ۔اس کے نزدیک جنس کا خیال جوانی کے خیالات سے منسلک تھا ۔ وہ ہر اس بات کو ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا جو ابھی تک اس میں جوانی

کے حوالے سے موجود تھی۔ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا اور اس کی ماں کی جوانی (یہ اس کی مادرانہ نگہداشت کی سختی سے مشترک تھی) غیر رضامندانہ طور پر اس کے لڑکیوں کے ساتھ تعلقات میں مزاحم تھی، جنھوں نے اب اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی اسی پرانی ماں کو پانا چاہتا تھا۔ اپنی ایسی ہی ماں کے پیار ومحبت کے اقدام کو کیا وہ سراہے گا اور کیا ایسی ہی ماں کو وہ پسند کرے گا۔ اور بعض اوقات اس نے محسوس کیا کہ اس طرح وہ اسے قبر کی طرف دھکیل رہا تھا۔ بالآخر اس نے اس کے آگے ہار مان لی (اس کے دباؤ کی تاب نہ لاتے ہوئے) اور یہ کہ اس نے مشروط انداز میں مطیع ہو جانے کا تصور کیا کہ اب صحیح معنوں میں اس کی زندگی کی خوب صورتی، خاموشی سے ایک دوسری زندگی کے سائے میں ڈھل جانے پر مشتمل تھی۔ اس تصور کے نام پر (جس کے بغیر، اس کے چہرے کی جھریوں نے بہر حال اسے کہیں زیادہ بے سکون کر دیا ہوتا) اس نے ایک غیر متوقع گرم جوشی کے ساتھ، اس جھگڑے کو اپنے میزبان کے ساتھ حل کرنے کا اہتمام کیا۔

لیکن وہ اچانک اس چھوٹی سی میز پر، جو ان کے درمیا حائل تھی، جھک گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھپکا اور کہا: ''میں اپنی بک بک پر معافی چاہتا ہوں۔ تم جانتی ہو۔ میں ہمیشہ سے احمق ہی رہا ہوں۔''

(۷)

اس جھگڑے نے اسے مشتعل نہیں کیا جب کہ اس کے برعکس اس سے ملنے والی نے، اس کے متعلق اپنی شناخت کی دوبارہ سے تصدیق کی۔ اس کی قنوطی گفتگو کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے (سب سے بڑھ کر، یہ کہ یہ بُرے ذوق اور بدصورتی کے خلاف احتجاج نہیں تھا) اس نے تسلیم کیا کہ وہ ایک ایسا فرد تھا، جس کو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ پس اس کی سابقہ ظاہری صورت اور ان کی پرانی کہانی نے اس کے خیالات کو زیادہ سے زیادہ دلبریز کر دیا۔ اب وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ دوستانہ موڈ، جو ان کی گفتگو کے لیے موافق تھا، تباہ نہ ہو (اس لیے، اس نے اس کے ہاتھ کو تھپکا اور اپنے آپ کو ایک احمق کہا تھا) اور وہ اسے اس چیز کے متعلق بتانا چاہتا تھا، جو اس وقت اسے سب سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی یعنی ان کی مشترکہ بات۔ کیوں کہ وہ اس بات کا قائل تھا کہ اس کے ساتھ تعلق میں اس کے تجربے میں ایک بہت خاص چیز آ گئی تھی۔ جس پر وہ شک نہیں کر سکتی تھی اور جس کو وہ اکیلا ہی (اگر وہ کوشش کرے تو) الفاظ کی شکل میں ڈھال سکتا تھا۔

اسے اب یاد نہیں تھا کہ وہ کب ملے تھے۔ ظاہری طور پر، وہ بعض اوقات اس کے طالب علم

دوستوں کے توسط سے ملتی تھی، لیکن اسے صحیح طور پر، پراگ کا وہ راستے سے ہٹ کر موجود کیفے یاد تھا جہاں، وہ پہلے پہل اکیلے میں باہم ملے تھے۔ وہ اس کے سامنے ایک مخملی وضع والے بُوتھ میں بیٹھا تھا، وہ اداس اور خاموش تھا، لیکن ساتھ ہی وہ اس کے اپنے متعلق موافق رویے پر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل یہ تصور کرنے کی کوشش کی (ان خیالات کو پورا کرنے کی امید کی جرأت کے بغیر) کہ جب وہ اسے چومے گا، اسے بے لباس کرے گا اور اس کے ساتھ محبت کے عمل میں مصروف ہوگا تو وہ اسے کیسی لگے گی؟ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔ ہاں وہاں پر کچھ عجیب سا تاثر تھا۔ وہ متواتر اسے خاموشی اور شرافت سے دیکھے جا رہی تھی۔ اور وہ (حتیٰ کہ اس کی مستقل مزاجی کے ساتھ کی گئی کوششوں کے ساتھ) جسمانی وارفتگی کے ظاہری پن کو مسخ کر رہا تھا۔ عورت نے مکمل طور پر اس کے تصور کا دفاع کیا۔

اور یہ وہ صورتِ حال تھی جو اس کی زندگی میں دہرائی نہیں گئی تھی۔ اس موقع پر وہ بے تصوری کے آمنے سامنے موجود تھا۔ ظاہراً وہ ایک ایسے مختصر وقت سے گزر رہا تھا (ایک جنتی وقت) جب تصور کے تجربے سے سیر نہیں ہوا جا سکتا، اس نے ایک روٹین اختیار نہیں کی تھی، وہ بہت کم جانتا ہے لیکن یہ جانتا ہے کہ اس تھوڑے کو کیسے کرنا ہے کہ لاتصوریت اب بھی وجود رکھتی ہے اور اس قیاس کو حقیقت میں تبدیل ہونا چاہیے (تصورات کی کمی کے بغیر، قیاسات پر غور کے بغیر) ایک شخص خوف اور سر کے چکر میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ یہ سر کا چکر حقیقتاً اس پر حاوی ہو سکتا ہے جب کہ آئندہ کی کئی ملاقاتوں کے بعد، جن کے دوران میں اس نے کچھ بھی حل نہ کیا۔ اس نے اس تفصیل کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں موجود سٹوڈنٹ روم کے متعلق مبنی بر مطلب تجسس کے ساتھ پوچھا کیوں کہ جلد ہی وہ اسے خود کو وہاں مدعو کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

وہ اس خواب گاہ میں ایک طالب علم کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے کا حصے دار تھا، جس نے رم کے ایک گلاس کے عوض آدھی رات کے بعد تک واپس نہ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ آج اس کے بیچلر اپارٹمنٹ سے تھوڑی مماثلت رکھتا تھا۔ وہاں پر دو دھاتی چارپائیاں، دو کرسیاں، ایک الماری، ایک لیمپ دار شیڈ کے بغیر روشنی والا بلب اور ایک خوف میں مبتلا کرنے والی بے ترتیبی تھی۔ اس نے کمرے کی صفائی کی اور سات بجے (یہ اس کی شائستگی تھی کہ وہ حسبِ عادت وقت پر پہنچی تھی) اس نے دروازے پر دستک دی۔ یہ ستمبر کا مہینہ تھا اور بتدریج اندھیرا ہونا شروع ہوا تھا۔ وہ ایک چارپائی کے کنارے پر ٹک گئے اور انھوں نے ایک دوسرے کو چوما۔ تب اندھیرا کچھ مزید بڑھ گیا اور وہ کمرے میں روشنی کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہ خوش تھا کہ اسے دیکھا جا سکتا تھا اور اسے امید تھی کہ اندھیرا اسے اس گھبراہٹ سے بچا لے گا

جو کہ اسے، اس کے سامنے بے لباس ہونے کی وجہ سے ہو سکتی تھی۔ (اگر وہ جانتا ہوتا کہ کس طرح عورت کے بلاؤز کے بٹن کو کھولا جا سکتا تھا تو ایسے میں جز وی طور پر جلد بازی سے وہ خود کو بھی لباس سے آزاد کر سکتا تھا) اس لمحے بہر حال اس نے اس کا پہلا بٹن کھولنے کی کافی دیر تک جرأت نہ کی تو اس کو ایسے لگا جیسے لباس کو خود سے جدا کرنے کے شروعاتی معاملے کا طریقہ کار، کسی قدر ذوق سے پُر اور شاندار ہونا چاہیے اور اس کے متعلق وہی مرد جانتے تھے، جو تجربہ کار تھے اور وہ اپنی لاعلمی کی بنا پر ناکام ہونے سے ڈرتا تھا کہ کہیں آخر میں وہ خود ہی کھڑے ہو کر نہ کہہ دے: ''کیا مجھے اس زرہ بکتر کو اتارنہیں دینا چاہیے؟'' اس نے بے لباس ہونا شروع کیا، اس وقت اندھیرا تھا، تاہم، اس نے صرف اس کی حرکات کے سایوں کو دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے خود کو بھی بے لباس کیا اور کسی حد تک، اس وقت اعتماد (یہ اس عورت کے صبر کی وجہ سے تھا) حاصل کیا، جب انھوں نے محبت کے عمل میں خود کو مصروف کر لیا تھا۔ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن اندھیرے میں اس کے اظہار کے دھندلے پن نے اس سے مکمل طور پر گریز پائی اختیار کی اور حتیٰ کہ وہ اس کے خدوخال کو بھی کوئی شکل نہ دے سکا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس وقت اندھیرا تھا لیکن یہ ناممکن محسوس ہوا کہ وہ اس کے پاس سے اٹھ کر دروازے کے قریب نصب بجلی کے سوئچ کو آن کرے۔ پس وہ بے سود طور پر اپنی آنکھوں پر بوجھ ڈالتا رہا لیکن وہ اسے نہ پہچان سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی اور سے، کسی نقلی وجود سے، کسی بالکل غیر حقیقی اور غیر وجودی، وجود سے محبت کرنے کے عمل میں مصروف رہا تھا۔

تب وہ اس کے اوپر آ گئی (عین اس وقت ہی اس نے اس کے اونچے سائے کو دیکھا) اور اس نے اپنے کولہے کو گھماتے ہوئے دبے لہجے میں، سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔ اور یہ واضح نہ تھا کہ وہ اپنے آپ سے کچھ کہہ رہی تھی یا اس سے کوئی بات کر رہی تھی۔ وہ الفاظ کو نہ سمجھ سکا اور نہ یہ اس نے، اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ وہ اس سے دوبارہ بغل گیر ہوا تو وہ مسلسل سرگوشیاں کرتی رہی تھی۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

(۸)

وہ اپنے میزبان کو سنتی رہی اور ان تمام تفاصیل میں ڈوبی رہی جن کو وہ ایک عرصے سے بھلا چکی تھی؛ مثال کے طور پر، وہ ان دنوں ایک زرد نیلا سمر سوٹ پہنا کرتی تھی، جس میں لوگوں کے نزدیک وہ ایک لازوال فرشتہ لگتی تھی (ہاں، اس کو وہ سوٹ یاد آ گیا)۔ وہ اپنے بالوں میں ایک بڑی سی ہاتھی

دانت کی بنی ہوئی کنگھی اٹکائے رکھتی تھی جو لوگوں کے نزدیک اسے پرانے فیشن کی رعب دار چھب مہیا کرتی تھی ۔ کینٹے میں وہ ہمیشہ چائے کے ساتھ رَم کا آرڈر دیتی تھی (یہ اس کا واحد الکحلک متبادل تھا) اور یہ خیالات اسے خوش گوار طریقے سے قبرستان سے دور لے گئے، اس کے دکھتے ہوئے پاؤں اور اس بیٹے کی ملامت بھری آنکھوں سے بھی دور لے گئے ۔اس نے سوچا، اس کے ذہن میں چمک سی پیدا ہوئی، اس کو مدِنظر رکھے بغیر کہ آج وہ کیا تھی ۔اگر اس کی جوانی کا تھوڑا سا حصہ بھی اس شخص میں ابھی تک قائم ہے تو اس نے بے سود زندگی نہیں گزاری تھی ۔فوری طور پر اس کے اثبات کی دوبارہ تائید کے طور پر ایک خیال اس کے ذہن میں آیا کہ ایک آدمی کی قدر و قیمت اس میں ہے کہ وہ کہاں تک اپنی قابلیت خود اپنی ذات سے آگے بڑھا سکتا ہے، وہ کہاں تک اپنی حد سے باہر جا سکتا ہے اور وہ کہاں تک اپنے وجود کو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے برقرار رکھ سکتا ہے ۔

اس نے اسے سنا اور وقتاً فوقتاً اس نے، اس کے ہاتھ کو تھپکا تو اس نے اسے ایسا کرنے سے نہیں روکا ۔یہ تھپکنا گفتگو کے سکون دینے والے انداز میں مدغم ہو گیا اور اس کے متعلق ایک لامحدود ضبط میں ڈھل گیا ۔(یہ اشارہ کس کی طرف تھا) عورت کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس کے متعلق بات کر رہا تھا اور کس کو وہ کچھ کہہ رہا تھا ۔بہر حال وہ اس آدمی کو پسند کرتی تھی، جو اس کی ناز برداری کر رہا تھا، حتیٰ کہ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ اسے، اس کے پندرہ سال پہلے کی جوانی سے زیادہ بہتر طور پر پسند کرتی ہے ۔جس کا لڑکپن اگر اسے صحیح طور پر یاد تھا تو وہ کسی حد تک تکلیف دہ تھا ۔

جب وہ اپنے حساب سے، اس مقام تک جا پہنچا، جہاں اس کا متحرک سایہ اس کے اوپر اٹھا ہوا تھا اور اس نے اس کی سرگوشی کو سمجھنے کی ناکام کوشش کی تھی، تو ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گیا اور (احمقانہ طور پر جب وہ الفاظ کو جان لے گا تو کئی سالوں کے بعد انھیں ایک بھولے ہوئے راز کی طرح اسے یاد دلائے گا) اس نے نرمی سے پوچھا: ''اور تب میں کیا کہہ رہی تھی؟''

(۹)

''مجھے نہیں معلوم ۔'' اس نے جواب دیا ۔وہ نہیں جانتا تھا ۔اس لمحے اس نے نہ صرف یہ کہ اس کے تصورات سے بچنے کی کوشش کی تھی بل کہ اس کے ادراک سے بھی گریز کیا، اس نے اس کی آواز اور شکل کو دیکھنے سے بھی گریز کیا ۔جب اس نے خواب گاہ کا سوئچ دبا کر روشنی کی تو وہ پہلے ہی لباس پہن چکی تھی ۔اس سے متعلق ہر چیز ایک بار پھر چمکیلی، خیرہ کُن اور مکمل تھی اور اس نے بے سود طور پر روشنی میں

موجود اس کے چہرے اور اندھیرے میں موجود، اس کے چہرے کے درمیان فرق کرنے کی کوشش کی۔ وہ ابھی جدا نہیں ہوئے تھے لیکن اس نے اسے ابھی سے یاد کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس نے قیاس کرنا شروع کیا کہ اس کا (دکھائی دینے والا) چہرہ اور (دکھائی نہ دینے والا) جسم کیسے دکھتا ہوگا جب کہ وہ آپس میں کچھ دیر پہلے محبت میں الجھے ہوئے تھے لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اب بھی اس کے تصور کو دماغ میں نہیں لا رہی تھی۔

اس نے ارادہ کیا کہ اُسے، اگلی بار روشنی میں، اس کے ساتھ محبت کرنی چاہیے۔ لیکن وہاں اگلی بار تھی ہی نہیں۔ اس دن کے بعد سے عورت نے چالاکی اور فراست سے اسے نظر انداز کیا۔ وہ بالکل ناکام رہا لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ کیوں۔ انھوں نے یقینی طور پر خوب صورتی سے محبت کی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے یہ کام تقریباً ناممکن ہی تھا اور اسے اس پر شرمندگی تھی۔ وہ اب اس کی نظر اندازی کے حوالے سے خود کو مسترد شدہ سمجھ رہا تھا اور اس نے اس کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

''مجھے بتاؤ کہ اس وقت تم نے مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''میں تم سے معذرت چاہتی ہوں۔'' اس نے نرم ترین لہجے میں کہا: ''یہ سب کچھ اتنا عرصہ پہلے وقوع پذیر ہوا تھا کہ میں نہیں جانتی۔ اور جب اس نے، اس پر مزید دباؤ ڈالا تو اس نے احتجاجاً کہا: ''ہمیں ہمیشہ ماضی میں واپس نہیں جانا چاہیے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ ہم کو اپنی مرضی کے بغیر اتنا بہت سا وقت قربان کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے ایسا صرف اس کی ضد کو پورا کرنے کے لیے کہا۔ (اور شاید اس کی قبرستان والی صبح کی ملاقات کے حوالے سے ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ اس کا ادا کیا گیا یہ آخری جملہ تھا) لیکن اس نے اس کے بیان کو مختلف انداز سے سمجھا۔ اس کے لیے یہ حقیقت ایک شدید اور بامقصد وضاحت کے طور پر (یہ ظاہری چیز) تھی کہ یہ دو عورتیں نہیں تھیں (ایک ماضی اور ایک حال کی) بل کہ یہ صرف ایک تھی اور وہی عورت تھی اور جس نے، اسے آج سے پندرہ سال پہلے نظر انداز کیا تھا وہ اب یہاں موجود تھی اور اس سے ایک ہاتھ کی دوری پر تھی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ حال زیادہ اہم ہے۔'' اس نے ایک بامعنی انداز میں کہا اور دل و جان سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے ادھ کھلے منہ کے ساتھ مسکرا رہی تھی اور اس نے اس کے دانتوں کی جھلک دیکھی۔ عین اس وقت ایک یاد، اس کے ذہن میں در آئی، جب خواب گاہ میں اس نے اپنی انگلیاں اس کے منہ میں ڈال دی تھیں تو اس نے، اسے اس وقت تک کاٹا تھا جب تک کہ اسے

درد محسوس نہیں ہوا تھا اور وہ اب یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے اوپر کے دو دانتوں کی پچھلی اوپری طرف کے تمام دانت موجود نہیں تھے۔ (اس بات نے اسے اس وقت افسردہ نہیں کیا تھا کیوں کہ اس کا یہ معمولی عیب عمر کی وجہ سے تھا جو اسے پر جوش انداز میں اپنی طرف کھینچتی تھی) لیکن اب اس کے دانتوں کے درمیان کے خلا کو دیکھتے ہوئے اور اس کے منہ کے کونے میں جھانکتے ہوئے، اسے لگا کہ اس کے دانت حیرت انگیز طور پر سفید تھے اور کوئی بھی غائب نہیں تھا۔ اس نے اس پر کپکپی طاری کر دی۔ دونوں تصورات دوبارہ مبہم ہو گئے لیکن وہ اس کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو طاقت اور سختی سے باہم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کہا: ''کیا تم حقیقت میں کونیاک کی ضرورت محسوس نہیں کر رہیں؟'' جب اس نے خوش کن مسکراہٹ اور تھوڑی سی اوپر اٹھی ہوئی بھنوؤں کے ساتھ اپنے سر کو حرکت دی تو وہ پردے کے پیچھے جھک گیا۔ اس نے بوتل باہر نکالی۔ اپنے ہونٹوں سے لگائی اور اسے غٹا غٹ پینے لگا۔ تب اس پر یہ کھلا کہ وہ اس کے، اس خفیہ عمل کو اس کی سانسوں کے ذریعے جانچ لے گی۔ پھر اس نے دو چھوٹے گلاس اور بوتل اٹھائی اور انھیں کمرے میں لے آیا۔ ایک بار عورت نے اپنا سر ہلایا، ''کم از کم علامتی طور پر سہی'' اس نے کہا اور دونوں گلاسوں کو بھرا۔ اس نے اس کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ ''حال کے حوالے سے تم سے باتیں کرتے ہوئے'' اس نے اپنے جام کو گھونٹ لے کر ختم کیا۔ عورت نے اپنے ہونٹوں کو نم کیا۔ اس نے عورت کی کرسی کے بازو پر اپنے کو جما دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

(۱۰)

جب وہ اس کے بیچلر اپارٹمنٹ میں گئی تھی تو اسے شبہ نہیں تھا کہ وہ وہاں اس قسم کی دوستی کو پالے گی اور آغاز میں وہ خوف زدہ ہو گئی تھی جیسے کہ یہ سب کچھ، جو پیش آیا تھا، وہ اس کے لیے تیار نہ تھی۔ (وہ مسلسل تیاری جس سے ایک پختہ کار عورت واقف ہوتی ہے، وہ بہت پہلے کھو چکی تھی) (شاید ہمیں اس خوف کے رشتے کو ایک نوجوان لڑکی کے خوف میں ڈھونڈنا چاہیے، جس کو پہلی بار چوما گیا ہو اور جس کے لیے لڑکی بھی توقع نہ کرتی ہو اور وہ اس کے لیے تیار نہ تھی یعنی یہ کہ ''اب نہیں اور ابھی نہیں۔'' یہ پراسرار طور پر آپس میں جڑے ہوئے تھے، جیسے کہ بڑھاپے کے تجسس اور بچپن کا آپس میں تعلق ہوتا ہے) تب اس نے اسے کرسی کے بازو سے کاؤچ پر منتقل کیا، اس کے ساتھ بغل گیر ہوا اور اس کے پورے جسم پر ہاتھ پھیرا، اور اس کے بازوؤں میں عورت نے خود کو عاشقانہ طور پر نرم محسوس کیا (ہاں، نرم، کیوں کہ اس کے جسم نے مدتوں پہلے اس شہوت کو کھو دیا تھا جو کہ ایک وقت میں اس پر غالب تھی، وہ

شہوت جو فوری طور پر، اس کے پٹھوں کے سکڑنے اور پھیلنے کے سرور کو مستقل کر دیتی تھی اور اسے سینکڑوں نازک تحریکات کی مستی سے بھر دیتی تھی۔

بہر حال خوف کے لمحات جلد ہی اس کی باہوں میں آ کر پگھل گئے تھے اور حالاں کہ اب وہ ایک پختہ کار خوب صورت خاتون کے طور پر جیسے کہ وہ کبھی رہی تھی، بہت دور جا چکی تھی اور اب اس وقت اس نے تقریباً فوراً اپنی اس سابقہ شخصیت کو پالیا تھا۔ اس نے اپنے محسوسات کو دوبارہ پالیا، اس نے اپنی ہوش مندی بھی پھر سے پائی اور ایک بار پھر اس نے ایک عاشق مزاج عورت کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور یہ وہ اعتماد تھا، جس کو وہ ایک لمبے عرصے سے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ اس لیے اس نے اسے پہلے والے اعتماد سے بہت بڑھ کر پایا۔ اس کا جسم جو تھوڑی دیر پہلے دام میں آیا ہوا خطرے میں گھرا ہوا، بے مزاحمت تھا، اب پھر سے زندہ ہو گیا تھا، اور اب وہ خود ذمہ داری سے جواب دے رہی تھی اور اس نے اس چوما چاٹی کی مہارت اور عمدگی کو محسوس کر لیا تھا اور اس نے اسے تسکین بخشی تھی۔ یہ پیار، جیسا کہ اس نے اپنا چہرہ اس کے جسم میں سمو دیا تھا، وہ نازک جوش، جس کے ساتھ اس کے جسم نے، اس کی بغل گیری کا جواب دیا تھا، اس کو، اس سب کو کسی ایسی چیز کی طرح محسوس نہیں کیا تھا کہ جیسے وہ محض متاثر کر رہی تھی بل کہ یہ ایسا تھا کہ جیسے وہ جانتی تھی کہ اسے کیسے کرنا چاہیے اور جسے کہ وہ اب اداس سی انکساری سے سرانجام دے رہی تھی۔ لیکن ایک ضروری چیز کے طور پر، جس کا وہ مسرت اور جوش کے ساتھ خود ایک حصہ تھی جیسے وہ اس کا وطن ہو (واہ، ایک خوب صورتی کی حامل سرزمین) اور جہاں سے، اسے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور جہاں وہ اب کامیابی کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔

اس کا بیٹا اب بے انتہا دوری پر تھا۔ جب اس کے میزبان نے اسے، اس کے ذہن کے ایک کونے سے اچک لیا تھا تو اس نے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا، جو اسے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا لیکن پھر وہ جلد ہی غائب ہو گیا۔ اب وہاں صرف وہ تھی اور وہ مرد تھا، جو اسے سہلا رہا تھا اور اسے گلے لگا رہا تھا۔ لیکن جب اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھے اور اپنی زبان کی مدد سے اس کا منہ کھولنا چاہا تھا تو ہر چیز اچانک الٹ ہو گئی، وہ جاگ پڑی۔ اس نے سختی سے اپنے دانتوں کو جکڑ لیا (اس نے مواد کی تلخ اجنبیت کا تصور کیا، جو اس کے منہ کے اوپری حصے پر دباؤ ڈالنے والا تھا اور اس کے منہ کو بھر دینے والا تھا) اور اس نے خود کو اس کے سپرد نہ کیا۔ تب اس نے نرمی سے اسے پرے کیا اور کہا: ''نہیں، بالکل نہیں تمھاری مہربانی، میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔'' جب اس نے اصرار کیا تو اس نے اسے، اس کے دونوں

ہاتھوں کی کلائیوں سے پکڑ لیا اور اپنے انکار کو دہرایا۔ پھر اس نے کہا (اس کے لیے بولنا مشکل تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے بولنا چاہیے کیوں کہ وہ چاہتی تھی کہ جو اس کو وہ کہہ رہی تھی اسے ماننا چاہیے) کیوں کہ اب انھیں محبت کرنے کے حوالے سے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے اسے اپنی عمر یاد دلائی، اگر انھوں نے محبت کا عمل کیا تو وہ اس سے کراہت محسوس کرے گا اور وہ اس کے لیے خود کو بد بخت محسوس کرے گی کیوں کہ جو کچھ اس نے ان دونوں کے متعلق بتایا تھا وہ اس کے لیے زیادہ خوب صورت اور اہم تھا۔ اس کا جسم ویران اور فنا پذیر تھا لیکن وہ اب جانتی تھی اس میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو کہ غیر مادی تھی، اس دمک کی طرح جو ایک ستارے کے جل جانے کے بعد بھی خود کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ بوڑھی ہو رہی ہے تو اس میں کیا حرج ہے کہ اس کی جوانی کسی کے اندر اس طرح بالکل محفوظ ہے۔ ''تم نے خود ہی اپنے آپ میں میرے لیے ایک یادگار تعمیر کر لی ہے۔ میں اسے تباہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گی، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو'' وہ اسے خود سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ ''نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ نہیں، یہ نہ کرو۔''

(۱۱)

اس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اب بھی خوب صورت ہے اور یہ کہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں بدلا، کہ ایک انسان ہمیشہ ویسا ہی رہتا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اسے دھوکہ دے رہا ہے اور عورت کا موقف صحیح تھا۔ بہر حال، وہ اپنی حد درجے کی جسمانی حساسیت اور عورت کے جسم کے بیرونی عیوب کے متعلق اپنی بڑھتی ہوئی نازک پسندی سے بہ خوبی آگاہ تھا، جس نے ان حالیہ سالوں میں اسے سدا بہار نوجوان بنا دیا تھا اور اسی لیے، یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ اس نے ہمیشہ عورتوں کو خالی اور احمق محسوس کیا تھا۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر اس نے اسے محبت کرنے پر آمادہ کیا تو اس کا اختتام نفرت پر ہوگا اور یہ نفرت نہ صرف یہ کہ ان کے حال پر کیچڑ اچھالے گی بل کہ گزرے وقت کی، اس کی اس محبوبہ عورت کے تصور کو بھی داغ دار کر دے گی، ایک ایسا تصور جو کہ اس کی یادداشت میں ایک موتی کی طرح موجود تھا۔

اسے یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن یہ محض دانش مندی تھی اور یہ دانش خواہش کے سامنے کچھ نہیں تھی۔ خواہش جو صرف اس عورت کو جانتی تھی جو اس کے لیے پورے پندرہ سال تک نا قابلِ حصول اور گریزاں رہی تھی اور یہاں موجود تھی۔ آخر کار وہ اسے دن کی روشنی میں دیکھ سکتا تھا اور جس کے، آج کے جسم کے بارے میں وہ ادراک کر سکتا تھا کہ وہ جسم کیسا رہا تھا اور اس کے چہرے سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا چہرہ پہلے کیسا لگتا تھا۔ بالآخر وہ اس کے (غیر تصوراتی) محبت کرنے کے انداز کو شناخت کر سکتا تھا،

اس کی حرکات وسکنات اور پھر اس شہوت کو بھی۔

اس نے اس کے کندھوں کے گرد اپنے بازو گزارے اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میرے ساتھ مزاحمت نہ کرو۔ مجھے روکنا لغو چیز ہے۔''

(۱۲)

اس نے انکار میں سر ہلایا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اسے انکار کرنا حماقت نہیں ہے۔ وہ مردوں کو جانتی تھی اور عورت کے جسم تک ان کی رسائی کو بھی سمجھتی تھی۔ وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ محبت کے عمل میں، جسمانی سطح کی خوفناک بنیادی اہمیت کے پیشِ نظر پر جوش اصول پرستی سے بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اب بھی ایک خوب صورت جسم کی مالک تھی جو ابھی تک اپنی اصل خوش اندامی کے ساتھ محفوظ تھا اور خاص طور پر وہ اپنے کپڑوں میں بالکل جوان لگتی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بے لباس ہو گی تو اس طرح، اس کی گردن کی جھریاں عیاں ہو جائیں گی، دس سال پہلے ہوئے آپریشن کی وجہ سے اس کے پیٹ پر موجود زخم کا نشان بھی دکھائی دے گا اور اس کے بھورے بال بھی نظر آئیں گے۔ وہ اپنے سر کے بھورے بالوں کی وجہ سے شرمندہ نہیں تھی لیکن وہ اپنے جسم کے مرکزی حصے کے بالوں کی وجہ سے شرم سار تھی، یہ اس کے ساتھ ایک نامعقول امتیازی نشان کے طور پر موجود تھے۔

اور اپنی موجودہ جسمانی ظاہری حالت کے شعور کی بنا پر، جسے اس نے تھوڑی دیر پہلے بھلا دیا تھا وہ اپنے آپ میں واپس آ گئی، تب اس کے لہجے سے (اب تک یہ کمرہ اسے اس کی زندگی سے بھی بڑھ کر محفوظ محسوس ہوتا تھا) نیچے گلی میں موجود صبح کی پریشانیوں نے اپنا سر ابھارا۔ انھوں نے سارے کمرے کو بھر دیا تھا، وہ شیشے کے پیچھے اس کے نقوش کو روشن کر رہے تھے، کرسی کے بازوؤں پر، میز پر، کافی کے خالی کپ پر اور اس کے بیٹے کے چہرے پر ان کے جلوس کا تسلط تھا۔ جب اس نے انھیں دیکھا تو اسے شرم آ گئی اور اپنے آپ میں کہیں جا چھپی۔ احمقانہ انداز میں، وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی، جہاں سے وہ اس راستے کو، جسے اس نے چنا تھا، بچنے کی خواہش کر رہی تھی، جس پر وہ اب تک مسکراہٹ اور پُر جوش الفاظ کے ساتھ محوِ سفر رہی تھی۔ وہ وہاں پر تھی (کم از کم ایک لمحے کے لیے) جہاں وہ چھپنا چاہتی تھی اور اب فرماں برداری سے، اسے واپس ہو جانا چاہیے تھا، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ صرف یہی راستہ اس کے لیے مناسب تھا۔ اس کے بیٹے کا چہرہ اتنا تضحیک آمیز تھا کہ شرم سے، اس نے اس وقت اس کے سامنے خود کو چھوٹا اور چھوٹا ہوتے ہوئے ذلت میں لتھڑا ہوا محسوس کیا، وہ اپنے پیٹ پر موجود زخم کے نشان

میں تبدیل ہو گئی۔

اس کے میزبان نے اسے کندھوں سے پکڑا ہوا تھا اور اس نے ایک بار پھر کہا: ''یہ تمھارے لیے نامعقول بات ہے کہ تم میرے ساتھ مزاحمت کرو۔'' اور اس نے اپنا سر ہلایا، لیکن بالکل ایک مکینیکل طریقے سے، جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی، وہ اس کا میزبان نہیں تھا، بل کہ یہ اس کے دشمن بیٹے کے چہرے پر نظر آنے والے، اس کی اپنی جوانی کے خدوخال تھے، جس کے بہت ہی چھوٹے پن سے، اسے نفرت تھی اور اس نے خود کو بہت زیادہ ذلیل ہوتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے اسے کینسل شدہ قبر کے متعلق، اس پر الزام لگاتے ہوئے پایا اور اب اس کی یادداشت کے انتشار کے ذریعے، ایک جملہ اس کے منہ سے نکلا جو غصّے میں آ کر، اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ ''میرے بچے، پرانے مُردوں کو نئے مُردوں کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے۔''

(۱۴)

اسے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اصل میں ایک تنفر کے ساتھ ختم ہو گا۔ تاہم وہ پھر بھی (ایک تلاش کرتی اور چھبتی ہوئی نظر) ایک یقینی تنفر کو محسوس کرائے بغیر اس کو اپنی شکل نہیں دکھا سکا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے برعکس، اس نے اسے جوش دلایا اور اس پر اسے اکسایا کہ جیسے وہ ایسی ہی نفرت کی خواہش رکھتا تھا۔ آخر کار، اس کے جسم کو پڑھنے کی خواہش، جس کو جاننے کی، اسے ایک عرصے سے اجازت نہیں دی گئی تھی، فوری طور پر اسے پڑھنے کی سبکی والی خواہش میں گھل مل گئی تھی۔

یہ کیسے ہوا تھا؟ آیا اس نے اسے محسوس کیا تھا یا نہیں کہ ایک منفرد موقع وہاں موجود تھا۔ اس کی ملاقاتی ہر اس چیز کے لیے تیار تھی، جو اس کے پاس نہیں تھی۔ اس نے وہ سب کچھ نظر انداز کر دیا تھا، جس کی غیر موجودگی کی وجہ سے جو کچھ کہ ناقابلِ برداشت تھا، وہ اس کی گرفت سے بچ نکلا تھا: یعنی اس کی موجودہ عمر۔ اس کے گرتے بال اور اس ہولناک انداز کا کم تر میزان۔ اور وہ، پتا نہیں اس نے اس کو محسوس کیا تھا یا محض مبہم انداز میں، اس کو مشکوک سمجھا تھا، اب اپنی ان خوشیوں کو برہنہ کر سکتا تھا (صحیح طور پر وہ کیفیات ہی تھیں کہ جنھوں نے اس کی زندگی کو اتنا غمگین اور بے رونق بنا رکھا تھا)۔ وہ یہ ظاہر کر سکتا تھا کہ وہ بے قیمت نہیں یعنی یہ کہ صرف وہ اظہارات تھے، جن کا انجام تباہی تھا کہ وہ بجائے خود دھول کے مانند تھے۔ وہ انتقام لے سکتا تھا، ان کی تذلیل کر کے۔

''مزاحمت مت کرو۔'' اس نے پھر کہا اور اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی۔

اس نے اب بھی اپنے سامنے اپنے بیٹے کا تمسخر اڑانے والا چہرہ دیکھا اور اب جب اس کے میزبان نے اسے زور سے اپنی طرف کھینچا تو اس نے کہا: ''مہربانی کر کے مجھے ایک لمحے کے لیے تنہا چھوڑ دو۔'' اور اس نے اپنے آپ کو اس کی بغل گیری سے آزاد کیا۔ جو کچھ اس کے دماغ میں چل رہا تھا، وہ اس کو برہم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پرانے مُردوں کو نئے مُردوں کے لیے جگہ مہیا کرنی چاہیے اور یہ یادیں اچھی نہیں ہوتیں۔ اور اس کی یاد، جو اس کے پہلو میں موجود، اس آدمی نے اسے پندرہ سال پہلے اپنے خیالات میں عزت دی تھی، اچھی نہیں تھی اور اس کے شوہر کی یاد، اچھی نہیں تھی اور ہاں میرے بیٹے۔ یہ تمام یادیں اچھی نہیں تھیں۔ اس نے اپنے من میں اپنے بیٹے سے کہا۔ اس نے انتقام سے بھرپور خوشی کے ساتھ اس کے گھبرائے ہوئے نقوش والے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے چیختے ہوئے سنا: ''اماں، تم نے پہلے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی۔'' بے شک وہ جانتی تھی کہ وہ اس طرح کبھی نہیں بولی تھی لیکن یہ لمحہ ایک مکمل روشن لمحہ تھا، جس میں ہر چیز بالکل مختلف ہو کر سامنے آئی تھی۔

کوئی وجہ نہیں تھی کہ اسے کیوں زندگی پر اپنی یادوں کو ترجیح دینی چاہیے تھی۔ اس کی اپنی یاد کا اس کے لیے ایک ہی مطلب تھا کہ اس لمحے وہ اپنے اس کم قد والے جسم کی خاطر اسے بُرا سمجھے۔ وہ شخص جو، اس کے قریب بیٹھا تھا، اس نے اس کو نظرِ ثانی کے لیے کہا۔ وہ جوان تھا اور ممکنہ طور پر (تقریباً یقینی طور پر) وہ آخری آدمی تھا، جو اس سے ایسا کہہ سکتا تھا اور ساتھ ہی یہ وہی تھا، جس کو وہ پا سکتی تھی اور صرف یہ ایک بات ہی بہت اہم تھی۔ اگر وہ اس سے متنفر تھا اور اگر اس نے اس کی یادداشت کو اپنے خیالات سے ختم کر دیا تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ اس کی یاد، اس کے باہر تھی، بالکل اسی طرح جیسے کہ اس (مرد) کے خیالات اور یاد، اس کے باہر تھی اور ہر وہ چیز جو، اس کے باہر تھی، اس سے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ ''اماں، تم آج تک اس طرح نہیں بولیں۔'' اس کا بیٹا چلایا لیکن اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، وہ مسکرا رہی تھی۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔ مجھے مزاحمت نہیں کرنی چاہیے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تب اس نے اپنے لباس کے بٹن کھولنے شروع کر دیے۔ شام ابھی بہت دوری پر تھی۔ اس بار کمرہ روشنی سے بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

لاؤسیانگ

آچوان نے سکول جانا چھوڑ دیا

جب کوئی دیہاتی لڑکا آٹھ یا نو سال کا ہو جاتا تو اُس کے ساتھ ہی یہ آس بھی بندھ جاتی کہ اب وہ تقریباً آدھے نوجوان آدمی کے برابر کارآمد ہو گیا ہے۔اس سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ موسمِ بہار میں فصلوں کی نلائی کرے اور گرمیوں میں کٹائی کے کام میں ہاتھ بٹائے اور جب کوئی فارم ہاؤس تعمیر ہو رہا ہو تو اس کے لیے اینٹیں بھی بہم پہنچائے اور ساتھ ہی جب فصلوں کو پانی دینے کا وقت ہو تو اس کے لیے، پانی کو صحیح کھالوں میں سے گزار کر لائے۔کوئی دیہاتی آدمی ایسے کارآمد بچے کو سکول بھیج کر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ایک دن شہر میں ایک نوٹس چسپاں کیا، پایا گیا، جس میں درج تھا کہ وہ والدین جن کے بچے چھ سال سے زیادہ عمر کے ہو چکے ہوں اگر وہ ایسے بچوں کو سکول نہیں بھیجیں گے تو انھیں جیل بھیج دیا جائے گا۔تو اس طرح آچوان کو سکول جانا پڑا۔

پہلے دن سکول سے واپسی پر آچوان اپنے ساتھ آٹھ کتابیں لایا۔اس کے تمام گھر والے، جن میں اس کی دادی اور دادا بھی شامل تھے، ان کتابوں کو دیکھنے کے لیے، اس کے گرد جمع ہو گئے وہ ان کتابوں میں تصویروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''خدا بھلا کرے''اس کا دادا بولا''جب میں سکول جایا کرتا تھا تو ہماری کتابوں میں ایسی تصویریں نہیں ہوا کرتی تھیں۔''

اس کا باپ بولا:''لیکن دیکھو.........ان تصویروں میں چینی لوگ تو بالکل نہیں۔ان میں سے کسی نے بھی چینی کپڑے نہیں پہنے۔ذرا غور کرو.........یہ غیر ملکی جوتے ہیں اور یہ غیر ملکی لباس اور چھڑی تو کتے کو مارنے کے لیے ہے۔ان سب نے تو غیر ملکی پادریوں جیسے لباس پہن رکھے ہیں۔

آچوان کی دادی نے کہا''اس جولاہے کو دیکھو...........یہ بھی غیر ملکی ہی دکھائی دیتا ہے۔ہم پہیے کو دائیں ہاتھ سے چلاتے ہیں اور یہ بائیں ہاتھ سے اسے گھما رہا ہے۔''

اس کے دادا نے مزید کہا:''اس گاڑی بان کو چینی ہی ہونا چاہیے۔کیوں کہ اگر تم لوگوں نے

گاڑی بان کو ایک طرف اپنی گاڑی پر کھڑے ہوئے دیکھا ہے یا سانٹے کو یوں پکڑے ہوئے دیکھا ہے تو یقیناً یہ چینی ہی ہوگا۔''

جب آچوان نے دیکھا کہ ہر کوئی اس کی کتابوں میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا: ''ٹیچر نے کہا ہے کہ مجھے ان کتابوں کے لیے پانچ روپے ادا کرنا ہوں گے۔''

اس کا یہ اچانک اعلان اس کے خاندان پر بجلی بن کر گرا۔ ایک لمحے کے لیے تو کچھ بول ہی نہ سکے اور پھر یہ اس کی دادی تھی، جس نے آخرِ کار خاموشی کو توڑا۔

اس نے کہا:

''لو اور سنو...... پہلے تو انھوں نے زبردستی ہم سے چاہا کہ ہم اپنے بچے سکول بھیجیں اور اب وہ توقع کرتے ہیں کہ ہم ان کتابوں کی قیمت ادا کریں اور یہ سب کچھ پہلے دن ہی ہو گیا۔ بھلا ہم ایسے سکول کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ حتیٰ کہ اگر ہم اگلے چھ ماہ گھر میں بغیر روشنی کے گزارہ کریں تو بھی ہم اتنے پیسے نہیں نکال سکتے۔ اب بھلا کوئی ان بھلے مانسوں سے پوچھے کہ انھوں نے ان کتابوں کی قیمت آدھے من مکئی کے برابر کیوں رکھی۔''

اب اس کا دادا گویا ہوا:

''میرے خیال سے چوں کہ لڑکے کا ابھی سکول میں آغاز ہے، اس لیے اس دوران میں اسے صرف ایک کتاب کی ہی ضرورت پڑے گی۔ اسے پہلے صرف ایک کتاب ختم کرنی چاہیے اور پھر دوسری حاصل کرنی چاہیے۔''

اس کی دادی بولی:

''اب اس کتاب کی طرف دیکھو..........اس کے ہر صفحے پر تین یا چار سے زیادہ بڑے حروف نہیں۔ اب ایسے میں کیا اس کی قیمت زیادہ نہیں۔ اس کے برعکس جنتری صرف چند آنوں میں مل جاتی ہے اور اس کا ہر صفحہ چھوٹے اور بڑے بہت سے حروف سے بھرا ہوتا ہے۔''

بہت دیر تک وہ سب ان کتابوں کے متعلق کوئی واضح لائحۂ عمل نہ بنا سکے اور بحث و مباحثہ رات گئے تک جاری رہا۔ لیکن آخر میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ چوں کہ اس بدقسمتی سے، جس نے کہ انھیں اچانک آگھیرا ہے، چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے انھیں سکول والوں کا مطالبہ پورا کر دینا چاہیے۔ ان سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ پیسے اکٹھے کرنے کے لیے لڑکے کی ماں اپنے کانوں کی

بالیاں بیچ دے گی اور آچوان کے باپ نے اس سے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"تمھیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تمھارے سکول جانے کی وجہ سے ہمیں پہلے ہی یہ نقصان برداشت کرنا پڑا ہے کہ اب تم فارم پر ہمارے لیے کام نہیں کر سکتے اور یہی ایک بات ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر سکتی ہے اور ہم حقیقت میں یہ مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتے ۔اب ہم تم سے یہی توقع کر سکتے ہیں کہ تم سکول میں محنت سے پڑھو گے۔"

آچوان نے اپنے باپ کی بات کی سچائی کو محسوس کیا اور فیصلہ کیا کہ وہ خوب محنت کرے گا تاکہ اس کے خاندان والوں کو محسوس ہو کہ وہ ان کا شکر گزار ہے ۔اگلے دن جوں ہی روشنی ہوئی وہ سکول روانہ ہو گیا ۔لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت وہاں صرف چوکیدار تھا جس نے آچوان کو بتایا کہ وہ وقت سے بہت پہلے آگیا ہے۔

چوکیدار نے کہا:

" کلاسیں نو بجے سے پہلے شروع نہیں ہوتیں..........اور اس وقت تو ساڑھے پانچ بجے ہیں ۔سکول کے دروازے بند ہیں اور ٹیچر بھی سو رہا ہے۔ تمھیں ابھی گھر واپس چلے جانا چاہیے۔

آچوان نے ارد گرد کا جائزہ لیا مگر وہاں کوئی طالبِ علم نہ تھا وہ ایک لمحے کے لیے ٹیچر کے کمرے کی کھڑکی کے قریب کھڑا رہا۔لیکن وہاں سے صرف اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی تھی ۔پھر اس نے سکول کی عمارت کو دیکھا تمام دروازے بند تھے ۔اب اس کے لیے چوکیدار کی نصیحت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا............وہ گھر واپس لوٹ آیا۔

اس کا باپ صحن میں جھاڑو دے رہا تھا، جب اس نے دیکھا کہ آچوان واپس آگیا ہے تو وہ اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور جھاڑو پھینک کر پھنکارا:

"تم بدمعاش.........تمھارے جیسے بچے کو سکول بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں.......سکول میں آج تمھارا دوسرا دن ہے اور تم وہاں سے بھاگنے بھی لگے ہو۔"

اس سے پہلے کہ آچوان کوئی وضاحت پیش کرتا ،اس کی ماں نے اس کے سر پر تگڑا ہاتھ مارا اور اسے کہا کہ وہ اندر جائے اور ناشتہ تیار کرنے میں اس کی مدد کرے ۔یہاں یہ کہنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ ان سب کے غصے کی وجہ ،صرف وہ رقم تھی ،جو انھیں اس کی کتابوں کو خریدنے پر خرچ کرنا پڑی تھی ۔

ناشتے کے بعد آچوان دوبارہ سکول کی طرف چل پڑا ۔جب وہ وہاں پہنچا تو سکول پہلے ہی

کھل چکا تھا اور استاد لڑکوں کو پابندیٔ وقت کی اہمیت پر لیکچر دے رہا تھا۔ اس نے اس پری کی کہانی سناتے ہوئے اپنے لیکچر کو ختم کیا، جو ہمیشہ سکول میں سب سے پہلے آنے والے کی منتظر رہتی ہے تا کہ وہ اسے سونے سے بھرا ہوا تھیلا انعام کے طور پر دے سکے۔ آچوان نے اس پری کی کہانی کو بہت پسند کیا اور خاص طور پر سونے کے تھیلے والی بات کو مگر وہ "سب سے پہلے آنے والے" کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکا۔

آچوان سہ پہر کو ساڑھے تین بجے کے قریب پھر گھر واپس آیا۔ اس وقت اس کا باپ قیلولے کے بعد دوبارہ کام پر واپس جا رہا تھا۔ آچوان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے باپ نے اس کے ٹیچر کو 'کتے کو مارنے والی چھڑی کے ساتھ' سیر کو جاتے دیکھ لیا تھا، اس لیے اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کا بیٹا دوبارہ سکول سے بھاگ کر آیا ہے۔ البتہ اس کا باپ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان غیر ملکیوں کے اوقات کار بہت عجیب وغریب تھے۔

سکول میں پہلے چھ دن سبق کو پڑھنے اور اسے یاد کرنے میں لگے۔ یہ سبق چار لفظوں پر مشتمل تھا: "یہ ماما (ماں) ہے۔" آچوان نے سبق کو ازبر کرنے کے لیے بہت محنت کی اور شام کو وہ اس سبق کو اونچی آواز میں دہراتا۔ وہ مضبوطی سے کتاب کو پکڑ لیتا اور ہر حرف پر باری باری انگلی رکھتا۔ بہت مرتبہ آچوان کی ماں نے اسے کہتے سنا: 'یہ ماما (ماں) ہے' وہ یہ سن کر غمگین ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چھ دنوں کے بعد اسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور اس نے آچوان کی طرف جھپٹتے ہوئے اس کی کتاب چھین لی۔ وہ چیخی: "مجھے دکھاؤ.......... یہ کون تمھاری ماں ہے؟" آچوان نے خیال کیا کہ شاید اس کی ماں کو واقعی اس کی پڑھائی میں دلچسپی ہے۔ اس لیے اس نے خوش ہو کر تصویر میں موجود ایک عورت کی طرف اشارہ کیا، جس نے اونچی ایڑی کے جوتے پہن رکھے تھے۔ جس کے بال گھنگھریالے تھے اور جس نے ایک لمبا سا لباس پہن رکھا تھا۔

یہ دیکھو..............اس نے کہا: "یہ ماما ہے۔"

اس کی ماں نے ایک نظر اس تصویر پر ڈالی اور پھر بری طرح رو پڑی۔ باقی گھر والے بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ کسی قدر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ شاید کسی بدروح نے اسے اپنے چنگل میں جکڑ لیا ہے۔ انھیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا چکر ہے۔ پھر آچوان کی ماں آنسوؤں سے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولی۔

"میں اس لیے روتی ہوں کہ میرا بیٹا اس چڑیل کو اپنی ماں کہتا ہے۔" جب انھیں معلوم ہوا کہ کس بات نے اسے یوں رنجیدہ کر دیا ہے، تو وہ بھی سکول کی کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ آچوان کے

باپ نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ''یہ کتاب یہ نہیں بتاتی کہ یہ کس کی ماں ہے؟ کل آچوان سکول میں پوچھ سکتا ہے۔

''میرے خیال میں یہ ٹیچر کی اپنی ماں ہے۔''

آچوان کی ماں ابھی تک بہت پریشان تھی۔ وہ ساری رات نہ سوسکی اور سب سے پہلا کام جو اس نے صبح کیا وہ یہ تھا کہ اس نے آچوان کو جگا کر اس ہدایت کے ساتھ سکول بھیجا کہ وہ ٹیچر سے پوچھ کر آئے کہ اصل جواب کیا ہے۔

لیکن سب گھر والے اس سے بے خبر تھے کہ آج اتوار تھا۔ سکول بند تھا اور ٹیچر، جس نے کہ پچھلی شب بہت شراب پی لی تھی، اس وقت کسی سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہ تھا۔

جب سکول سوموار کو دوبارہ کھلا تو استاد نے شاگردوں سے سوالات پوچھنے کی ضرورت پر لیکچر دیا۔

''اگر تم سکول میں بہتر نظر آنا چاہتے ہو، تو تمھیں اپنے استاد اور ماں باپ سے ان چیزوں کے متعلق سوالات کرنے چاہییں جو تمھیں سمجھ نہ آسکیں۔''

آچوان فوراً کھڑا ہوگیا۔

ہماری کتاب میں درج ہے.........''یہ ماما ہے۔'' حقیقت میں یہ کس کی ماں ہے جناب؟

استاد نے پر مزاح انداز میں جواب دیا۔

''یہ ہر اس بچے کی ماں ہوسکتی ہے جو کہ اس کتاب کو پڑھتا ہے۔ کیا بات تمھاری سمجھ میں آگئی؟''

''نہیں جناب''...............آچوان نے جواب دیا۔

''اس میں ایسی کیا بات ہے جو تمھاری سمجھ میں نہیں آرہی۔'' استاد نے پوچھا۔

آچوان نے کہا۔

''جناب بالڈی بھی یہ کتاب پڑھ رہا ہے اور اس کی ماں ہرگز ہرگز اس تصویر جیسی نہیں ہے۔''

''بالڈی کی ماں کی صرف ایک آنکھ ہے اور اس کا بازو بھی ٹیڑھا ہے۔'' ایک اور شاگرد بولا۔

اس پر بالڈی بول پڑا: ''یہ اس سے بہتر ہے کہ کسی کی ماں ہی نہ ہو......جیسے کہ تمھاری نہیں۔''

بلیک بورڈ پر اپنی چھڑی مارتے ہوئے استاد بولا: ''خاموش......کوئی کچھ نہ بولے۔'' ''اب ہم دوسرا سبق شروع کررہے ہیں جو ہے: ''یہ پاپا ہے۔'' اس تصویر کی طرف دیکھو......یہ پاپا ہے......منتشر بالوں والا......اور جس نے عینک لگا رکھی ہے۔

جب آچوان گھر گیا تو اس کی ماں یہ جاننے کے لیے بے قرار تھی کہ کتاب والی عورت اصل میں کون ہے ۔لیکن جب اس نے اپنے بیٹے کو یہ دہراتے سنا: ''یہ پاپا ہے ۔'' تو وہ اس بات سے ڈر گئی کہ اگر اس کے خاوند نے سن لیا کہ اس کے بیٹے کا کوئی اور باپ ہے تو وہ بہت ناراض ہوگا..........پس وہ خاموش ہو رہی مگر وہ اپنے آپ سے کہنے لگی: ''کہ جب لڑکوں کے اپنے ماں باپ ہیں تو یہ کتاب دوسرے لوگوں کو ،ان کے ماں باپ کیوں بناتی ہے؟''

چند دنوں کے بعد آچوان کو پڑھنے کے لیے ایک اور سبق ملا ، جو یہ تھا: ''بھینس کھانا تیار کرتی ہے ۔'' ،'' گھوڑا کڑھی کھاتا ہے ۔'' جوں جوں وہ سبق پڑھتا جاتا بتدریج حیران ہوتا جاتا ۔فارم پر ایک بھینس اور گھوڑا بھی تھا اور بعض اوقات ،اس نے ان کی دیکھ بھال بھی کی تھی لیکن اس نے کبھی گھوڑے کو کڑھی کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور یہ بھی اسے یقین تھا کہ بھینس کبھی کھانا نہیں پکا سکتی ۔مگر یہ بھی سچ تھا کہ کتاب غلط نہیں ہوسکتی تھی ۔اسے یاد آیا کہ اس کے استاد نے کیا کہا تھا ۔اس نے اپنے باپ سے پوچھا، اس کے باپ نے کہا: ''جب میں شہر میں تھا تو میں نے ایک غیر ملکی سرکس دیکھا تھا وہاں ایک ایسا گھوڑا تھا جو گھنٹی بجا سکتا تھا اور بندوق چلا سکتا تھا ۔اس کتاب میں غالباً سرکس کے جانوروں کے بارے میں باتیں درج ہیں ۔''

آچوان کی دادی کتاب کی تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی وہ فوراً بول پڑی: ''میرے خیال میں یہ بدروحیں ہیں دیکھو..........ان دونوں نے انسانوں جیسے لباس پہن رکھے ہیں ۔اگلی چند صدیوں میں شاید یہ انسان بن جائیں ۔'' پھر وہ انھیں شیطانوں کے متعلق کہانیاں سنانے لگی ، جو عناصر کو اپنے قابو میں رکھنے پر قادر ہوتے ہیں اور نتیجے کے طور پر آچوان آدھی رات کو چیختا چلاتا ہوا یہ کہتے ہوئے بیدار ہوا کہ مجھے ہوا میں اڑنے والا ایک بھیڑیا نما شیطان مار رہا ہے ۔

اگلے دن آچوان نے اپنے ٹیچر سے پوچھا ۔

جناب.........''یہ بھینس جو کھانا پکا لیتی ہے کیا غیر ملکی ہے؟''

''بے وقوف لڑکے'' اس نے کہا: ''کتاب میں صرف تمھیں خوش کرنے کے لیے لکھا گیا ہے ۔بے شک بھینس کھانا نہیں پکا سکتی ۔''

اب ہر چیز آچوان پر تقریباً واضح ہو چکی تھی ۔اس نے سمجھ لیا تھا کہ کتاب کچھ ایسی چیزوں کے بارے میں بیان کرتی ہے جیسے: روٹی ، دودھ ، پارک اور گیند ، جن کے متعلق اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا ۔

اب اس نے محسوس کیا کہ کتاب نے ان سب چیزوں کو سکول کے لڑکوں کو خوش کرنے کے لیے یوں ہی گھڑ لیا ہے۔ ایک دن ایک ٹی پارٹی کے بارے میں سبق پڑھنے کے بعد آچوان اور اس کے دوستوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسی ہی چائے کی پارٹی کریں گے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان میں سے ہر ایک آٹھ آنے دے گا تا کہ اس پارٹی کے لیے کچھ چیزیں مثلاً نارنگیاں، سیب اور چاکلیٹ خریدا جا سکے۔ آچوان کو معلوم تھا کہ جب وہ ان چیزوں کو خریدنے کے لیے گھر سے پیسے مانگے گا تو کیا ہو گا لیکن کتاب میں ٹی پارٹی والی تصویر کچھ اتنی دلکش تھی کہ وہ اپنی ماں سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا۔ اور پھر یوں ہوا کہ اس کی ماں نے اس رقم میں سے، جو اس نے بیجوں کو خرید کے لیے رکھی تھی اس کی ضرورت کے مطابق پیسے دے دیے۔

کبھی کبھی آچوان کے دادا کو کھانسی کی بہت تکلیف ہو جاتی تھی اور اس کے ایک دوست نے اسے بتا رکھا تھا کہ نارنگی کا چھلکا استعمال کرنے سے آرام ملے گا۔ بوڑھا جب گھر آیا تو اس نے پوچھا کہ نارنگی کا چھلکا کیسا ہوتا ہے اور یہ کہ اسے یہ کہاں سے مل سکے گا۔ آچوان نے محسوس کیا کہ دادا کو خوش کرنے کا اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ اس نے کہا کہ سکول میں انھیں کچھ نارنگیاں ملنے والی ہیں۔

بوڑھے نے پوچھا: ''مگر تم یہ نارنگیاں کس طرح حاصل کرو گے؟

''ہم ایک ٹی پارٹی میں حصہ لے رہے ہیں۔'' آچوان نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اکٹھے بیٹھیں اور کھائیں پئیں۔ اس چیز کا علم ہمیں کتاب کے ذریعے حاصل ہوا۔''

''یہ عجیب کتاب ہے۔ پہلے یہ جانوروں کو آدمیوں کی طرح عمل کرتے دکھاتی ہے اور پھر یہ لڑکوں کو سکھاتی ہے کہ وہ کھائیں اور کھیلیں کودیں۔''

وہ بڑبڑانے لگا: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لڑکا سکول جانے لگتا ہے وہ سست اور لالچی ہو جاتا ہے۔''

دادا نے مزید کہا: ''اور پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہمیشہ غیر ملکی غذا کھاتے ہیں اور کبھی بھی پیاز کے ساتھ دہی پھلیاں استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی اچھی چینی غذا۔''

اس کی ماں نے کہا: ''اپنے دادا کی کھانسی کے لیے نارنگی کا چھلکا گھر لانا نہ بھولنا۔''

باپ نے پوچھ لیا: ''تم نے ان نارنگیوں کے لیے پیسے کہاں سے لیے؟''

دراصل ٹیچر...... آچوان نے کہنا شروع کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی کہانی گھڑ سکے۔

ساتھ والے گھر میں بالڈی نے چیخنا شروع کر دیا اور پھر ان سب نے سنا کہ اس کا باپ اسے برا بھلا کہتے ہوئے گرج رہا تھا: ''ہمارے پاس تو زندہ رہنے کے لیے بھی پیسے نہیں اور تم مٹھائیوں کے لیے پیسے مانگ رہے ہو۔''

اور پھر دوسری طرف کے ایک گھر میں بھی ایک اور لڑکے کا چچا دہاڑا:

''میرے خون پسینے کی کمائی ہے، جو رقم تم نے مجھ سے سکول کی کتابیں خریدنے کے لیے لی وہ تو گوارا تھی مگر اب تم چاکلیٹوں کے لیے مجھ سے پیسے مانگنے کی جرأت کر رہے ہو اور تمھارے دوست کوئی پارٹی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ادائیگی بھی کرنی چاہیے۔''

پس اس کے بعد سچی بات سامنے آ گئی۔ آچوان کے باپ نے اسے ٹھڈا مار دیا۔ اب یہ آچوان کی خوش قسمتی تھی کہ درمیان میں ایک میز پڑی تھی جو کہ اس ٹھڈے سے نیچے گر گئی اور اس پر پڑے چاولوں سے بھرے پانچ چھ پیالے گر کر ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ دادا نے مشورہ دیا کہ ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ لڑکے کو فوری طور پر سکول سے اٹھا لیا جائے۔ دادی نے بھڑک کر کہا، اگر یہ یونہی کرتا رہا تو یہ آخرکار جیل میں ہو گا۔

اس بات پر خاندان میں ایک لمبی بحث چھڑ گئی لیکن آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ آچوان کو فی الحال تھوڑے عرصے کے لیے سکول میں رہنے دیا جائے۔

اس واقعے کے بعد آچوان نے فیصلہ کیا کہ وہ بہت محنت سے پڑھے گا اور دوبارہ اپنے خاندان والوں کی نظروں میں ایک اچھا لڑکا بن جائے گا۔ ہر روز وہ اندھیرا ہونے تک بہت مستعدی اور انہماک کے ساتھ اپنی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ البتہ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ بہت جلد یہی کتابیں اس کی آخری ناکامی کا باعث بن جائیں گی۔

بعض اوقات آچوان کی دادی سوچتی تھی کہ بیٹے کی شادی کر دینے کے بعد اب گھر میں اس کی پہلے والی حیثیت نہیں رہی تھی۔ یعنی اب اس کی ویسے عزت نہیں کی جاتی تھی جیسے کہ پہلے کی جاتی تھی۔ ایک دن اس نے سنا، اس کا پوتا آچوان اپنا تازہ سبق پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا، میرا خاندان، میری ماں میرے باپ اور میرے بہن بھائیوں پر مشتمل ہے اور اس میں اس نے دادا، دادی کا تذکرہ بالکل نہیں کیا۔ جب بڑھیا نے اس فقرے کی پوری ماہیت کو محسوس کیا تو وہ بہت غصے میں آ گئی اس نے چلاتے ہوئے کہا:

''میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ تمھیں میری بالکل پرواہ نہیں ملی کہ اب تم مجھے اپنے خاندان ہی میں شمار نہیں کرتے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک اینٹ اٹھا کر دے ماری، جس سے ایک کھانا پکانے والا برتن ٹوٹ گیا۔

''ماں تم ناراض مت ہو'' آچوان کے باپ نے کہا۔

''اپنے بیٹے کو ایسی بے ہودہ کتاب پڑھنے کی اجازت دینے سے بہتر ہے کہ میں جیل چلا جاؤں۔''

اگلے دن آچوان کے باپ نے وہ فالتو ملازم، جو اسے فارم پر رکھنا پڑا تھا، الگ کر دیا۔ سکول کے ٹیچر نے آچوان کے نام کے آگے کراس کا نشان بنایا، جس کا مطلب تھا کہ آچوان سکول سے غیر حاضر ہے!!!

☆☆☆☆

لیوٹالسٹائی

بچے بڑوں سے زیادہ سیانے ہوتے ہیں

اس سال ایسٹر کا تہوار وقت سے کچھ پہلے ہی آ گیا تھا۔برف گاڑیوں کے ذریعے سفر کرنے کا موسم بس ابھی ختم ہی ہوا تھا۔کچھ برف تو ابھی صحنوں میں پڑی ہوئی تھی اور باقی گدلے پانی کی صورت میں پگھل چکی تھی جو گاؤں کی گلی میں بہہ نکلی تھی۔

دو چھوٹی لڑکیاں، جن کا تعلق دو مختلف گھرانوں سے تھا، دو رویہ بنے ہوئے مکانوں کے درمیان والی گلی میں، ان کی ملاقات ہوئی، جہاں پانی نے بڑے اور گندے جوہڑ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک لڑکی تو بہت چھوٹی تھی اور دوسری قدرے بڑی۔انھوں نے بہت صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا کیوں کہ وہ ابھی ابھی گرجا گھر سے واپس آئی تھیں۔ایک نے نیلا فراک پہن رکھا تھا اور دوسری نے زرد پھولوں والا اور دونوں کے سروں پر سرخ رومال بندھے تھے۔انھوں نے کھیلنا شروع کیا اور نہایت معصومانہ انداز میں، سوچا کہ پانی کے چھینٹے اُڑانا چاہئیں۔چھوٹی لڑکی اپنے جوتوں اور دوسری چیزوں سمیت جمع شدہ پانی میں کودنے جا رہی تھی کہ بڑی نے اسے روک دیا۔

''ملاشا۔پانی میں مت جاؤ'' اس نے کہا: ''تمھاری امّی ناراض ہوں گی۔دیکھو! میں اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہی ہوں تم بھی ایسے ہی کرو۔''

دونوں نے ایسا ہی کیا پھر اپنے فراکوں کو، اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں سے اوپر تک کر کے وہ جمع شدہ پانی میں ایک دوسرے کی طرف چلنے لگیں۔پانی ملاشا کے ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔وہ بولی۔''دیکھو اکولیا! یہ کتنا گہرا ہے۔مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔'' ''ارے ڈرو نہیں۔''دوسری بولی: ''یہ اس سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔''

جب وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئیں تو اکولیا نے کہا: ''ملاشا ذرا احتیاط سے! چھینٹے مت اڑاؤ' احتیاط سے چلو۔''

وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ ملاشا نے پانی میں بے تحاشا کودنا شروع کر دیا اور اس طرح

پانی کے چھینٹے سیدھے اکولیا کے صاف ستھرے فراک پر پڑے۔ فراک پر گندے پانی کے دھبے پڑ گئے اور اکولیا کی آنکھیں اور ناک بھی ان گندے چھینٹوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ جب اس نے اپنے فراک پر یہ گندے دھبے دیکھے تو وہ غصے میں آ گئی اور وہ ملاشا کو مارنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑی۔ ملاشا ایک دم سے ڈر گئی اور جب اس نے اپنے آپ کو مصیبت میں گھرے دیکھا تو وہ گندے پانی سے نکل کر گھر کی طرف بھاگی۔ عین اسی وقت اکولیا کی امّی بھی ادھر سے گزریں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی کے صاف ستھرے فراک کا ستیاناس ہو گیا ہے اور اس کے چہرے اور ہاتھوں پر بھی کیچڑ ہے تو اس نے کہا۔

''تم شریر گندی لڑکی۔ یہ تم کیا کر رہی تھیں۔''

''ملاشا نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی اکولیا کی امّی نے ملاشا کو پکڑ کر اس کے سر ایک چپت رسید کر دی۔ ملاشا نے چیخنا شروع کر دیا اور اس کے، اس شور کو ساری گلی میں سنا گیا۔ اُس کی امّی اُس کی آواز سن کر اپنے گھر سے باہر دوڑ پڑی۔

''تم نے میری بیٹی کو مارنے کی جرأت کیسے کی۔'' وہ بولی اور اس نے اپنی ہمسائی کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ بات سے بات بڑھی اور انھوں نے بہت بُری طرح لڑنا شروع کر دیا۔ مرد بھی اس جھگڑے میں شامل ہو گئے اور یوں گلی میں ایک اچھا خاصا ہجوم ہو گیا۔ وہ تمام کے تمام چیخ رہے تھے اور لڑ رہے تھے۔ تب کسی شخص نے دوسرے کو دھکا دے دیا اور پھر تقریباً ہاتھا پائی پر اترنے والے تھے کہ اکولیا کی بوڑھی دادی نے مداخلت کی اور ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''دوستو! تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟ کیا اس طرح کرنا ٹھیک ہے؟ اور وہ بھی اس بڑے دن کے موقع پر۔ یہ تو خوش ہونے کا وقت ہے، لڑنے کا وقت نہیں۔''

لیکن کسی نے بوڑھی عورت کی بات نہ سنی اور انھوں نے تقریباً لڑتے لڑتے اسے گرا ہی دیا۔ اسی دوران میں جب تمام عورتیں ایک دوسرے کو گالیاں دے رہی تھیں، اکولیا اور ملاشا ایک بار پھر ایک دوسرے کی دوست بن گئی تھیں۔ اکولیا نے اپنے فراک اور چہرے سے کیچڑ صاف کر لی تھی اور پھر جمع شدہ پانی میں کھیلنے کے لیے واپس آ گئی تھی۔

اس نے ایک پتھر لیا اور اس کی مدد سے، اس نے جمع شدہ پانی کے کنارے سے زمین کو گہرا کھود کر ایک چھوٹی سی نہر کی شکل دے دی تاکہ پانی گلی میں بہہ کر نکل سکے۔ اس کام میں ملاشا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اس نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مدد سے اس نہر کی کھدائی میں اس کا

ہاتھ بٹایا اور جس وقت مردوں نے بھی بھرپور انداز میں جھگڑنا شروع کر دیا تو ان دونوں لڑکیوں کی بنائی گئی نہر سے پانی بہہ کر عین اس جگہ پر آ گیا، جہاں وہ بوڑھی عورت ابھی تک لوگوں کو امن وامان سے رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ لڑکیاں اس نہر کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

''پکڑو۔ ملاشا اسے پکڑو۔'' اکولیا چلائی۔ اس وقت ملاشا اتنے زور سے ہنس رہی تھی کہ کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

خوشی سے مغلوب ہو کر اور اس لکڑی کے ٹکڑے کو پانی کے ساتھ ساتھ بہتا دیکھتے ہوئے دونوں لڑکیاں ٹھیک اس جگہ پہنچ گئیں جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بوڑھی عورت نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر لوگوں کو مخاطب کیا۔

''کیا تمھیں اب اپنے اوپر شرم نہیں آ رہی۔ تم نے انھی دو بچیوں کی وجہ سے لڑنا شروع کیا تھا جنھوں نے اس واقعے کو بھلا کر پھر سے دوستی کر لی ہے اور ہنسی خوشی کھیل رہی ہیں۔ یہ معصوم بچیاں۔ یہ تم سے زیادہ عقلمند ہیں۔''

مردوں نے ان لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے شرمندہ ہو کر لڑنا جھگڑنا بند کر دیا پھر وہ سب ہنستے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔!!!!

☆☆☆☆

فواد تیکرلی

تنور

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ شروع میں، میں نے سچ نہیں بولا۔ اگر چہ میں زیر حراست تھا مگر میں نے ایک ماہ سے زیادہ اسے چھپائے رکھا۔ عزت بڑی قیمتی چیز ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کب سچ کو ظاہر کر دینا چاہیے۔

جناب والا میں بے گناہ ہوں۔۔۔۔ میں نے اپنے بھائی عبدل حمزہ کی بیوی فرح کو قتل کر دیا کیوں کہ وہ بدکار تھی۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور پھر عرب روایت سے مغلوب ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پاک دامنی بہت قیمتی چیز ہے اور اس پر لگے دھبے خون ہی سے دھونے کا رواج ہے۔ اس لیے میں نے اپنی شکاری بندوق لوڈ کی، جس کو آپ ملاحظہ کر چکے ہیں' اور اسے فوراً گولی مار دی۔ اگر آپ اس کے آشنا کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو مجھے شروع سے اس کہانی کو بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔؟

جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، میں نے ان دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔ وہ صبح سویرے سرخ اور سفید رنگ کا چوغہ پہنے، ہمارا ناشتہ تیار کرنے کے لیے، اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ روٹی پکانے کی غرض سے تنور کو آگ دکھانے کے لیے، اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے اطلاعاً مجھے کہا کہ چوں کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی ہے، اس لیے وہ خود کو مار دینا چاہتی ہے۔ اس نے تنور میں آگ جلانی شروع کی اور پھر خودکشی کرنے کے لیے، اس نے اس میں چند گولیاں پھینکنے کی تیاری کی۔ خون میری رگوں میں جوش مارنے لگا' میں نے رائفل اٹھائی' اس کا نشانہ لیا اور فائر کر کے اسے مار دیا۔ عزت بہت انمول ہوتی ہے۔ ہم سچے عرب ہیں اور ہم بے شرمی کا داغ اپنے اوپر نہیں لگنے دیتے۔ بدکاروں کو عموماً قتل کر دیا جاتا ہے کیوں کہ گناہ گار ایک گندگی ہوتا ہے۔ اس لیے اس گندگی کو دور کرنا ہی چاہیے۔ فرح نے خود تسلیم کیا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کی گرفتاری کے بعد' اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رات کی تاریک میں اپنے آشنا کو، اپنے ساتھ سونے کے لیے کہا تھا۔ میں نے صرف اپنے خاندان کے

ناموس کی حفاظت کی تھی۔اس کا شوہر میرا بھائی ہے اور وہ میری بھابھی ہے۔اس نے اس برے کام کے لیے اپنے آشنا کو وقت دے کر اپنی جوانی اور خوب صورتی کا ناجائز استعمال کیا تھا۔اس لیے کہ وہ شہد رنگ آنکھوں اور خوب صورت چہرے والی، صرف انیس سالہ عورت ہے۔اس طرح ہر چیز ختم ہوگئی۔

میری بہن حلیمہ نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں خدا کی مقدس کتاب کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں ۔۔۔۔ کہ وہ اس وقت میرے ساتھ تھی اور شریک جرم نہیں تھی۔ وہ گھر کے ایک دوسرے حصے میں تھی۔ میں اس معزز عدالت کی وضاحت کے لیے اپنے خاندانی معیار کے متعلق یہ کہنا چاہوں گا کہ ہم غریب لوگ ہیں اور کئی کمروں پر مشتمل، ایک کچے مکان میں اکٹھے رہتے ہیں۔ میرے بھائی عبدل حمزہ کا کمرہ شرقی حصے میں ہے اور اس سے ملحق میری والدہ اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے کمرے ہیں۔ میری شادی ہوئے دس سال ہو چکے ہیں اور میں چار بچوں کا باپ ہوں۔ میں فوج میں تھا اور وہاں میں نے سرجنٹ کے عہدے تک ترقی پائی۔ میرے خلاف کبھی کوئی مقدمہ درج نہیں ہوا۔تنور میری بہن حلیمہ کے کچے کمرے کے بالکل ساتھ صحن کے وسط میں واقع ہے۔ میں عدالت کے سامنے اس چیز کی وضاحت کرنا بھول گیا تھا۔

وقوعہ کے روز صبح کے وقت میری بہن نے مجھے جگایا۔ میں یقینی طور پر جاگا ہوا تھا اور مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ میری خالہ نوریا نے جو میرے بھائی کی بیوی کے پاس تھی، گولیوں کے چلنے کی وجہ دریافت کی تھی۔ میں معلوم کرنے گیا تو میں نے فرح کو تنور کے پاس گرے ہوئے پایا اور گولیاں آتش دان میں دھماکے سے پھٹ رہی تھیں۔ جناب والا یہ میرے اس شہادتی بیان کی مختصر سی روداد ہے، جو آپ خود محسوس کر رہے ہیں کہ سچائی سے بہت دور ہے۔ میں نے ایسا بھولے سے کیا ہے جناب مہربانی کر کے مجھے معاف کر دیجیے۔ہم نے اپنے حواس کھو دیے تھے،اس لیے ہر طرح سے چشم پوشی برتی۔ بدقسمتی سے سچائی کو چھپایا یا دبایا نہیں جا سکتا۔اس رات، جب میں سویا ہوا تھا تو چار یا پانچ بجے کے قریب جب صبح ہونے والی تھی تو میری بہن حلیمہ نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے مجھے جگا دیا کہ اس نے صحن میں کسی کو تیزی سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اٹھ بیٹھا اور اپنے والدین کے کمرے کی طرف گیا' وہ ابھی سو رہے تھے، پھر میں فرح کے کمرے کی جانب گیا' میں نے اسے اکیلا پایا۔ یہ بات بعد میں سامنے آئی کہ حلیمہ نے، جو سترہ سال کی ایک بے حد حساس لڑکی ہے'' آپ کے سامنے حلف اٹھا کر کہا کہ اس نے فرح کو ایک اجنبی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے دیکھا تھا اور اس لیے وہ مجھے

جگانے آئی تھی اور میں معاملے کی چھان بین کے لیے چل پڑا تھا۔اس لمحے میں نے فرح کو تنور روشن کرتے ہوئے پایا تھا۔ یہ وہ حقائق ہیں۔آسمان روشن ہو رہا تھا اور تنور سرخ بھرے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔فرح نے میری طرف مڑے بغیر مجھے مخاطب کرتے ہوئے گناہ،عزت اور خودکشی کے بارے میں بات کی۔میں الجھن میں مبتلا ہو گیا اور سخت طیش میں آ گیا۔تیزی کے ساتھ میں نے رائفل حلیمہ کے ہاتھ سے چھینی اس کا رخ فرح کی طرف کیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔اس کی لاش کے قریب پڑی پائی گئی، اس شکاری رائفل سے صرف ایک فائر کیا گیا تھا۔رائفل میں صرف ایک ہی گولی بھری تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہی ایک گولی اس کے سر میں جا گھسی تھی' میں نے یہ محض خاندانی حرمت کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ جناب والا میری درخواست ہے کہ'میری صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے ،میرے خاندان کی حالت پر رحم کیا جائے۔میں ایک کم پڑھا لکھا مسکین شخص ہوں اور ایک سابقہ سرجنٹ ہوں۔میں نے اسے صرف اس لیے قتل کیا کہ وہ وفادار نہیں رہی تھی۔

آپ نے جان لیا ہے کہ اپنے اس گناہ کا اس نے میرے سامنے اعتراف کر لیا تھا' وہ تنور کے سامنے کھڑی اس کا اعلان کر رہی تھی اور ہم سب کی عزت پامال کر رہی تھی۔نوریا کا یہ بیان کہ وہ ساری رات اسی کمرے میں فرح کے ساتھ رہی تھی،کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔وہ غیر متوازن شخصیت کی حامل ایک عورت ہے۔اور پھر یہ کہ مرنے والی نے اپنے گناہ کا اعتراف میرے سامنے کر لیا تھا۔مزید یہ کہ میری بہن حلیمہ نے ،اسے ایسی شرمناک حالت میں دیکھ لیا تھا، جو قانون اور وقار کے منافی تھی۔اس نے اپنے شوہر کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے،اس رات اپنے آشنا کے ساتھ یہ قبیح فعل سرانجام دیا۔اس رات جب کہ ہم سب اپنے بھائی عبدل حمزہ کی نظر بندی کے متعلق متفکر تھے،اس نے اس مجرم کے ساتھ ملاقات کرنے کا منصوبہ بنانے کی جرأت کی۔میں کوئی اتنا زیادہ مہذب شخص نہیں ہوں مل کہ کسی حد تک ایک کھردرا رویہ رکھنے والا آدمی ہوں۔میں اپنے مقام سے اچھی طرح واقف ہوں،حالاں کہ میں صرف تیس سال کا ہوں۔میں نے فرح سے اچھی طرح سے،اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ایسی بدکاری کا یہ جرم ہمارے اہل خانہ میں سے کسی سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ہم قابلِ عزت اور قدامت پسند بدو ہیں' جو اس بےعزتی کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔میں نے ہر طرح سے،اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے خیالات اور تصورات سے دور رہتے ہوئے ،ایسی گھناؤنی تہمتیں لگانے سے باز رہے۔لیکن وہ ایک دیوانے شخص کی طرح بےحس ہو چکی تھی۔میں نے اسے،اس امید کے ساتھ،اس کے کمرے میں جانے

دیا کہ شاید وہ اپنے رویے میں نرمی پیدا کر لے گی ۔ جو کچھ ہوا تھا، میں نے اس کے متعلق حلیمہ کو بتا دیا اور اس واقعے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا ۔ ابھی میں نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ میں نے ایک گولی چلنے کی آواز سنی ۔ میں مدھم روشنی میں نہائے ہوئے صحن کی طرف گیا، جہاں آتش دان سے شعلے بلند ہو رہے تھے ۔ خالہ نوریا نے مجھ سے گولی کی آواز اور فرح کے بارے میں استفسار کیا ۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے اسے ایک طرف دھکیلا اور بھاگ کر اپنے بھائی کے کمرے کی طرف گیا، جہاں میں نے ان دونوں کو اکٹھے دیکھا ۔ وہ یا تو قتل کر دی گئی تھی یا اس نے خودکشی کر لی تھی ۔ میں نے ریوالور لیا اور حلیمہ کے ساتھ، اس کے کمرے میں واپس آیا ۔ میں ایک بار پھر سچائی سے ہٹ رہا ہوں ۔ جناب والا یہ ہماری فطرت ہے ایسی فطرت، جس کے آپ عادی نہیں اور نہ ہی اسے برداشت کر سکتے ہیں ۔ ہم ایک نقطے پر مرتکز رہنے کے اہل ہی نہیں ہیں ۔ ہم ایک موضوع کو شروع کرتے ہیں اور پھر درمیان ہی میں ہم کسی اور دلچسپ اور پرجوش واقعے کی طرف ہو لیتے ہیں اور پھر کسی ایسے تیسرے موضوع کی طرف رجوع کر لیتے ہیں' جو ہمارے دل کو بھاتا ہو ۔ ہم تفاخر اور کھرے پن کے حامل، ایسے لوگ ہیں، جو امن کے ساتھ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ ہمارے متعلق بیان کی جانے والی اکثر کہانیوں بے بنیاد ہوتی ہیں ۔ مزید یہ کہ میں ایسا بے گناہ شخص ہوں، جیسا کہ میں نے کئی بار دہرایا ہے ۔ میں نے کسی ایسے عزت دار شخص کی طرح اپنے وقار کو بچایا، جس کے میری طرح چار بچے ہوں اور اس پر، ایک بڑے خاندان کا بوجھ ہو ۔ وقار ناقابل تقسیم ہے، چاہے اس کا تعلق بدکاری سے ہو یا کسی سکینڈل سے ۔ اپنی پاک دامنی کو برقرار رکھنا ہی ہمارا مقصد ہے اور ہم اپنے خون سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں ۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے ۔ آپ کے سامنے اس پیچیدہ صورتحال کی وضاحت کرنا مشکل ہے کیوں کہ میں ایک جاہل بدو ہوں ۔ بہرحال یہ سب کچھ بہت سادہ ہے اور میں آپ کے سامنے حقیقت بیان کروں گا ۔

ہمارا ایک خاندان ہے ۔ میرا بھائی عبدل حمزہ اور اس کی مرحومہ بیوی گھر کے ایک حصے میں رہتے ہیں ۔ اس سے اگلے حصے میں' میری ماں' باپ' میں خود میری بیوی اور چار بچے رہتے ہیں اور پھر کنوئیں کے ساتھ والے کمرے میں، میری ماں کی بیٹی حلیمہ رہتی ہے ۔ تنور صحن کے درمیان میں واقع ہے ۔ اس حادثے کے روز میرا بھائی گرفتار ہو گیا تھا ۔ اس نے میری نصیحت کے برعکس زرعی اصلاحات کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی، جس کے نتیجے میں وہ گرفتار ہو گیا تھا ۔ خالہ نوریا میری بھابھی کے ساتھ سونے کے لیے آئی ۔ ۔ ۔ سادہ اور واضح حقائق ۔ پھر مرنے والی عورت کا آشنا چوری چھپے گھر میں داخل

ہوا۔ صحیح وقت کا تو ہمیں علم نہیں، شاید آدھی رات کے وقت یا اس سے بھی بعد، بہر حال خاندانی وقار داؤ پر لگا دیا گیا۔ صبح ناشتے کے لیے روٹی وغیرہ پکانے تک حالات نارمل تھے۔ پھر وہ شرمناک حقائق اچانک سامنے آ گئے۔ فرح نے رات کو اپنے شوہر سے دھوکا کیا تھا۔ صبح اٹھنے پر اس نے دوسروں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے، اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا، جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنے جرم کو چھپا نہ سکی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ذریعے، اس نے عندیہ ظاہر کیا کہ وہ اس گھر کی عزت کو بچانے کے لیے، اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر لے گی۔ حلیمہ نے نہایت حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس نے، اسے اپنے آشنا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے، بالکل برہنہ حالت میں دیکھا تھا۔ تلخ سچائی کو سامنے پا کر اور گھبراہٹ سے مغلوب ہو کر وہ اپنے منہ کو اپنے ہاتھ سے بند کیے ہوئے، تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ میرے لیے اس بے عزتی کے داغ کو اس کے خون سے دھونے کے علاوہ چارہ کار نہ تھا۔ جناب والا ہم ایسی حالتوں میں یہی کچھ کرتے ہیں۔ میں نے لباس پہنا اپنی شکاری رائفل اٹھائی اور اس کے پیچھے چلا آیا۔ جیسے کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ابھی صبح ہوئی ہی تھی اور وہ تنور میں آگ جلا رہی تھی۔ ہم وہاں اکیلے تھے اور اس نے واضح طور پر، اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا کیوں کہ وہ اس بدکاری کی سزا سے بچنے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے پاس اسے، اس رائفل سے قتل کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ بعد میں حلیمہ نے نہایت عیاری سے کچھ گولیاں (رائفل کی گولیاں) تنور میں ڈال دیں جن کے پے در پے دھماکوں نے سارے گھر کو جگا دیا۔ جناب والا! یہی سچائی ہے۔ حلیمہ کے خلاف لگائے گئے الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں۔

نوریا نے ساری رات فرح کے ساتھ رہنے سے متعلق جھوٹ بولا تھا اور یہ بھی جھوٹ کہا تھا کہ اس رات گھر میں کوئی داخل نہیں ہوا تھا اور کسی نے فرح کے ساتھ محبت بھرے لمحات نہیں گزارے تھے۔ اس سے پوچھا جائے کہ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس نے صبح سویرے فرح کو بے دار ہوتے اور پاک دامن لوگوں کی طرف، اسے بغور دیکھتے ہوئے پایا؟ کس نے اسے ناشتہ تیار کرنے، روٹی پکانے یا تنور گرم کرنے کو کہا تھا؟ اگر اس نے کسی در پردہ محرک کے بغیر اپنے شوہر کی غیر حاضری میں اپنے آپ یہ سب کچھ کیا تھا تو پھر وہ حلیمہ کے کمرے میں کیوں داخل ہوئی؟ جب کہ ہمیشہ ہی ناشتہ تیار کرنے میں اس کی مدد کیا کرتی تھی۔

نوریا کا یہ الزام کہ اس نے فرح کو ہماری طرف، میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے

دیکھا تھا۔جھوٹ ہے ۔۔۔۔اور یہ کہ اس نے مرتے وقت کچھ غیر واضح سے لفظ ادا کیے تھے ۔۔۔۔سراسر جھوٹ ہے ۔۔۔۔یہ دونوں باتیں جھوٹی ہیں ۔یہ سب کچھ نہایت احمقانہ ہے ۔میں نے فرح کوتنور کے پاس سے، جہاں اس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا تھا، گھسیٹا اسے گھسیٹ کراس کے کمرے میں لایا اوراس کے بعد، اس کے ساتھ پہلی والی پوزیشن پر واپس آ گیا ۔یہ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ وہ کہاں گری تھی اورکہاں مری تھی ۔

میڈیکل رپورٹ میں جو کچھ کہا گیا ہے کہ فرح ریوالور کی ایک گولی سے مری تھی ،غلط ہے ۔ میں نے ٹرائیگر دبایا تھااوراس لمحے، اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ،ہتھیار کے بارے میں، میں پوری طرح آگاہ تھا۔

حلیمہ اس واقعے میں ملوث نہیں ہے ۔جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا غلط ہے ۔میں استدعا کرتا ہوں کہ اسے اس جرم سے علاحدہ رکھا جائے ۔وہ کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ۔مجرم میں ہوں ۔اگر آپ جاننا چاہیں تو یہ میں ہوں، جس نے اپنی عزت بچانے کے لیے، اس بدکار کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا تھا۔ جناب والا میں بے گناہ ہوں ۔آپ اپنا فیصلہ سناتے ہوئے مجھ پر رحم کریں ۔ میں نے یہ جرم ایک نیک اورشان دار مقصد کے تحت کیا ہے ۔اس لیے انصاف سے کام لیں اور میری سزا کو نرم کردیں ۔کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو میری غیر حاضری پر افسوس کریں گے ۔یقین کریں ۔۔۔۔یہ میری شامت اعمال ہے ۔

یہ سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے !!!''

☆☆☆☆

این وی ایم گونز یلز

نمک کی روٹی

عموماً میں رات دس بجے تک سو جاتا ہوں اور اپنی چودہ سالہ عمر کا ایک اور دن گزارنے کے لیے صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھتا ہوں۔ اگر کبھی دادی اماں بھول جائیں تو مجھے پندرہ سنینا واس کے سکوں کے ساتھ پروگر یسو سٹریٹ میں نانبائی کی دکان پر پہنچنا ہوتا ہے، اپنی جیب میں پڑے ان سکوں کی کھنک مجھے بہت بھاتی ہے۔ دادی اماں چوں کہ اپنی تین عدد داڑھیں کھو چکی ہیں، اس لیے مجھے یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ روٹیاں کس معیار کی ہوں۔ میرے اور میرے کزنوں جیسی عمر کے نوجوانوں کے لیے ان کے نزدیک Pande sal قسم کی روٹیاں عموماً ٹھیک رہتی ہیں۔

نمک کی روٹی! اس کا نام کیسے پڑا؟ کون سے آٹے اور سفوف خمیر کے ذریعے اس روٹی نے یہ خوشبو پائی؟ اپنے آپ سے پہلے پہنچ جانے والے خریداروں کی دھکم پیل سے بچنے کے لیے مجھے دکان میں جلد پہنچنا ہوتا تھا تا کہ میں جلتے ہوئے تنور کے منہ میں، اپنے لمبے چوڑے لکڑی کے پھاوڑے نما ہتھیاروں سمیت، ان آدمیوں کو آدھے دھڑ تک تنور کے اندر اور باہر آتے جاتے دیکھ سکوں۔ پتہ نہیں کیسے تنور میں سے وہ میری چھوٹی سی کلائی کے برابر کی ہلکی براؤن رنگ کی روٹیاں برآمد کر لیتے تھے؟ تنور سے برآمد ہونے والی روٹی پتا نہیں کیسے درد سے سکوڑے گئے دو ہونٹوں جیسا تاثر لیے ہوئے ہوتی تھی؟ گلی کی مدھم روشنی میں تیزی سے واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے، جب میں روٹیوں کا لفافہ اپنے سینے سے چمٹا لیتا تھا تو تنور سے نکلی ہوئی، تازہ روٹیوں کی گرمی مجھے ایسی فرحت بخشتی کہ میں ہمیشہ پرغرور انداز میں گھر کی طرف لوٹتا۔

میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اگر میں روٹی کا ایک آدھا ٹکڑا توڑ کر راستے میں کھا لیتا تو شاید دادی اماں اس بات کا برا نہ مناتیں۔ ہو سکتا تھا کہ میں ایک سے زیادہ یعنی دو ٹکڑے کھا لیتا جو کہ بعد میں، میرے حصے سے کم کر دیے جاتے۔ لیکن یہ ایک دھوکہ دینے والی بات تھی اس لیے میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ روٹی کی حفاظت کے لیے میں قدم نہایت احتیاط سے اٹھاتا تھا اور گلی کے

اندھیرے حصوں سے بچ کر چلتا تھا۔

اس سفر کے دوران میں اپنی لطف اندوزی کے لیے میں حفاظتی بند کی طرف ،پچاس گز یا اس سے کچھ زیادہ آگے دریا کی گزرگاہ کے پرے موجود ایک بوڑھے پینی کے گھر کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ جب پانی کم ہوتا اور دریا کی گزرگاہ تقریباً خشک ہوتی اور وہاں پڑی ٹوٹی ہوئی بوتلوں سے چٹانیں چمک رہی ہوتیں ،تو اس اینٹی کے گھر کے صحن کی پتھریلی دیوار ایک قلعے کا منظر پیش کرتی تھی۔ بیرونی دیوار کے قریب کم اونچائی میں تعمیر کیے گئے باغ کے شیڈ اور لانڈری کی چھت سورج کی روشنی میں چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ دھندلی صبحوں کو زمین سے چار یا پانچ گز اوپر تک بنی ہوئی بانسوں کی مدد سے بنائی گئی سکرین سے جو برآمدے کو ڈھانپے ہوئی ہوتی تھی روشنی جھلملاتی تھی۔ البتہ اگست کے مہینے میں شمال مشرق سے آنے والی نم آلود مون سون کی ہواؤں سے کمروں کو بچانے کے لیے ساڑھے چھ بجے سے پہلے پہلے تین ملازم تیزی کے ساتھ اس سکرین کو اوپر اٹھا دیتے تھے اور یوں برآمدہ اس کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ ان چرخیوں کے گھومنے کی آواز سنتے ہی میں جان لیتا کہ سکول جانے کا وقت ہوگیا ہے۔

میرے دادا نے ناریل کاشت کرنے والے ایک اوورسیئر کی حیثیت سے تیس سال تک ملازمت کی تھی۔ تین سال پہلے میری دادی اماں بیوہ ہوگئیں تھیں۔ میں اکثر حیرانی کے ساتھ یہ سوچا کرتا تھا کہ کیا میں آنے والے دنوں کو اس عظیم گھر کی خدمت کرتے ہوئے ہی گزاروں گا۔ ایک دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہائی سکول میں پڑھنے والی ،میری کلاس فیلو ایدا اس بوڑھے اینٹی کی بھتیجی تھی۔ میرے تمام شکوک وشبہات جاتے رہے۔ کیوں کہ میرے دادا نے اپنی موت سے پہلے ،اس معاملے کی نزاکت سے قطع نظر ،مذاق کے انداز میں اس کے متعلق یہ بات بتائی تھی اور اس کے مطابق بالکل یہی وقت ہوتا تھا ،جب وہ اپنے چچا کو خدا حافظ کہنے کے لیے اپنے بیڈروم سے باہر نکلتی تھی۔ حالاں کہ میں حقیقت کو جانتا تھا کہ اس طرح اس وقت ،اس کے باہر آنے کا مقصد میری آنکھوں کی پیاس بجھانا ہوتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ایسا وہ محض اس لیے کرتی تھی کہ لوگوں کو میرے اور اس کے باہم تعلق کے متعلق حقیقت کا واضح طور پر پتا نہ چل سکے۔ بعد میں کئی سالوں بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کے نام کے حوالے سے ،میرے حافظے میں محفوظ رہنے والی کئی یادیں جنم لینے والی تھیں اور جنھیں موضوع بحث بھی بننا تھا۔ لیکن ان دنوں تو یہ۔۔۔ یعنی اس کا نام ایک زندہ حقیقت تھا۔ مجھے سرگوشی سی سنائی دیتی۔۔۔ اس کا نام مجھ سے کہتا: ''تمھیں مجھے دہرانے کا اعزاز حاصل رہے گا۔۔۔ شاید؟ ''اور بعد میں ،میں نے

کوشش کی کہ میں اس بات کی لاج رکھ سکوں۔ سکول میں ان دنوں ہینڈ بال کے کھیل کا بہت چرچا تھا اور جب بھی، میں کوئی میچ جیتتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میرا جسم سورج کی روشنی میں یوں چمک اٹھتا تھا جیسے کہ یہ تانبے کا بنا ہوا ہو۔ میں اپنے خیالات کو بے راہ روی کا شکار نہ ہونے دیتا۔ کلاس میں بھی، میں اپنا سبق دھیان سے پڑھتا تھا۔ ہمارا انگریزی کا استاد جو بھی سوال کرتا، میں فوراً اس کا جواب دیتا تھا۔ ایک دن اس نے ہمیں رابرٹ لوئس سٹیون سن کی کہانی ''The Sire de Maletroie,s Door'' پڑھائی یہ ہمیں اتنی اچھی لگی کہ ہماری سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ مستقبل میں شاید کسی دن کسی وقت کبھی کوئی مہربان بوڑھا مجھے خاموشی سے ایک کمرے میں لے جائے گا، اس کے ہاتھ میں لالٹین پکڑی ہوگی اور رات بھر وہ مجھے اس کمرے میں رو کے رکھے گا اور پھر صبح کے وقت اچانک مگر یقیناً مجھ پر یہ انکشاف ہوگا کہ ایدا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔

اور شاید یہ میرا وائلن تھا کہ جس پر اس کے نام کا جادو چل گیا تھا۔ میسٹر وانتوئین نے میری موٹی انگلیوں کی چابک دستی کی تعریف کی تھی۔ جلد ہی میں نے موسیقی کی کتاب کا دو تہائی حصہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ میرے چھوٹے سے بازو نے صحیح انداز میں حرکت کرنا سیکھ لیا تھا۔ بعض اوقات جب میں صبح موسیقی کا ریاض کر رہا ہوتا تھا تو مجھے لگتا کہ دریا کے پار میری انگلیوں سے برآمد ہوتی اور بکھرتی دھنیں ابھی اتنی پختہ نہیں ہوئی تھیں۔

آخر کار ہمارے سکول کے آرکیسٹرا کا انچارج مسٹر کسٹوڈیو میری لگن سے آگاہ ہو گیا۔ وہ مجھے وائلن کے دوسرے گروپ سے نکال کر پہلے گروپ میں لے آیا۔ اظہار تشکر کے دن کے پروگرام میں اس نے مجھے وائلن پر ایک مکمل دھن بجانے کی اجازت دے دی۔

سب سے اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہا: ''یہ تو ایک دوسرا وائجو ہے۔۔۔۔ یہ ہمارا اپنا البرٹ سپالڈنگ ہے۔''

میرا خیال تھا کہ ایدا بھی سامعین میں ہوگی۔ میں نے جلدی سے ادھر اُدھر دیکھا، مگر مجھے وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ جب میں آرکیسٹرا سے فارغ ہوا تو میں نے پلچی سائنز ایک نامور موسیقار کو اپنا نام پکارتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''تمھیں میرے بینڈ میں شامل ہو جانا چاہیے کیوں کہ جلد ہی چھٹیاں ہونے والی ہیں، اس لیے ہمیں جلد ہی بہت کام مل جائے گا۔''

پیٹی نے میرا بازو دبایا۔ وہ خاصی دیر تک مجھے اپنے پرائیوٹ بینڈ ''منویلز آرکیسٹرا'' میں شامل ہونے کے لیے کہتا رہا۔ میں اس سے یہی کہتا رہا کہ میرے ذہن میں ابھی سکول کا کام ہی رہتا ہے۔ وہ بائیس سال کا آدمی تھا۔ میں اس کے ساتھ شامل نہیں ہوسکتا تھا کہ ابھی میں بہت کم سن تھا۔ وہ مہینے میں تین چار بار اپنے بینڈ کا کام کر کے سکول کی فیس وغیرہ کا بندوبست کر لیتا تھا اور اس طرح وہ اپنی ماں کی مدد بھی کر رہا تھا۔

اس نے مزید کہا: ''کل ہم ایک چینی شخص کے جنازے میں دھن بجائیں گے۔ یہی کوئی شام چار بجے تک۔ شام کو ہی ہم رولڈان کی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر پرفارم کریں گے ۔۔۔۔اور اتوار کو میونسپل ڈانس میں شرکت کریں گے۔''

میرا سر گھومنے لگا۔ ہمارے سامنے سٹیج پر پرنسپل نے امریکہ کے بارے میں تقریر شروع کر دی تھی۔ امریکہ کی مختلف رسوم ورواج وغیرہ۔ یا دعوتوں کے موقع پر مرغ کی دعوت کے متعلق وہ جو کچھ کہہ رہا تھا تو مجھے اس کی قطعی کوئی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں اس کی باتوں میں دلچسپی ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں ان پیسوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو مجھے آئندہ کمانے تھے۔ کئی دنوں سے میری ایک ہی خواہش تھی کہ میں کسی طرح سے سٹیشنری کا ریشمی بکس خرید لوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب رات کو گھر میں سناٹا چھا رہا ہوگا تو میں صفحے کے صفحے سیاہ کرتے ہوئے ان پر ایدا سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے لکھوں گا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ چھٹیوں کے لیے سکول بند ہونے سے پہلے کسی دن میں اسے الجبرا کی کتاب پڑھنے کے لیے دوں گا اور اس کتاب کے اوراق میں چپکے سے اپنا محبت نامہ رکھ دوں گا۔ وہ شاید میرے رقعے کا جواب تو نہیں دے گی نہ ہی ڈاک سے بھیجے گئے اور نہ ہی ہاتھ سے لکھے ہوئے کسی رقعے کا جواب آئے گا۔ لیکن کوئی بات نہیں ۔۔۔۔ یہ آرزوؤں سے لبالب بھرا ایک خاموش جواب ہوگا۔

رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دنیا کے بہت سے موسیقی کے مراکز کا دورہ کر کے لوٹا ہوں اور منیلا کے اخبارات میری تعریف سے بھرے پڑے ہیں۔ میں نے رسالوں کے ٹائٹل پر اپنی تصویریں دیکھیں۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ میں چند سال پیشتر بوناوزتا کی گلیوں میں کالے رنگ کے گتے کے بکس میں اپنا وائلن چھپائے آوارہ پھرتا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ نیویارک کے ایک لکھ پتی نے مجھے ایک نہایت قیمتی وائلن دینے کی پیش کش کی تھی، جس پر یہ الفاظ کندہ تھے: ''ایک ایسے بڑے فنکار کے لیے جو اپنے ملک کے لیے یقیناً ایک قابلِ فخر اثاثہ ہے'' ۔۔۔۔ میں نے اسی خواب میں اپنے

آپ کو، اسی لکھ پتی کے ہاں ہڈسن میں، اس کے گھر پر ویک اینڈ گزارتے دیکھا۔ سفید بلاؤز اور نیلے رنگ کے سکرٹ میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی اپنے دودھیا سفید ہاتھوں سے تالیاں بجا رہی تھی اور اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی "شاباش"۔۔۔۔!

اب لوگ جو محسوس کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ میں اپنے وائلن کے اسباق میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ میری خالہ جو دور دراز سے اپنے بچوں سے ملنے کے لیے، ان دنوں ہمارے ہاں آئی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ جو نوکرانی آئی ہوئی تھی وہی آج کل صبح نانبائی کی دکان سے Pan De Sal کا رول لا رہی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب صبح روٹی لانے کی ذمہ داری نبھانے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنی خالہ کا صحیح معنوں میں شکریہ نہیں ادا کر سکا تھا۔

میں گھر کا سودا سلف لانے کے وقت بھی اب لال پیلا ہونے لگتا تھا۔ میرے وائلن کو کام سے جی چرانے کا بہانہ سمجھتے ہوئے، خالہ نے مجھ پر جملہ چست کیا: "تم ایک موسیقار ہی کیوں بننا چاہتے ہو؟ پارٹیوں میں آخر میں موسیقار کھانے پینے میں ہی لگ جاتے ہیں۔"

میں نے اپنے آپ سے کہا وہ شاید باورچی خانے میں کام کرنے والی کسی نوکرانی کی غفلت سے بیرونی دیوار کے ساتھ پھینکی گئی، ہڈیوں پر لڑنے والے کتوں کے غول کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ تھی ہی اس قسم کی عورت کہ اس کے متعلق ایسی باتیں سوچی جا سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے سمجھا کہ اس کی باتوں کا زیادہ نوٹس نہیں لینا چاہیے۔ بہر حال اس کے ریمارکس نے مجھے تکلیف ضرور پہنچائی تھی۔ دادی اماں نے البتہ مجھے دھیان سے اپنے سکول کی پڑھائی کی طرف توجہ دینے کی تاکید کی تھی۔ میں ریہرسلوں کے لیے بار بار ریٹی سائنز کے گھر جاتا رہا۔

دادی کا مطالبہ تھا کہ میں اپنی ساری کمائی اسے دے دوں۔ اور میں انکار نہ کر سکا۔ علاحدگی میں، میں نے اپنی رقم کو گنا اور فیصلہ کیا کہ میں اس وقت تک اس کو واپس نہیں لوں گا، جب تک یہ اتنی نہ ہو جائے کہ میں اس سے ایک بروچ خرید سکوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں ایدا کو بروچ خرید کر کیوں دینا چاہتا تھا۔ بہر حال یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی تھی۔ میں دکانوں میں بروچ تلاش کرتا رہتا تھا۔ چینی نسل کے سیلز مین مجھے کم سن جان کر بروچ کی قیمتیں پوچھنے پر بہت جز بز ہوتے تھے۔

آخر کار کرسمس کا موسم آ گیا۔ میں نے ایدا کے گھر چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ اس کے والدین تو بیدا جوز میں رہتے ہیں، میرے دل میں ہول سا اٹھنے لگا۔ میں نے اس پر اپنی

محبت کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ میرے خطوط اَن لکھے رہ گئے تھے اور الجبرے کی کتاب بھی میں اسے پڑھنے کے لیے نہیں دے سکا تھا۔ بروچ کی تلاش بھی ابھی جاری تھی اور جس قسم کا بروچ میں چاہتا تھا وہ مجھے مل نہیں رہا تھا۔ رہی رقم تو وہ بھی دادی اماں کے اس پرس میں تھی جس میں سے "ٹائیگر بام" کی بو آتی تھی۔ میں بہت بے چین ہو رہا تھا کہ ہماری کلاس کا کرسمس پروگرام نزدیک آ رہا تھا۔ اور بالآخر وہ دن آ ہی گیا ـــــ یہ دسمبر کی ایک نیم گرم شام تھی۔ جب ہمارے انگلش کے ٹیچر نے یہ اعلان کیا کہ ہم لوگ آپس میں تحائف کا تبادلہ کریں۔ تو اس وقت میں نے کلاس روم چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ عین اسی وقت چیٹی دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ جب ہم پورچ میں پہنچے تو چیٹی بولا:
"میں تمھیں ایک راز کی بات بتانے لگا ہوں۔"

اس نے مجھے بتایا کہ اگلے اتوار کو مَنیلا سے صبح کے سٹیمر کے ذریعے ڈان ایستیبان (Dan Esteban) کی دو بیٹیاں جوزفینا اور ایلسیا آ رہی تھیں اور ریونا وزتا کے دومن کلب کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ناکتخدا عورتوں کو دوسری عورتیں بہت پسند کرتی تھیں۔ سالوں پہلے جب وہ نوجوان تھیں تو ان عورتوں نے جوزفینا کے ساتھ پیانو اور ایلسیا کے ساتھ بربط بجانے کی تربیت حاصل کی تھی۔ جب چیٹی مجھے یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ صبح سے بگل بجانے کی مشق کرنے کی وجہ سے اس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے، میں نے اپنے تصور میں شام کو چرچ کی دعائے خیر میں ان بہنوں کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ کو سنا۔ چوں کہ وہ بہت عبادت گزار تھیں، اس لیے عورتوں نے ان کی بہت تعریف کی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ جڑواں تھیں اور عمر زیادہ ہونے کے باوجود وہ اکثر ایک جیسا لباس پہنتی تھیں۔ ان کی وائل کی بنی چولیوں کو اور موسم گرما کے ہیٹ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ اس جوڑے نے بوڑھے ڈان ایسٹیبان کی ہدایت پر میرے دادا کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ میں حیران ہوا کہ پچھلے تین سال سے مَنیلا میں رہتے ہوئے وہ اپنے لیے مناسب شوہر تلاش کرنے میں کتنی کامیاب رہی تھیں۔

چیٹی نے کہا: "یہ حیران کن پارٹی ہوگی۔ پھر اس نے پورچ میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نہایت رازداری کے انداز میں کہا: "انھوں نے ہمارے بینڈ کی خدمات حاصل کی ہیں۔"

میں کلاس روم میں واپس پہنچا اور میں نے ہر ایک کو کرسمس کی مبارک باد دی۔ جب میں نے ایک کونے میں ایدا کو دو لڑکیوں کی طرف سے دیے گئے تحفے کے ڈبے کھولتے ہوئے دیکھا تو مجھ میں بھی

اسے مبارکباد دینے کی جرات پیدا ہو گئی۔

جس وقت اس تحفے والے ڈبے سے پاؤڈر کا ڈبہ اور ہیئر برش برآمد ہوا تو میں نے اسے انگریزی میں ''میری کرسمس'' کہا۔ میں نے اس وقت جانا کہ وہ واقعی ایسے تحفوں کی حق دار تھی۔ پہلے ہی سے کئی لڑکیاں ایدا کے گرد جمع تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ چوں کہ ایدا جیسے سفید گالوں اور گہرے براؤن رنگ کے سنورے ہوئے بالوں سے محروم تھیں، اس لیے ان کی آنکھوں میں حسد کی چمک تھی۔

میں خود بھی دم بخود سا تھا اور نہیں جان سکا کہ جواب میں مجھے ایدا نے کیا کہا تھا۔ بہر حال میں نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور پوچھا: ''کیا تم چھٹیوں میں یہاں نہیں رہو گی؟''

اس نے کہا: ''نہیں ـ ـ ـ ـ میں یہیں رہوں گی۔''

جب اس نے بتایا کہ اس کی کزنز آنے والی تھیں اور ان کے اعزاز میں ایک زبردست پارٹی کا انتظام کیا جانے والا تھا تو میں نے فقرہ کسا: ''اچھا تو تمھیں پہلے ہی سے سب کچھ معلوم ہے۔'' میں نے محسوس کیا کہ مجھے پارٹی کی اصل نوعیت کے بارے میں اسے بتانا چاہیے تھا۔

لیکن اب جب کہ وہ جانتی تھی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ پارٹی کس قسم کی تھی۔ وومن کلب کی کرتا دھرتا عورتیں اُدھر اُدھر دوڑتی بھاگتی یوں ظاہر کریں گی جیسے وہ چشمہ یا کسی اور قسم کی پارٹی میں کیکوں اور مٹھائیوں کے لیے دوڑ دھوپ کر رہی ہوں۔ آخر میں ریواس فیملی کی بہنیں ہر لحاظ سے ان سے بڑھ کر کارکردگی دکھائیں گی۔ مختلف قسم کی مٹھائیوں اور خاص طور پر منیلا کے سوس (Swiss) بیکرز کی بنی ہوئی مختلف قسم کی پیسٹریوں کے بکس یقیناً ان کے ہمراہ آئے ہوں گے۔ میں تصور میں ایک خوش نما سجی ہوئی لمبی میز کو دیکھ رہا تھا، جس کے درمیان سرخ پتھر کا چمک دار پیالہ پڑا تھا، جس میں پڑے سنہرے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مقامی انتظامیہ سے متعلق عورتیں گو کہ نہایت مخلصانہ طور پر کام کی مہارت دکھائیں گی اور بھرپور طریقے سے اپنا معیار برقرار رکھنے کی کوشش کریں گی، مگر پھر بھی وہ ڈان ایتیبان کی بیٹیوں کے معیار سے آگے بڑھ نہ پائیں گی۔ اور شاید میرے خیال میں ایدا کو اس بات کا علم تھا۔ اور یوں میں اور ایدا، ان بے چاری مقامی عورتوں کی امیدوں کو ابھی سے ناکام ہوتے محسوس کر سکتے تھے۔ ایدا اور میں ابھی سے اس صورت حال کو محسوس کر کے قہقہے لگا سکتے تھے۔

مقررہ شام کو سات بجے ہمارا چھوٹا سا بینڈ ڈان ایتیبان کے گھر کے دروازے پر خاموشی سے آن وارد ہوا اور جب عورتیں، جنھوں نے بھاری شالیں اوڑھ رکھی تھیں اور جن کا دوسرا لباس بھی زرق

برق قسم کا تھا، پر جوش انداز میں چمکنے لگیں تو ہمیں "شاعر اور کسان" کے عنوان سے ابتدائیہ کی دھن بجانے کا حکم ملا۔ جب پیٹی نے بینڈ کو ہدایت دینی شروع کی تو اس کی آنکھیں خود کو، اس بڑی دعوت کا حصہ محسوس کرتے ہوئے چمکنے لگیں۔ بوڑھے پیٹی کے باغبانوں نے رنگ برنگی روشنیاں منڈیر پر لٹکا رکھی تھیں اور جب یہ روشنیاں جل اٹھیں تو عورتیں فوراً بولیں کہ ڈان ایستیبان کی بیٹیوں نے بھی آخر کار کچھ تیاریاں کی ہوئی ہیں۔ پیٹی نے روشنی کی چمک سے بچنے کے لیے سر نیچے کر لیا تھا۔ اگر عورتیں اپنی سُبکی محسوس کریں تو وہ اس کا اظہار نہیں کرتیں۔

ابتدائیہ جب اپنے عروج پر پہنچا تو اسی دوران سفید قمیصوں میں ملبوس پانچ آدمی کھانے پینے کی چیزوں کے بڑے بڑے بکس اٹھائے گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے یونی فارم کو دیکھ کر ان میں سے ایک نانبائی کو پہچان لیا تھا۔ مبارک بادیوں کا غلغلہ اٹھا۔ عورتوں کے ہجوم نے گھر پر یلغار کر دی اور اس سے پہلے کہ ہم "گلابوں کا گلدستہ" نامی دھن بجانا شروع کرتے، دور کمرے کے آخر میں کھنچے بھاری پردے اٹھا دیے گئے اور چھت سے لٹکتے خوب صورت فانوس کی روشنی میں ایک لمبی سجی سجائی میز دکھائی دی۔ مجھے یاد ہے کہ گیت کی دھن بجانے کے سلسلے میں بے ترتیبی سے جلدی ہاتھ چلانے والے بینڈ کے ممبران کو ہم نے کھانا کھانے کی فوری خواہش کو دبائے رکھنے کو کہا تھا۔ جڑواں بہنوں میں سے ایک جوزفینا جو کہ زیادہ خوب صورت تھی اس نے کہا: "خواتین۔۔۔۔آپ کے آنے کا بے حد شکریہ!"

عورتوں نے کورس کے انداز میں جواب دیا: "لیکن تم نے ہمیں حیران ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔"

عورتوں کے خوب صورت ملبوسات کی سرسراہٹ اور ان کے کانوں میں لہراتے چمک دار بندوں کے درمیان اُن کا احتجاج جس میں آہیں شامل تھیں سنا جا سکتا تھا۔ میں نے ایدا کو ایک لمبا سفید گاؤن پہنے اور بالوں میں پھولوں کا گجرا سجائے ہوئے دیکھا۔ اس کے حکم پر دو ملازمین موسیقی والے کمرے سے ایک چمک دار بربط اٹھا لائے۔ چوں کہ ملازمین ننگے پاؤں چل کر آرہے تھے، اس لیے وہاں ہونے والی ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی سنی جا سکتی تھی۔ جب ایدا نے بربط کو ہمارے قریب رکھنے کا اشارہ کیا تو میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ گیا۔ جلد ہی وہ ہجوم میں کہیں کھو گئی اور ہم نے "جگنو کا ناچ" نامی دھن بجانی شروع کی۔ میں جب تک اپنی آنکھوں کو بند رکھ سکتا تھا، انھیں بند رکھا کیوں کہ ایسے میں اس کی یعنی ایدا کی روشن شخصیت میرے سامنے رہی۔

ایلیسیا نے بربط بجایا اور بے پناہ تالیوں کے شور میں، اس نے، اس کی فرمائش پھر پوری کی۔ بعد میں جوزفینا نے گیت گایا۔ اگر چہ اس کی آواز قدرے بھاری تھی، مگر اس نے بھرپور داد پائی۔ دوبارہ فرمائش پر، اس نے "موسم گرما کا آخری گلاب" گایا اور یوں اس کے گیت سے گزرے دنوں کی یادیں لوٹ آئیں۔ موسیقی کے اسباق کی یادوں میں گھرے ہم نے محسوس کیا، جیسے سارے ہال میں درختوں کے سبز پتے لہرا رہے ہوں۔ اس وقت ڈان اسٹیبان آ گیا۔ شروع میں، اس نے باتونی عورتوں سے فطری انداز میں شرماتے ہوئے اپنی مونچھوں کو مروڑا تھا اور بڑے خوب صورت انداز میں مہمانوں کو خوش آمدید کہا تھا۔

وہ بہت دیر تک بربط پر چھیڑی گئی دھن کو سنتا رہا اور سرگوشی کے انداز میں اپنے آپ سے کہتا رہا:

"یہ خدا تو خود گا رہا ہے۔۔۔۔خدا خود گا رہا ہے۔"

آدھی رات کے وقت یہ ہلا گلا ختم ہوا۔ جب لوگ کھانے کے لیے بڑی میز کے گرد جمع ہوئے ہم اس وقت تک دھن بجاتے رہے۔ میرا ذہن سمندر پار موجود، دور دراز کے ان ملکوں کے سفر پر رہا، جن کے میں خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ دونوں بہنیں ان ساری عورتوں میں بہت ممتاز اور منفرد دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر جیسے کسی کو ہمارا خیال آ گیا تھا اور آخر کار رچئی سائمز نے ہمیں موسیقی کے آلات کو ایک طرف رکھنے کو کہا۔ ہم ان ننگے پاؤں والے ملازموں میں سے ایک کی رہنمائی میں ہال میں ایک قطار میں چلتے ہوئے داخل ہوئے۔ ہمارے پیچھے پنچم میں؛ بلند ترین زنانہ آواز میں کچھ لوگ کھردرے انداز میں بربط کی سنگت میں "La Palomg" گانے لگے لیکن میں نے پیچھے مڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون تھے۔ چینی کے برتنوں اور چاندی کی چمک نے ہمیں چندھیا دیا۔ وہاں ہماری توقع سے بڑھ کر خورد و نوش کی اشیا موجود تھیں۔ میں نے مختلف کھانوں کے نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میں حیران تھا کہ وہ کھانے پینے کی اشیا کے ڈبے کہاں گئے جو بوئنا وزنا کی عورتوں نے پہلے ہی سے بھجوا دیئے تھے۔ میرے سامنے جو چاندی کا پیالہ دھرا تھا، اس میں، میں نے دیکھا کہ وہاں سالم انڈوں کی زردی کے مانند کوئی چیز تھی، جن کو شاید شہد اور روغن پودینہ میں ڈبویا گیا تھا۔ آرکیسٹرا کے گروپ میں موجود ہم ساتوں کے خیالات اس دعوت کے بارے میں ایک جیسے تھے اور اس یقین کے ساتھ کہ میں دوستوں کے درمیان موجود تھا' میں اپنے آپ کو لالچ سے نہ بچا سکا اور نہ صرف یہ کہ میں نے خوب جی بھر یہ کھانا

کھایا ملا کہ ان انڈوں کی زردی نما چیز کی ایک کافی بڑی مقدار میں نے کاغذ سے بنے کئی نیپکنوں میں لپیٹ لی تھی ۔ میرے ساتھیوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایسی حرکت کروں گا، اس لیے میں نے آسانی کے ساتھ ان کی نظروں میں آئے بغیر اس پیکٹ کو اپنی قمیص کے اندر چھپا لیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ پیکٹ کسی کو نظر نہ آئے گا۔

''کیا تم نے کھانا کھایا ہے؟''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایدا تھی ۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بو نائی، میری گردن پر تنگ ہونے لگی تھی ۔ میں کچھ بڑبڑانے لگا پتا نہیں میں کیا بک رہا تھا۔

''اگر تم سب لوگوں کے چلے جانے تک رک جاؤ اور میرا انتظار کرو تو میں تمھارے لیے، ان چیزوں کا بڑا سا پیکٹ بنا لاؤں گی ۔۔۔'' اس نے کہا' میں نے رومال اپنے منہ پر رکھ لیا تا کہ میں اپنے منہ پر لگے غذائی ذرات کو صاف کر سکوں ۔۔۔ حالاں کہ وہاں غذائی باقیات موجود ہی نہ تھیں ۔ اب اگر ایسے میں میرے منہ سے ایدا کے جواب میں ''نہیں ۔۔۔ شکریہ'' کے الفاظ برآمد ہوتے تو یقیناً میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے کہے ہوتے ۔ میں یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا تھا، وہ اس کے بارے میں جانتی تھی ۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بارے میں میری ساری گرم جوشی جاتی رہی تھی ۔

میں قریبی دروازے کی طرف بڑھا اور چاہتا تھا کہ میں ان بڑے بڑے پردوں کے پیچھے اپنی شرمندگی کو چھپا لوں ۔ دروازہ برآمدے کی طرف کھلتا تھا، جہاں کبھی میری محبت سورج کی روشنی میں پھلتی پھولتی رہی تھی ۔ باہر اس وقت اندھیرا تھا اور دریا کے کنارے کے قریب ہوا ہولے سے گنگنا رہی تھی ۔

میں نے نیپکن ہاتھ میں لیا اور اندھیرے میں ان انڈوں کی زردی نما اشیا کو پھینک دیا۔ میں نے باغ میں بنے شیڈ کی چھت پر ان اشیا کے زمین سے گرنے کی آواز کو سننے کا انتظار کیا۔ اس کے بجائے میں نے حفاظتی بند سے، پرے پانی کے تھپیڑوں کی آواز سنی اور اس سے پرے دادی اماں کے کمرے کی کھڑکی سے برآمد ہوتی روشنی تھی، جو مجھے گھر بلا رہی تھی ۔

لیکن پارٹی کوئی رات کے ایک بجے یا اس کے قریب قریب ختم ہوئی ۔ جب انتظام کرنے والی عورتوں نے ہمیں خدا حافظ کہا تو ہم اپنی موسیقی کے آلات سمیٹ کر وہاں سے چل پڑے ۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے جب ہم نے ''دنیا کے لیے خوشی'' کی دھن چھیڑی تو پروگریسو سٹریٹ کے دکان دار

اپنے بستروں میں اٹھ کر بیٹھ گئے ۔چینی تاجر خاص طور پر زیادہ شوقین ثابت ہوئے ۔ جب پیٹی نے ہمارے اجتماع کو ایک سٹریٹ لیمپ کے نیچے منتشر ہونے کے لیے کہا تو اس وقت تقریباً صبح ہونے والی تھی۔

گھر کا سفر اس نے میرے ساتھ طے کیا۔ہم نان بائی کی دکان پر رک گئے میں نے بتایا کہ میں اپنے پیسوں سے روٹی خرید کر دریا کے کنارے کنارے بنی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ دادی اماں کے گھر کی طرف چلتے ہوئے اسے کھانا چاہتا ہوں ۔وہ میری بات سن کر ہنسا۔۔۔اس کے نزدیک یہ بڑی عجیب بات تھی کہ شاید میں ابھی تک بھوکا تھا۔ہم کاؤنٹر پر اکیلے کھڑے تھے ہم بیکری کے کارکنوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ ہمارے جسم دروازے کے پار موجود گرم تنور کی حدت میں تپ اٹھے تھے۔۔۔ابھی صبح کے پانچ نہیں بجے تھے۔۔۔اور روٹی ابھی پک کر تیار نہیں ہوئی تھی۔۔۔!!

☆☆☆☆

زین العابدین الحسینی

خمیس پہلے مرجاتا ہے

ا۔ تعاقب

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلی میں مڑا اور عین اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ سے وہ بہ مشکل بچا اور اسی لمحے اس سے ذرا دور خشک مٹی کا ایک مرغولہ سا بن گیا۔

صرف پانچ سیکنڈ ۔۔۔اسے بس اتنی ہی مہلت چاہیے۔۔۔ایک قدم۔۔۔دو۔۔''

اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ گلی ختم ہونے ہی میں نہیں آرہی۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اس بار وہ اپنے تعاقب میں آنے والوں کی زد سے نکل کر سنگتروں کے اس باغ میں پہنچ جائے؟

جب اس نے تیسرا قدم اٹھایا تو اسی وقت، اسے ایک کچی مٹی سے بنی کھڑکی کے فریم سے لگ کر کھڑی، ایک نوجوان لڑکی کے چہرے کی جھلک دکھائی دی' اسے لڑکی کی آنکھوں میں صاف ایسی جھلک نظر آئی جیسے وہ بھی، اسے تعاقب کرنے والوں کی گولیوں سے بچ کر نکل آنے کے لیے اکسا رہی ہو۔ ان کی آواز اب کم سنائی دے رہی تھی اور یہ تالیوں اور واہ واہ کی گونج میں گم ہو رہی تھی۔ زمین کا یہ ٹکڑا بھی اس کی مخالفت میں اتر آیا تھا۔ اسے محفوظ جگہ تک پہنچنے کے لیے صرف چھوٹی سی دو چھلانگوں کی ضرورت تھی۔ اس کے اسکول کے ہم جولیوں کے چہرے قطار بنا کر ایک دیوار کی شکل میں اس کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ ان کی پروا کیے بغیر، اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے بھاگا۔

چوتھے قدم پر اس نے زیاد کا چہرہ دیکھا، جس کے دونوں طرف زخم کا سوراخ تھا۔''انقلابیوں کو کبھی ایک ساتھ یوں اکٹھے نہیں مرنا چاہیے۔'' اس کو ایک دم، دکھ اور شرم کے احساس نے گھیر لیا کہ ابھی تک وہ موت کا یہ دریا پار نہیں کر سکا تھا۔ آخری قدم اٹھانے سے پہلے جو قدم اس نے اٹھایا تو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں نے، اس کو آخر تک پہنچنے میں مدد دی۔ اس کو اپنی ماں کا چہرہ نظر آیا، جو سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اسے صحرا کی جانب بڑھتی ہوئی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ ہر سوئی ہوئی چیز جاگ اٹھی تھی' لیکن کیا وہ موت کو اس بار شکست دے سکے گا؟ جب اس نے آخری قدم اٹھایا (آغاز اور اختتام کے

درمیان) تو وہ اپنے پیاروں کی آنکھوں کے نرغے میں آ گیا ۔ اس نے تیزی سے کیمپوں کا جائزہ لیا۔ پرانی ہدایات کالعدم قرار دی جا چکی تھیں ۔ اسے اپنے تعاقب میں آنے والوں اور اپنے ساتھیوں دونوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ آخری قدم کے درمیان میں (وسط اور اختتام کے درمیان)اس نے تعاقب کرنے والوں کا شور سنا۔ بندوقوں کی گولیاں مٹی کے ذرات کی طرح اس کے اردگرد دھاڑیں ۔ حملے کے شور میں بہت سے رنگوں کا انعکاس ہو رہا تھا جیسے کہ سبز وغیرہ.............زیادکا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا (اس کی آنکھیں ایک بھاری غم سے دھندلا سی گئیں کیوں کہ وہ نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا) بہت سے رنگ اس کے ہمراہ تھے اور زیاد کا خون بہہ رہا تھا.......اور اکیلا سبز رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا رہا۔ زمین کا رنگ ! زمین اس کے سامنے نئے درخت لے آئی تھی ۔ اس نے درختوں کی باہیں اپنی طرف پھیلی ہوئی محسوس کیں وہ اسے چھونا چاہتے تھے، اس لیے اس نے اپنے بازو، جہاں تک وہ انھیں پھیلا سکتا تھا، پھیلا دیے ۔ اس وقت اس کی اڑان ایک پرندے جیسی تھی ۔

۲۔ چوراہا

اس نے درخت کے ساتھ ٹیک لگائی اور کچھ سننے کی کوشش کی ۔ اس نے بہت غور سے سنا اور درختوں کی طرف دیکھا ۔ انھوں نے (درختوں) نے حرکت کی تو اس نے کہا: لو بھئی اب تمھاری باری بھی آ گئی ہے ۔ وہ جانتا تھا کہ درخت انسانوں کی طرح ایسی مخلوق ہیں: جو محسوس کرتے ہیں، سنتے ہیں، روتے ہیں اور بات کا جواب دیتے ہیں لیکن وہ دھوکا نہیں دیتے ۔ درخت درختوں کو دھوکا نہیں دیتے ۔ اس نے گھاس کو روندتے ہوئے، اپنا پیچھا کرنے والوں کے قدموں کی آواز سنی ۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ان کی تعداد کے بارے میں جان گیا ہے ۔ وہ غصے میں تھے اور ان کا ایک ساتھی چھوٹے وائرلیس سیٹ پر چیخ جا رہا تھا ۔ وہ اب خوفزدہ سے تھے ۔ وہ جانتا تھا کہ اب وہ اسے ڈھونڈ نہیں رہے مل کر ایک دوسرے سے اسے ڈھونڈنے کا بہانہ کر رہے تھے ۔ اسے اس بات کا یقین گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ سے ہوا۔ گولیاں وحشیانہ انداز میں چلائی جا رہی تھیں ۔ اس نے ایک لمحے کے لیے انتظار کیا اور پھر بجلی کے کوندے کی طرح لپکا ۔ وہ درخت کے ساتھ بہت شدت سے چمٹ گیا ۔ اس نے اپنے اندر ایک تپاک سا جنم لیتا محسوس کیا اور درخت کو، اس نے گوشت پوست کا ایک وجود سمجھا ۔

یہودیوں کی تیز آوازیں اس کے قریب ہی سے آ رہی تھیں اور اس کے سامنے ہی اپنی دو

آنکھوں سمیت ایک چہرہ موجود تھا۔ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔اگر اس کے سامنے موجود چہرے کے منہ سے ذرا سی بھی آواز نکل پڑتی، جو ایک درخت کی طرح ایستادہ تھا تو اس کا بچ نکلنا محال ہو جاتا۔

وہ اس کے سامنے اپنی گول گول آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی کہ اس کے ذہن سے، اس کا چہرہ محو ہونے لگا۔اسے محسوس ہوا کہ وہ اس آہ کو نہیں روک سکے گا، جو ابھی فضا میں ابھرنے والی تھی۔تاہم ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔وہ حیران ہو رہا تھا کہ ایک کے بعد ایک کیسے واقعات رونما ہو رہے تھے اور اس خوف کی شدت کو یہ تمام مہربانیاں کیسے انوکھے انداز میں کم کر رہی تھیں۔اس سب کچھ، کو جو اس کے ساتھ پیش آ رہا تھا، اتنی تیزی کے ساتھ کیسے سمجھا جا سکتا تھا۔بہر حال ایسے ہی ماحول میں لڑکی نے بے ترتیب سے رازدارنہ لہجے میں، آہستہ سے، اسے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

۳۔ مکالمہ

''میں جانتی ہوں تم ان میں سے ایک ہو۔''

یہ سن کر اس کی آنکھیں بچوں جیسی خوشی سے بھیگ گئیں۔لڑکی کے چہرے پر کئی طرح کے رنگ لہریں لینے لگے تھے۔

''میں تمھارا انتظار کر رہی تھی۔میں ایک مدت سے تمھاری منتظر تھی۔''

یہ سنتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب چلی تھیں۔

''انھوں نے زیادکو مار دیا ہے۔انھوں نے اسے سوتے ہوئے مار دیا۔''

''درخت تمھارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔۔۔۔اس لیے تمھیں آنا ہی تھا۔''

۴۔ سہیلہ خمیس سے محبت کرتی ہے

جیسے سیپی اپنے اندر قطرے کو چھپا لیتی ہے، ایسے ہی سہیلہ نے خمیس کو چھپا لیا۔وہ اسے ایک کیموفلیج خندق میں لے گئی۔وہ یہ خندق دیکھ کر حیران رہ گیا مگر اس نے اسے بتایا کہ اس نے، اسے اس کے آنے سے پہلے تیار کر لیا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اس نے آنا ہے۔وہ خاموش ہو رہی اور اس کی آنکھوں میں در آنے والے آنسوؤں نے، اس کی آنکھوں کے رنگ تبدیل کر دیے۔اس نے سرگوشی کے

انداز میں کہا: ''میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں تمھارے انتظار میں روتی رہتی تھی۔''
وہ دونوں دو مختلف پتھروں پر بیٹھ گئے۔خمیس نے سہیلہ سے پوچھا۔
''اس سنگتروں کے باغ کا مالک کون ہے؟''
اس نے بتایا:
''میرا باپ ایک ماشکی ہے۔'' پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی: ''اور میں اس کی بیٹی ہوں۔''
اس نے انتظار کیا کہ شاید وہ کچھ جواب میں کہے لیکن جب وہ خاموش رہا تو وہ کہنے لگی:
''میں درختوں کو اپنے دل کی گہرائی سے جانتی ہوں۔ میں ان کی عمریں بھی جانتی ہوں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مالک گرمیوں کے موسم میں اپنے خاندان کے ساتھ یہاں تفریح کرنے اور خچروں پر سواری کرنے کے لیے آتا ہے۔ لیکن جب وہ یہاں آتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ وہ میرے اور میرے باپ کے مہمانوں کی طرح ہوتے ہیں۔''
اس نے خمیس کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔
''یقین جانو زمین دار کی بیٹی یہ بھی نہیں جانتی کہ درخت چوتھے سال پھل دینے لگتے ہیں۔''
خمیس مسکرایا اور بولا:
''کیا واقعی؟'' پھر اس نے اسے بتایا کہ وہ اس پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہے، جتنا کہ پتے اپنی جڑوں پر کرتے ہیں۔اس پر سہیلہ نے اس سے کہا: ''تو پھر تم مجھے قبضے کے وقت کے حالات سے آگاہ کرو۔''

اس نے دروازے پر دوبارہ دستک دی اور رک گئی۔اس نے اس عمل کو دہرایا۔دروازہ کھل گیا اور ایک بوڑھے فلسطینی کا چہرہ نمودار ہوا۔اس نے ایک لمحے کے لیے، اس کے چہرے کی جانب دیکھا، پھر آہستہ سے اس کا بازو کھینچتے ہوئے، اس نے دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا:
''وہ کیسا ہے؟''
اس نے اپنے سیاہ لباس میں سے ایک تہ کیا ہوا خط برآمد کر کے اسے دیا۔اس کے واپس جانے سے پہلے، اس کے باپ نے اس کا سفید ماتھا چوما۔
اس نے ایک نئی بندوق وہاں سے لی اور کہا: ''مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح ۔۔۔۔''

وہ چند لمحوں کے لیے ہچکچایا لیکن بالآخر اس نے اسے بندوق کا استعمال سمجھایا۔
بڑی گلی کے بالکل درمیان میں خون کا ایک دھبا موجود تھا اور بارود کی بو رچی ہوئی تھی۔
وہاں جنوبی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ان میں سے ایک خون کا دھبا صاف کر رہا تھا اور دوسرا لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان کر رہا تھا: ''کرفیو''کسی کو معلوم نہ تھا کہ جب بم پھٹا تو سہیلہ وہاں موجود تھی۔
اس نے اپنے ناراض باپ کو بتایا: ''میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنے آپ کو،ان سے کیسے بچانا ہے۔''اور اس نے خمیس کو بتایا: ''میں نے تمھیں اپنا شوہر تسلیم کر لیا ہے۔''

۵۔ عہد و پیان

وطن کے لیے زندگی کے آخری لمحے تک ایک دوسرے سے محبت کرنا۔

۶۔ جنگ

افق مٹیالا ہو رہا تھا۔مغرب میں ختم ہوتی رات کے جلو میں آہستہ آہستہ صبح نمودار ہو رہی تھی۔ خمیس سویا نہیں تھا۔اس کی آنکھیں خندق کے داخلے کے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔
خمیس نے اس کے ہموار سانس کی آواز سنی۔اس نے اس کے بچوں جیسے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''ملک پر قبضے کے وقت بچے اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟''
سہیلہ کی نیند اور محبت میں ڈوبی ہوئی آواز،اس کے کانوں میں پڑی: ''خمیس''
وہ اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا ''سو جاؤ۔۔۔۔۔ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔''
وہ بولی: ''اب نگرانی کرنے کی باری میری ہے۔''
وہ ہنسا اور اس کے گھنے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا: ''کمانڈر تمھیں اس ڈیوٹی سے مستثنٰی قرار دیتا ہے۔''
وہ اٹھی اور اس نے گن اٹھاتے ہوئے کہا: ''کمانڈر کی بیوی کو کوئی رعایت حاصل نہیں ہوتی۔''
کافی دیر تک وہاں خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولی۔

''کیا تمھیں صبح سے پہلے کچھ ہونے کی توقع ہے؟''

خمیس نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے، اپنی آنکھیں بند کیں اور کہا۔

''کیا میں نے تمھیں بتایا تھا کہ میں نے اپنی ماں کو پچھلے تین سال سے نہیں دیکھا حالاں کہ وہ کیمپ ہی میں رہتی ہے۔''

سہیلہ نے خمیس کے ہاتھ کو، اس وقت آہستہ سے چھوڑا، جب وہ مشین گن پکڑ رہا تھا۔ خمیس نے درختوں کی زندگی بخش گرمی کو اپنے اندر محسوس کیا اُس نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے اندھیرے کی دیوار کو عبور کرنا چاہا۔ وہ باہر کی طرف کھلنے والے راستے کی طرف گیا۔ اس کی آواز میں دکھ بھرا ہوا تھا۔

''انھیں ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت نہیں کرنی چاہیے۔۔۔انھوں نے اسلحے کے کئی ڈپو دیکھ لیے ہیں اور ''انھیں'' ماردیا ہے وہ ہر روز معمولی سے شبے پر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔''

پیار کی ٹھنڈک اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی۔ وہ اسے اعتماد کے ساتھ کھڑے ہوئے، پار کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پہلی بار انھوں نے ایک ہی قسم کے خطرے کو اکٹھے محسوس کیا۔ اس نے خواہش کی کہ کاش وہ دونوں اس لمحے ایک وجود میں سما جائیں۔ اس کے اندر خمیس کے لیے بے پناہ محبت کا جذبہ امڈ پڑا۔

خمیس کی آواز میں تلخی تھی، جب اس نے یہ کہا کہ: ''ہم جنگ کرنے جا رہے ہیں۔''

سہیلہ کو محسوس ہوا کہ اگرچہ موت، ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے لیکن اسے اس بات کی کوئی فکر نہ تھی۔ البتہ اس کی خواہش تھی کہ ان دونوں کو اکٹھے موت آئے۔ اس نے بندوق کی نالی ایک دوسرے کھلے مقام پر رکھ دی۔

خمیس کی آواز سینکڑوں بوسوں کے اثر سے لبریز تھی، جب اس نے کہا: ''سہیلہ ہم اکٹھے لڑنے جا رہے ہیں۔۔'' وہ رک گیا اور سہیلہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے والا تھا۔ سہیلہ نے اسے کہتے ہوئے سنا:

''لیکن۔۔۔۔''

سہیلہ کی خواہش تھی کہ وہ آگے کچھ نہ کہے بس یہ کہے کہ: ''ہم اکٹھے لڑنے جا رہے ہیں۔'' بس یہی وہ سننا چاہتی تھی۔ سوائے اس کے کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔

خمیس اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔کیا وہ سہیلہ کے چہرے کو خاک میں لتھڑا ہوا، یا کسی گولی کے سوراخ سے مسخ شدہ حالت میں دیکھنے کی جرأت کر سکے گا؟

خمیس نے اس کی دھیمی آواز سنی: ''میں انھیں دیکھ رہی ہوں۔''

ایک پریشان کن خیال خمیس کے ذہن میں آیا: ''کیا وہ یہاں اس کی موجودگی کے بارے میں جان گئے ہیں یا وہ کچھ اور تلاش کر رہے ہیں؟'' سہیلہ کی فیصلہ کن آواز کانوں میں پڑی: ''وہ جانتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں۔''

اس کی گفتگو میں اس لاؤڈ سپیکر کی آواز سے خلل پڑ گیا، جو خمیس کو ہتھیار پھینکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

خمیس نے سہیلہ کی طرف دیکھا۔سہیلہ نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔اس نے اپنے دل میں جنم لینے والے،اس خیال کو جھٹکنے کے لیے اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹا لیں۔کیا میری موجودگی اس کے ہتھیار نہ پھینکنے کے جذبے کو متاثر کر سکتی ہے؟''

ہر چیز تباہ ہو جائے گی،اگر خمیس نے کہا کہ میں تمھاری ذات کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا۔اس انوکھی صورتِ حال کے ڈر سے آنسو،اس کی آنکھوں سے ابل پڑے۔

خمیس کی محبت بھری آواز اس کو سنائی دی: ''کیا تم رو رہی ہو؟''

اس نے جواب دیا: ''میں تمھارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔تمھاری قربت مجھے بہت عزیز ہے۔''

لاؤڈ سپیکر کی آواز،اس کی آواز پر حاوی ہوتی چلی گئی اور وہ اس کے ادا کیے گئے الفاظ پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بولا: ''تم اگر یہاں سے چلی جاؤ تو تمھاری جان بچ سکتی ہے۔'' خمیس نے مزید کہا۔

''وہ نہیں جانتے کہ تم یہاں ہو۔۔۔۔انھیں صرف میں درکار ہوں۔''

وہ چلائی:

''خمیس ہم اکٹھے ہیں۔۔۔۔ہم اکٹھے ہیں۔''

وہ اسلحے کے صندوق کی طرف بڑھا اور اس نے بندوق کے لیے گولیوں کے دو زائد بکس اٹھا لیے۔اس طرح وہ بھی اسلحے کی طرف بڑھی اور اسی لمحے لاؤڈ سپیکر چنگھاڑا: ''ہم تمھیں صرف دو منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔''

وہ اس سخت وارننگ کو سن کر سخت برہم ہوا۔ وہ فائر کھولنے ہی والا تھا۔ اس نے سہیلہ کو گولیوں کے دو بکس اور ایک بم ہاتھ میں پکڑے ہوئے دیکھا۔

وہ سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔

''کمانڈر۔۔۔۔کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کسی کو کوئی رعایت حاصل نہیں ہوتی ؟''

خمیس نے محسوس کیا کہ ایسا کہتے ہوئے، اس کے لہجے میں بچگانہ پن نمایاں تھا۔ وہ تقریباً سسکیاں لیتی ہوئی کہتی رہی:

''کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم مجھ پر، ایسے اعتماد کرتے ہو، جیسے پتے اپنی جڑوں پر کرتے ہیں؟''

وہ فائر کرنے والی جگہ پر آ گئی۔ اس نے بہت پر جوش انداز میں پوچھا:

''کمانڈر۔۔۔۔پہلی گولی کون چلائے گا؟''

خمیس نے، اس کے وجود کو، دور بہت دور، اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کیا۔ جب سہیلہ نے پہلی گولی چلائی تو وہ یہ سوچ کر دکھی ہو گیا کہ اس سارے وقت میں، وہ اس کے اور اپنے بارے میں سوچنے کے بجائے اپنے سر پر منڈلانے والی موت کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس لمحے وہ سہیلہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت باہر سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔

۷۔ خمیس پہلے مر جاتا ہے

جب خمیس کو پہلی گولی لگی تو سہیلہ کو اس کا علم نہیں ہوا۔ اس لمحے اس نے خمیس کو صرف یہ کہتے ہوئے سنا: ''وہ درختوں کو بھی مار دیتے ہیں۔''

لیکن سہیلہ نے اس کی آواز میں کوئی گڑبڑ ضرور محسوس کر لی تھی۔ (خمیس نے خود اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا) سہیلہ نے خمیس کی طرف دیکھنے سے پہلے بہت ساری گولیاں چلا دیں۔ اس نے خمیس کے کندھے پر خون کا ایک گول دھبا دیکھ کر کچھ کہنے (یا سوچنے) کی جرأت نہ کی مل کہ یہ خواہش کی کہ کاش وہ اس کے جسم میں سما جائے اور خون بہنے کے احساس یا مرنے کی خوشی کو اکٹھے اس کے ساتھ محسوس کرے۔ اس نے اپنے سینے میں کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس کی۔

وہ اس بات پر یقین کرنے پر تیار نہ تھی کہ گولیاں کوئی تکلیف نہیں پہنچاتیں۔

''اس وقت خمیس کیا سوچ رہا تھا؟''اس نے اس کی طرف مڑنے سے پیشتر کئی اور گولیاں چلائیں۔خمیس کا جسم کئی سرخ سوراخوں سے بھر چکا تھا۔بہر حال اس کے مرنے سے پہلے تک،اسے کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔

وہ تو بس اس بات پر ضرور حیران تھی: ''کہ کیا بہادروں کو ہمیشہ ایک سے زیادہ گولیاں لگنے کے بعد مرنا ہوتا ہے؟''

خمیس مر رہا ہے۔۔۔۔خمیس کے ہاتھ نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔اب اس کا ہاتھ اس کا حکم نہیں مان رہا۔اس نے اپنی شہادت کی انگلی ٹرائیگر پر جمانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔اس نے اپنے ہاتھ پر تھوک دیا' گیت گانے والوں کی آوازیں،خمیس کے چاروں طرف پھیل گئیں: ''ہم سچائی پر ہیں۔'' آوازیں اور رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

میگزین کی تمام گولیاں تنے میں دور تک دھنس گئیں۔''درختوں کو اب اس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔''اس وقت جب خمیس نے پہلی بار اسے اپنے سامنے پایا تھا تو اسے ایک درخت ہی سمجھا تھا۔ خمیس نے سہیلہ کی طرف اپنی نگاہیں گھمائیں۔وہ اپنی گن پر جھکی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔اس کے دل میں خواہش جاگی کہ کاش وہ اس کی طرف صرف ایک بار،ایک لمحے کے لیے مڑ سکتا کہ وہ ڈر،غم اور موت سے بے نیاز تاثرات کے حامل،اس کے چہرے کو دیکھ سکے۔

''اپنے وطن پر قبضے کے وقت بچے اتنی تیزی سے کیوں جوان ہو جاتے ہیں؟''

خمیس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر اس نے محسوس کیا کہ کوئی انھیں بند کیے جا رہا ہے۔۔۔۔سہیلہ کے ہاتھ اس کی آنکھوں کو آہستہ سے بند کر رہے تھے۔اب وہ سنتا ہے۔اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر طور پر سن سکتا ہے۔وہ سہیلہ کے لباس کی سرسراہٹ،اس کے دامن کے ہلنے اور ٹرائیگر پر اس کی انگلیوں کے دباؤ کو بھی سن سکتا ہے۔وہ حیران تھا کہ اندر کی یہ چھوٹی چھوٹی آوازیں،باہر کے شور پر کیسے غالب آ رہی تھیں۔زیاد کا چہرہ،ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔وہ اپنی بند آنکھوں سے بھی زیاد کو،اپنے سامنے پا کر حیران ہو رہا تھا۔

اس نے دو ہونٹوں کو اپنے گال پر چپکتے ہوئے محسوس کیا اور یوں وہ سبزے کے ایک بے کنار سمندر میں تیرنے لگا۔

سہیلہ کے سینے میں چھوٹی چھوٹی اور عجیب سی چیزیں سمائی ہوئی تھیں۔وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی

مری نہیں لیکن وہ زندہ بھی تو نہیں ۔اس کی آنکھوں نے بہت سے زخموں کے سوراخ دیکھے تو وہ چلائی:

''دیوار پر بے شمار گولیاں چلاؤ۔۔۔۔جب کل بارش ہوگی تو ہمارا کمرہ پورے کا پورا ڈھ جائے گا۔۔۔۔تم میری بات سن رہے ہونا؟''

اس نے اپنا چہرہ نیچے جھکایا۔اس کا منہ خمیس کے کان کے قریب آیا۔

''کیا تم میری بات سن رہے ہو؟۔۔۔۔ہمیں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔''

سہیلہ نے اس کا ہاتھ دبانے کی کوشش کی:''کیا میں نے تمھیں بتایا تھا کہ میں تمھاری ماں سے ملنے کیمپ گئی تھی؟''

سہیلہ کی انگلی خمیس کے سینے کے ایک گہرے شگاف سے ٹکرائی ۔سہیلہ نے اس زخم کے کنارے پر، محبت سے اپنی انگلیاں پھیریں۔

سہیلہ نے دوسرے شگاف تلاش کرنا شروع کیے۔۔۔۔دو،تین،چار۔۔۔۔''یہ چار ہیں خمیس!'' سہیلہ نے خمیس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر بھی رکھنے کی کوشش کی۔۔۔۔لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔۔۔۔!!

☆☆☆☆

چنگیز آئتماتوف

سپاہی کا بیٹا

وہ یہی کوئی پانچ سال کا ہوگا جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا اور وہ بھی فلم میں ۔ یہ اس بڑے سے سفید بھیڑوں کے باڑے کی بات ہے جہاں بھیڑوں کے گلے سالانہ اون اتروائی کے لیے لائے جاتے ہیں ۔ یہ سلیٹ کی چھت والا بھیڑوں کا باڑہ آج بھی اسی طرح ریاستی فارم کی رہائشی سکیم سے تھوڑا باہر سڑک کے قریب پہاڑی کے دامن میں موجود ہے ۔

وہ اپنی ماں جین گل کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ریاستی فارم پوسٹ آفس میں ٹیلی فون آپریٹر تھی ۔ ہر سال گرمیوں میں جب اون کترنے کا زمانہ ہوتا تو جین گل ایک عارضی ملازمہ کی حیثیت سے اس باڑے میں آجاتی ۔ بوائی اور میمنوں کی پیدائش کے دنوں میں سوئچ بورڈ پر اوور ٹائم لگا کر جو فالتو چھٹیاں اس نے حاصل کی ہوتی تھیں وہ انھیں یہاں استعمال میں لاتی تھی ۔ یہ ایک جز وقتی کام تھا اور اس کا معاوضہ بھی معقول تھا ۔ سپاہی کی بیوہ جین گل کے لیے یہ فاضل آمدنی یقیناً بہت کار آمد تھی ۔ اس کا کنبہ کوئی زیادہ بڑا نہیں تھا ۔ بس وہ تھی اور اس کا بیٹا ۔۔۔ لیکن بہر حال کنبہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوا سے سردیوں میں ایندھن کی قیمتیں چڑھنے سے پہلے آٹے کی ایک معقول مقدار کی ضرورت تو رہتی ہے اور پھر کپڑوں اور جوتوں کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے اور اسی طرح کی دوسری بے شمار ضرورتوں کا سامنا اسے ہوتا ہے ۔

چوں کہ گھر پر اس کے بیٹے کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہیں تھا اس لیے وہ ہر صبح باڑے میں اس کو اپنے ساتھ لے آتی تھی ۔ جہاں وہ سارا دن میلا کچیلا ہوتے ہوئے بھی اون کترنے والوں' گلہ بانوں اور موٹے بھاری بالوں والے رکھوالی کے کتوں کے درمیان ہنستا کھیلتا اور کودتا پھرتا تھا ۔

اس دن یہ وہی تھا جس نے سب سے پہلے فلم کے ٹرک کو باڑے کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور سب سے پہلے اس نے یہ خوشخبری سنائی تھی ۔

''آہا سینما آیا سینما ۔۔۔ سینما آیا سینما!''

اس نے نہایت بے تابی سے شام ہونے کا انتظار کیا اور جب اندھیرا پھیل گیا ۔۔۔ تو فلم

کا آغاز ہوا بہر حال اسے اس کے صبر کا میٹھا پھل مل گیا تھا۔ یہ فلم جنگ کے بارے میں تھی۔ باڑے کے آخر میں دو بلیوں کے سہارے پھیلی ہوئی سفید سکرین جنگ کا میدان بن گئی۔ گولیاں چلنے لگیں۔ توپیں دغنے لگیں اور تاریکی کیا سینہ چیر کر پھٹنے والے ان کے گولے اور راکٹوں کے شعلے سپاہیوں کو زمین سے چپکے رہنے پر مجبور کر رہے تھے جوں ہی یہ شعلے بجھتے سپاہی ایک بار پھر آگے کی طرف بڑھتے گئے۔ اور رات کے اندھیرے میں مشین گنیں یوں تڑ تڑ چل رہی تھیں کہ لڑکے کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ ہاں جنگ ایسی ہی ہوتی ہے۔

وہ اور اس کی ماں اون کی گانٹھوں پر جو باڑے کے پچھلے حصے میں پڑی تھیں چڑھ کر بیٹھے' یہاں سے سکرین بہتر طور پر دکھائی دیتی تھی۔ البتہ لڑکا وہاں فرش پر سکرین کے قریب اپنے ہمجولیوں کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا مگر ماں نے اسے وہاں نہیں بیٹھنے دیا۔

''تم سارا دن کافی اچھل کود کرتے رہتے ہو،'' وہ بولی۔ ''صبح سے لے کر رات تک تمھارا یہی کام ہے۔ بس اب یہیں بیٹھو تم میرے قریب۔'' یہ کہتے ہوئے ماں نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

پروجیکٹر چلتا رہا اور جنگ جاری رہی۔ باڑے میں موجود لوگ بڑی گمبھرتا کے ساتھ بیٹھے فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم دیکھنے کے دوران میں جین گل بعض اوقات گہرے گہرے سانس لینے لگتی اور جب کوئی ٹینک سیدھا اپنی طرف ہی بڑھتا ہوا محسوس کرتی تو گھبراہٹ میں اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ چمٹا لیتی۔ ان کے قریب بیٹھی ایک عورت منہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

''ہائے میرے اللہ۔۔۔۔ یہ سب کتنا خوف ناک ہے۔''

لیکن لڑکا کچھ زیادہ خوف زدہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بل کہ اس کے برعکس جب کوئی نازی سپاہی نیچے گرتا تو وہ ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا۔ جب وہ اپنے سپاہیوں کو گرتا ہوا دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جنگ میں لوگ ایسے مضحکہ خیز انداز میں گر رہے تھے جیسے لڑکے بالے جنگ کا کھیل کھیلتے ہوئے گرتے ہیں۔ دوڑتے ہوئے وہ بھی اسی انداز میں گر سکتا تھا جیسے کسی نے اسے اڑا نگا لگایا ہو۔ یوں تھوڑی سی چوٹ تو لگتی ہے مگر بھلا اتنی چوٹ سے کیا ہوتا ہے۔ ایک لمحے بعد ہی انسان سنبھل کر پھر حملے کی پوزیشن میں آجاتا ہے اور یوں وہ معمولی سی چوٹ بے معنی ہو جاتی ہے۔ لیکن فلم میں لوگ گر کر دوبارہ اٹھ کھڑے نہیں ہوتے تھے بل کہ جہاں گرتے وہیں پڑے رہتے تھے چھوٹے چھوٹے سیاہ ڈھیروں کے

مانند۔ اسے گرنے کا ایک اور انداز بھی معلوم تھا یعنی جس طرح کوئی پیٹ میں گولی لگنے سے گرتا ہے۔ ایسے میں لوگ فوراً ہی نہیں گر پڑتے' پہلے وہ اپنا پیٹ پکڑ کر دہرے ہو جاتے پھر آہستہ سے اپنے اسلحے سمیت زمین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ کھیل کے دوران میں تو گرنے کے بعد فوراً اٹھ کھڑے ہونے کے بعد اعلان کیا جا سکتا ہے کہ میں مرا نہیں ہوں لیکن یہاں فلم میں لوگ دوبارہ اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔

جنگ جاری رہی۔ پروجیکٹر سے گھر رگھر رکی آواز آتی رہی۔ اب تو توپ خانہ میدان میں آ گیا تھا۔ خوف ناک آگ' دھوئیں اور پھٹتے ہوئے گولوں کے درمیان تو پچی ایک ٹینک شکن توپ وہاں لا رہے تھے۔ گھاٹی کی ڈھلان پر وہ اسے دھکیلتے ہوئے پہاڑی کی چڑھائی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ایک لمبی چوڑی ڈھلان جو آسمان کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور اس لمبی چوڑی ڈھلان پر گولوں سے چھلنی زمین کی مٹی کے سیاہ مرغولوں میں گھرے کچھ تو پچی آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی بردباری اور حرکات وسکنات میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی کہ دیکھنے والوں کے دل ان کے سینوں میں کسی متوقع خوف اور عظمت کے حوالے سے غم اور فخر کے ساتھ دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ وہ تعداد میں چھ یا سات تھے ان کے لباس جل رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو پچی تو یقیناً روسی نہیں تھا۔ وہ قازق تھا یا شاید بریات۔ لڑکے کو تو شاید اس بات کا پتہ نہ چلتا لیکن اس کی ماں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''بیٹے دیکھو۔۔۔۔ یہ تمھارا باپ ہے۔''

سکرین پر موجود وہ آدمی ایک دم سے اس لڑکے کا باپ بن گیا۔ ساری فلم اسی آدمی کی کہانی بن گئی۔ لڑکے کے باپ کی کہانی۔ ابھی ابھی دریافت شدہ یہ باپ ریاستی فارم کے لوگوں میں سے سب سے کم عمر نوجوان کی طرح کا ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کا قد زیادہ لمبا نہ تھا وہ گول چہرے اور تیز آنکھوں والا تھا۔ کیچڑ اور دھوئیں میں لت پت چہرے پر موجود اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی وہ ایک بلی کی طرح پھرتیلا اور تند خو لگتا تھا۔ توپ کے پہیے پر اپنے کندھے کا زور لگاتے ہوئے اس نے مڑ کر نیچے ڈھلان میں موجود کسی سے چلا کر کہا: ''جلدی سے گولے لاؤ''

لیکن اس کی آواز نئے پھٹنے والے گولوں کی بوچھاڑ میں دب کر رہ گئی۔

''کیا یہی میرا باپ ہے؟'' آول بیک نے پوچھا۔

''کون''، اس کی ماں نے بے دھیانی سے کہا، ''آرام سے بیٹھو اور دیکھو۔''

''ابھی تمھی نے ہی تو کہا تھا کہ وہ میرا باپ ہے۔''

''ہاں ۔۔۔۔وہی تمھارا باپ ہے ۔لیکن چپکے بیٹھے رہو ورنہ تمھاری وجہ سے دوسرے لوگ پریشان ہوں گے۔''

جین گل نے ایسا کیوں کہا تھا۔۔۔؟ کیا وجہ تھی؟ شاید یوں ہی اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی یا شاید فلم نے اسے اس کا کھویا ہوا خاوند یاد دلا دیا تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہولڑ کے کو اپنی ماں کی بات پر یقین تھا۔اسی لیے وہ بے حد خوش تھا۔اس اچانک اور غیر متوقع طور پر مل جانے والی خوشی سے وہ جھوم رہا تھا اسے اپنے جنگجو باپ پر فخر کر رہا تھا۔یہ شخص اس کا باپ تھا۔حقیقی باپ ۔۔۔۔اس کے ہمجولی اکثر اسے اس بات پر چھیڑتے تھے کہ اس کا باپ نہیں ہے ۔انھیں اور چرواہوں کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ اس کا بھی ایک باپ ہے ۔چرواہے جو سال بھر پہاڑوں میں ادھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں وہ سب بچوں کو پہچانتے تو نہیں ہیں۔۔۔۔وہ جب بھیڑوں کی اون کتروانے کے لیے ہنکا کر انھیں باڑے میں لاتا تھا اور ان کے کتوں کو لڑنے بھڑنے سے روکتا تھا تو وہ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے۔ریاستی فارم کے تمام چرواہوں میں ہر کوئی اس سے یہ ضرور پوچھتا۔

''ہاں تو لڑکے تمھارا نام کیا ہے؟''

''آول بیک۔''

''اور تم کس کے بیٹے ہو؟''

''تو کتوسن کا۔''

چرواہے کو فوری طور پر یاد نہ آتا کہ یہ تو کتوسن کون ہے۔''

''تو کتوسن!'' گھوڑے کی زین سے نیچے جھکتے ہوئے وہ پوچھتا:''کون تو کتوسن؟''

''میں تو کتوسن کا بیٹا ہوں۔''وہ پھر دہراتا۔

اس کی ماں نے اسے ایسا ہی جواب دینے کی ہدایت کر رکھی تھی اس کی نابینا دادی کی ہدایت بھی یہی تھی۔جب وہ اپنے باپ کا نام بھول جاتا تو وہ اس کے کان کھینچا کرتی تھی ۔وہ بہت غصیلی تھی۔

''اوہ اچھا۔''چرواہا کہتا۔''تو یوں کہو نا کہ تم پوسٹ آفس میں کام کرنے والی اس ٹیلی فون آپریٹر کے لڑکے ہو نا؟''

''نہیں میں تو کتوسن کا بیٹا ہوں۔''آول بیک اصرار کرتا۔

بالآخر چرواہا اس کی بات سمجھ ہی جاتا۔

''ہاں بھئی واقعی تم تو کتوسن کے بیٹے ہو۔۔۔۔شاباش ۔۔۔۔میں تو بس یوں ہی تمھارا امتحان لے رہا تھا۔خفا نہ ہونا میرے بچے۔۔۔۔دراصل ہم سارا سال وہاں پہاڑوں پر رہتے ہیں۔اور تم بچے لوگ تو ککڑیوں کی طرح پھلتے پھولتے ہو۔۔۔۔اب ہر بچے کو پہچاننا آسان تو نہیں ہوتا ناں۔''

اور پھر چرواہے آپس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے تو کتوسن کا ذکر کرنے لگتے۔۔۔وہ کہتے:

''وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ جنگ پر چلا گیا اب بہت سے لوگوں کو تو وہ یاد بھی نہیں رہا۔یہ اچھی بات ہے کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔بہت سے نوجوان تو غیر شادی شدہ ہی چلے گئے تھے اور اب یہاں کوئی ان کا نام لیوا نہیں رہ گیا۔''

اور اب جب کہ اس کی ماں نے اس سے کہا تھا:''دیکھو بیٹے۔۔۔۔یہ تمھارا باپ ہے''تو اسکرین پر موجود سپاہی اس کا باپ بن گیا اور لڑکا اسے اپنا باپ ہی سمجھنے لگا اور واقعی وہ جنگ کے زمانے کی تو کتوسن کی جنگی وردی والی اس تصویر سے بالکل مشابہ تھا جس کو اس کی ماں نے بڑا کروا کے شیشے کے فریم میں لگا رکھا تھا۔

اور اب آول بیک اس شخص کو ایک بیٹے جیسے احساسات سے دیکھ رہا تھا۔اس کا سراپا ایک انجانی ہمت کی پھوار میں بھیگ گیا تھا۔اسے ایسا لگا جیسے سکرین پر موجود شخص بھی محسوس کر رہا ہے کہ اس کا بیٹا اسے دیکھ رہا ہے اور اس لیے اب وہ فلم کی اس لمحاتی زندگی میں اپنے آپ کو یوں دکھانا چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اپنے سپاہی باپ کو ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رکھے۔آول بیک کے لیے جنگ اب کوئی تفریح نہیں رہ گئی تھی۔اب وہ کبھی جنگ میں گرنے والے سپاہیوں کو دیکھ کر ہنس نہیں سکتا تھا۔اب وہ جان گیا تھا کہ جنگ ایک سنگین،خطرناک اور خوفناک چیز ہوتی ہے اور زندگی میں پہلی بار اپنے کسی پیارے کے لیے، اپنے باپ کے لیے،جس کی کمی اس نے ہمیشہ ہی محسوس کی تھی دکھ سا محسوس کیا۔پروجیکٹر چلتا رہا۔جنگ جاری رہی۔اب نہایت خوفناکی سے ٹینک زمین کو روندتے ہوئے پیش قدمی کر رہے تھے۔ان کے برج گھوم رہے تھے اور توپیں آگ اگل رہی تھیں اور توپچی اپنی قوت کے ساتھ اپنی توپ کو اوپر کی طرف دھکیل رہے تھے۔

''ابا۔۔۔۔جلدی کرو۔۔۔۔ٹینک۔۔۔ٹینک آرہے ہیں۔''آول بیک نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

آخر کار توپ پہاڑی کے اوپر پہنچ گئی۔اس نے میوے کی جھاڑی کی آڑ میں ٹینکوں پر گولہ

باری شروع کردی۔ٹینکوں نے جوابی حملہ کیا۔ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔حالات اچھے نہیں تھے۔

جنگ کے شور اور شعلوں کے درمیان بیٹے نے اپنے آپ کو باپ کے قریب محسوس کیا۔جب ایک ٹینک کو آگ لگ گئی اور وہ سیاہ دھوئیں میں چھپ گیا اور پھر ایک اور گولے نے ایک دوسرے ٹینک کے زنجیری پہیے کو توڑ دیا اور جب وہ غصے میں اندھوں کی طرح ایک ہی جگہ پر گھومنے لگ گیا تو لڑکا خوشی سے اپنی ماں کی گود میں اچھلنے لگا۔لیکن جب اپنی فوج کے سپاہی توپ کے قریب گرنے لگے تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔۔۔۔اپنے بہت کم سپاہی زندہ رہ گئے تھے ماں رونے لگی۔۔۔۔اس کے گال گرم اور گیلے ہو رہے تھے۔پروجیکٹر چلتا رہا۔جنگ جاری رہی۔لڑائی اب زوروں پر تھی۔ٹینک اب لحہ بہ لحہ قریب آتے جا رہے تھے۔توپ گاڑی کے قریب پہلو میں جھکتے ہوئے آول بیک کے باپ نے فیلڈ فون میں چیخ کر کچھ کہا لیکن لڑائی کی گھن گرج میں اس کے الفاظ سنائی نہ دیے۔توپ کے قریب ایک اور سپاہی گرا۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔وہ زمین پر گر گیا اور زمین اس کے خون سے سیاہ ہوگئی۔اب صرف دو شخص باقی رہ گئے تھے۔۔۔۔آول بیک کا باپ اور ایک دوسرا۔انھوں نے ایک گولہ چلایا پھر یکے بعد دیگرے انھوں نے دو گولے اور داغے۔لیکن ٹینکوں کی پیش قدمی جاری رہی۔توپ کے قریب ایک بار پھر گولا پھٹا دھوئیں اور شعلے نے اس جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جب دھوئیں کا بادل چھٹا تو اس وقت ایک ہی آدمی اوپر اٹھ سکا اور وہ وہی تھا آول بیک کا باپ۔۔۔۔وہ توپ کی طرف جھپٹا۔۔۔۔اس میں گولا بھرا۔۔۔نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔یہ اس کا آخری گولہ تھا۔دشمن کا ایک اور گولہ پھٹا جس نے ہر چیز کو دھوئیں کی نذر کر دیا۔اس نے توپ کو نقصان پہنچایا اور اسے الٹ دیا۔لیکن توپچی ابھی زندہ تھا۔وہ آہستہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔اس کا چہرہ لہولہان تھا۔اس کے کپڑے پھٹ گئے اور جل رہے تھے اس کے ہاتھ میں گرنیڈ تھا اور وہ سیدھا اپنی طرف آتے ٹینکوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔یہ اس کی آخری کوشش تھی۔

''رکو۔۔۔۔تم یہاں سے آگے نہیں جا سکتے۔'' وہ چلایا اور اس نے گرنیڈ پھینکنے کے لیے اپنا ہاتھ لہرایا۔

وہ ایک لمحے کے لیے اسی طرح کھڑا رہا۔درد اور نفرت سے اس کے چہرے کے خدوخال بگڑ گئے تھے۔

جیبن گل نے اپنے بیٹے کا ہاتھ زور سے بھینچ لیا۔لڑکے نے اپنا ہاتھ چھڑا کر اپنے باپ کی مدد کو

اٹھنا چاہا۔لیکن ٹینک کی مشین گن سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ برآمد ہوئی اور تو پچی نیچے گر گیا۔وہ ایک طرف لڑھک گیا۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ دوبارہ پیٹھ کے بل زمین پر گر گیا اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے۔پروجیکٹر کی گھر رگھر ربند ہوگئی۔لڑائی اچانک رک گئی تھی۔ایک ریل ختم ہوگئی تھی اور آپریٹر نے دوسری ریل لگانے کے لیے روشنی کر دی تھی۔

جب باڑے میں روشنی پھیل گئی تو وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔وہ فلم میں پیش کی جانے والی جنگ کی فضا سے ایک بار پھر حقیقی دنیا میں لوٹ آئے تھے اور وہ لڑکا آول بیک اون کی گانٹھوں سے نیچے لڑھک آیا اور نہایت پُر جوش انداز میں چلانے لگا۔

''یہ میرا باپ تھا۔۔۔۔کیا تم نے اسے دیکھا۔۔۔۔ہاں وہ میرا باپ تھا جو جنگ میں مارا گیا۔''

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ پہلے پہل تو کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ بات کیا ہے۔بدستور جوشیلے انداز میں چلاتے ہوئے وہ اپنے ہمجولیوں کی طرف دوڑ پڑا،جن کی رائے کی اس کے نزدیک بہت وقعت تھی۔سارے میں عجیب قسم کی خاموشی چھا گئی۔وہ لوگ ابھی تک اس چھوٹے سے بچے کے اس طرح بے حواس ہونے کو محسوس نہیں کر سکے تھے جس نے اس سے پہلے اپنے باپ کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اظہار کے لیے مناسب الفاظ نہ ملنے پر سب لوگ حیرانی اور پریشانی سے اپنے کندھے اچکا رہے تھے۔ آپریٹر نے ریل کا خالی ڈبہ نیچے پھینکا۔ڈبہ کھل گیا اور دو الگ الگ حصوں میں فرش پر لڑھک گیا۔کسی نے اس بات کو محسوس نہ کیا۔حتیٰ کہ آپریٹر بھی اسے اٹھانے کے لیے نہ جھکا اور وہ بچہ ابھی تک اپنے سپاہی باپ کے کارنامے کو فخریہ انداز میں پیش کیے جا رہا تھا۔

''کیا تم نے اسے نہیں دیکھا۔۔۔۔وہ میرا باپ تھا۔۔۔میرا باپ جسے انھوں نے مار دیا۔''
وہ بار بار یہی کہتا رہا اپنے چاروں اور چھائی خاموشی کو محسوس کر کے وہ اور زیادہ جوش میں آتا جا رہا تھا۔وہ حیران ہو رہا تھا کہ سارے لوگ اس کے باپ کی بہادری پر اس کی خوشی میں شریک کیوں نہیں ہو رہے تھے؟

''خاموش''بالآخر ان میں سے ایک نے کہہ ہی دیا،''تمھیں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالنی چاہئیں۔''

لیکن ایک دوسری آواز اسی لمحے ابھری۔

''وہ ایسا کیوں نہ کہے۔۔۔۔جب کہ حقیقتاً اس کا باپ جنگ میں مارا گیا تھا۔
تب ایک بڑی عمر کے لڑکے نے آول بیک سے حقیقت بیان کرنے کی ٹھان ہی لی۔
''یہ اصل میں تمھارا باپ نہیں تھا۔'' اس نے کہا، ''اور اسی لیے تمھیں اتنے جوش میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔یہ تمھارا باپ تھا ہی نہیں۔یہ تو بس ایک اداکار تھا۔اگر تمھیں میری بات پر یقین نہیں آتا تو بے شک آپریٹر سے پوچھ لو۔''

دوسرے لوگوں میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ بچے کو سچ بات بتا کر اسے اس لحاتی خوشی سے محروم کر دیتے۔آپریٹر چوں کہ یہاں کا آدمی نہیں تھا اس لیے ان کے خیال میں اسے اظہار کا موقع دینا بہتر تھا۔لوگوں نے امید بھری نظروں سے آپریٹر کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی پروجیکٹر ہی پر جھکا رہا جیسے کہ وہ بہت مصروف ہو۔

''وہ میرا باپ تھا۔'' آول بیک بولا: ''وہ وہی تھا۔''
''بھلا وہ ان میں سے کون تھا؟'' بڑی عمر کے لڑکے نے استفسار کیا۔
''کیا تم دیکھ نہیں رہے تھے؟'' وہی جو گرنیڈ ہاتھ میں لے ٹینک کے قریب کھڑا تھا اور پھر گر پڑا تھا۔۔۔۔بالکل ایسے۔''

آول بیک نے زمین پر گر کر اسی طرح لڑھک کر دکھایا جیسے کہ اس کا باپ گرا تھا۔اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی اور پھر گر پڑا اور پھر اپنے بازو پھیلائے ہوئے وہ پیٹھ کے بل سکرین کے سامنے چت لیٹ گیا۔

لوگ اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے لیکن لڑکا اسی طرح بے حس و حرکت وہاں پڑا رہا جیسے کہ وہ مر چکا ہو۔۔۔وہ لوگوں کی ہنسی میں شریک نہ ہوا۔

ایک بار پھر ایک تکلیف دہ خاموشی نے لوگوں کو گھیر لیا۔

''جینن گل یہ کیا قصہ ہے؟'' ایک بوڑھی عورت نے جھنجھلا کر پوچھا۔تم نے اس بچے کے ذہن میں یہ کیسے خیالات سمو دیے ہیں۔'' غم زدہ جینن گل اپنی آنکھوں میں آنسو لائے ہوئے اٹھی' وہ اپنے بیٹے کی طرف بڑھ گئی اور پھر اس نے اسے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔'' آؤ بیٹا گھر چلیں۔'' اس نے کہا: ''وہی تیرا باپ تھا۔''

اس نے لڑکے کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر وہاں سے چلی گئی۔

چاند طلوع ہو چکا تھا۔ رات کے گہرے نیلے آسمان کے پس منظر میں پہاڑی کی سفید چوٹیاں چمک رہی تھیں اور نیچے اٹیمپنی کا بے انت اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

اب اس وقت زندگی میں پہلی بار لڑکے کو اپنے شدید نقصان کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جنگ میں اس طرح اپنے باپ کے گر جانے اور پھر مر جانے پر بہت زیادہ دکھی ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بات نا قابلِ برداشت تھی وہ اپنی ماں سے لپٹ کر خود رونا اور اسے رلانا چاہتا تھا لیکن اس کی ماں رو نہیں پا رہی تھی۔ پس اس نے بھی زور سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور خاموشی سے اپنے آنسوؤں کو پی لیا۔

حالاں کہ اس کا باپ بہت عرصہ پہلے جنگ میں مارا جا چکا تھا مگر اس لمحے وہ پھر سے اس کے اندر آ موجود ہوا تھا۔۔۔۔زندہ!

☆☆☆☆

گیبریل گارشیامارکیز

پنجرہ اور آدمی

پنجرہ مکمل ہوگیا تھا۔بالتھازار نے اسے اپنی عادت کے جبر کے تحت چھت کے اگلے چھجے کے نیچے رکھ دیا اور جب اس نے اپنا لنچ ختم کیا تو اس سے پہلے ہی ہر کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ خوب صورت پنجرہ ہے۔اتنے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آئے کہ ان کا ایک ہجوم گھر کے سامنے جمع ہوگیا اور بالتھازار کو، اسے نیچا اتار کر دکان بند کرنی پڑی۔

اس کی بیوی ارسلا نے کہا: ''تمھیں شیو کرنی ہے۔کیا تمھیں پتہ ہے کہ تم اس وقت ایک خاص مسلک کے پادری کی طرح لگ رہے ہو۔''

''لنچ کے بعد شیو کرنا اچھی بات نہیں۔'' بالتھازار نے کہا۔

اس کے دو ہفتوں سے بڑھے ہوئے کھڑے کھڑے سخت اور چھوٹے بال، کسی خچر کی ایال کی طرح لگتے تھے اور اس کا سراپا، ایک ڈرے ہوئے لڑکے کا عمومی تاثر پیش کرتا تھا۔لیکن یہ ایک غلط تاثر تھا۔اس فروری میں وہ تیس سال کا ہو چکا تھا اور وہ پچھلے چار سال سے ارسلا سے شادی کیے بغیر، اس کے ساتھ رہ رہا تھا اور اس کے ہاں کوئی بچہ بھی نہیں ہوا تھا اور ایسی کئی وجوہات تھیں کہ زندگی نے اسے محتاط ضرور بنا دیا تھا لیکن اس میں ڈرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ جو پنجرہ اس نے ابھی بنایا تھا وہ کچھ لوگوں کے نزدیک دنیا کا خوب صورت ترین پنجرہ ہے۔چوں کہ وہ بچپن ہی سے ایسے پنجرے بناتا چلا آرہا تھا، اس لیے، اس کو بنانے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

عورت بولی: ''تو پھر بہتر ہے کہ تم تھوڑا سا ستا لو، کیوں کہ اس بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ تم کہیں باہر تو نہیں جا سکتے۔''

آرام کرنے کے دوران میں بھی اسے، اس پنجرے کو اپنے پڑوسیوں کو دکھانے کے لیے کئی بار اپنے جھولن کھٹولے سے باہر آنا پڑا تھا۔اس وقت تک ارسلا نے، اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔وہ اپنے خاوند سے، اس بات پر ناراض تھی کہ وہ اپنی دکان کے ترکھانے کام کو نظر انداز کر کے صرف

اس پنجرے کو بنانے میں لگا رہا تھا۔اس دوران میں اس نے پوری نیند بھی نہیں لی تھی اور کام کرتے ہوئے، وہ بکھرے بکھرے انداز میں بڑبڑاتا بھی رہا تھا، لیکن اس کا غصہ تکمیل شدہ پنجرے کے سامنے ہوا ہوگیا۔ جب بالتھازار اپنی دوپہری نیند سے بیدار ہوا، اس وقت تک ارسلا نے اس کی پتلون اور قمیص استری کر کے جھولن کھٹولے کے قریب پڑی کرسی پر رکھ دی تھی اور پنجرہ اٹھا کر وہ کھانے کی میز پر لے آئی تھی۔

''تم اس کے کتنے دام لو گے۔۔۔۔؟ اس نے پوچھا۔

بالتھازار نے جواب دیا: ''مجھے کچھ پتا نہیں۔میرا خیال ہے کہ میں ان سے تیس پیسوز مانگوں گا شاید اس طرح وہ مجھے بیس دے دیں۔''

ارسلا نے کہا: ''تم ان سے پچاس کا مطالبہ کرو۔تم نے ان پچھلے دو ہفتوں میں اپنی خاصی نیند قربان کی ہے اور ویسے بھی یہ کچھ بڑا ہے۔میرا خیال ہے، میں نے اپنی زندگی میں جتنے بھی پنجرے دیکھے ہیں، یہ ان سب سے بڑا ہے۔''

''کیا تمھارے خیال میں، وہ مجھے پچاس پیسوز دے دیں گے؟''

''یہ جناب مونٹیل کے لیے کچھ بھی نہیں، اور پنجرہ اتنی قدر تو رکھتا ہے۔تمھیں ساٹھ مانگنے چاہییں۔'' ارسلا نے کہا۔

گھر دم گھوٹ دینے والے سائے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ اپریل کا پہلا ہفتہ تھا اور جھینگروں کے بول بلا رے کے بیچ میں، گرمی نا قابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ جب بالتھازار نے کپڑے پہن لیے تو گھر میں ٹھنڈک کے داخلے کے لیے اس نے آنگن کی طرف کھلنے والے دروازے کو کھول دیا اور تبھی بچوں کا ایک جھنڈ کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔

خبر پھیل چکی تھی۔بوڑھا ڈاکٹر اکتاویو جیرالڈو جو اپنے پیشے سے ناخوش اور اپنی زندگی سے خوش تھا، اس نے اپنی معذور بیوی کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے بالتھازار کے پنجرے کے بارے میں سوچا تھا۔گرم دنوں میں اندر کے ٹیرس پر، جہاں انھوں نے ایک میز ڈال رکھی تھی، وہاں بہت سے پھولوں کے گملے رکھے تھے اور ساتھ ہی وہاں زرد بلبلوں کے دو پنجرے بھی پڑے تھے۔اس کی بیوی کو پرندے اتنے زیادہ پسند تھے کہ وہ بلیوں سے صرف اس لیے نفرت کرتی تھی کہ وہ ان پرندوں کو کھا جاتی تھی۔اس کے متعلق سوچتے ہوئے، ڈاکٹر جیرالڈو، اس سہ پہر کو ایک مریض دیکھنے گیا تو واپسی پر، وہ پنجرہ دیکھنے کے

لیے بالتھازار کے گھر آ گیا۔

کھانے والے کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے ۔تاروں سے بنی ،خاصی بڑی گنبد نما گولائی کے ساتھ پنجرہ نمائش کے لیے میز پر رکھ دیا گیا تھا۔اس کی تین منزلیں تھیں ۔اس میں آنے جانے کے راستے بھی بنے ہوئے تھے اور خاص طور پر سونے اور کھانے کے لیے کمرے بھی بنائے گئے تھے ۔پرندوں کی تفریح کے لیے اس میں چھوٹے چھوٹے جھولے بھی بنے ہوئے تھے ۔یہ ایک بہت بڑے برف کے کارخانے کا چھوٹے پیمانے پر بنا ہوا ماڈل لگتا تھا۔ڈاکٹر نے اسے چھوئے بغیر اس کا بغور جائزہ لیا۔اس نے سوچا کہ اصل میں یہ تو اپنی شہرت سے بھی اتنا زیادہ خوب صورت ہے کہ اس نے تو کبھی اپنی بیوی کے لیے،ایسی کسی چیز کے متعلق خواب بھی نہیں سوچا تھا۔

اس نے کہا:''یہ تصور کی پرواز ہے۔''

وہ لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا،بالتھازار تک پہنچا اور اس نے اپنی شفیق نظریں، اس پر ڈالتے ہوئے مزید کہا:''تم تو ایک غیر معمولی ہنر مند ہو۔''

بالتھازار شرما گیا:''آپ کا شکریہ۔''اس نے کہا۔

ڈاکٹر نے خیال کیا:''یہ سچ ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کی طرح ،جو اپنی جوانی میں خوب صورت رہی ہو ایک شائستہ انداز والے معمولی سے موٹاپے کا شکار ہے اور اس کے ہاتھ بہت نرم ہیں۔ اس کی آواز لاطینی بولنے والے،ایک پادری جیسی لگتی ہے۔''اس نے کہا:''حتیٰ کہ اس میں پرندے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''اس نے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے پنجرے کو یوں گھمایا جیسے کہ وہ خود اس پنجرے کو نیلام کر رہا ہو:''اسے تو درختوں کے درمیان یوں لٹکا ہونا چاہیے کہ یہ خود بخود چہکنا شروع کر دے۔''اس نے پنجرے کو میز پر رکھا،ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پنجرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:''تو ٹھیک ہے، میں اسے لے جاؤں گا۔''

ارسلا نے کہا:''یہ بک چکا ہے۔''

بالتھازار نے کہا:''یہ جناب مونٹیل کے صاحب زادے کی ملکیت ہے۔اس نے اسے خاص اپنے لیے بنوایا ہے۔''

ڈاکٹر نے احتراماً کہا:''کیا اس نے تمھیں اس کا ڈیزائن بھی مہیا کیا تھا۔''

''نہیں ۔لیکن وہ جانتا تھا کہ اسی طرح کا ایک بڑا سا پنجرہ ہو،جس میں کہ وہ ٹروپیئل کا ایک

جوڑا رکھ سکے۔''

ڈاکٹر نے پنجرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''لیکن یہ ٹروپئیل کے لیے موزوں نہیں ہے۔''

بالتھازار نے میز کے قریب نیچے ہوتے ہوئے کہا: ''یقیناً یہ ٹروپئیل کے لیے مناسب ہے۔''

بچوں نے اسے گھیر لیا۔اس نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے مختلف حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''بہت احتیاط سے پیائش کی جانچ کی گئی ہے۔'' پھر اس نے انگلیوں کے جوڑ سے پنجرے کو ٹہوکا دیا۔پنجرہ ایک سریلی گمک سے بھر گیا: ''یہ ایک مضبوط ترین تار ہے۔ایسی تار آپ کو بہ مشکل ہی ملے گی اور اسے اندر اور باہر سے مضبوطی سے ٹانکے لگائے گئے ہیں۔''

''یہ تو ایک طوطے کے لیے بھی خاصا بڑا ہے۔'' ایک شخص نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔'' بالتھازار نے کہا۔

ڈاکٹر نے اپنا سر گھمایا: ''یہ سب ٹھیک ہے لیکن اس نے اس کا خاکہ تو تمھیں نہیں دیا تھا۔'' ٹروپئیل کے لیے ایک مناسب طور پر بڑا پنجرہ بنانے کے علاوہ، اس نے تمھیں بالکل صحیح پیائش نہیں دی۔کیا یہی بات نہیں ہے؟''

''یہ بالکل صحیح ہے۔'' بالتھازار نے کہا۔

''تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ایک ایسا پنجرہ ہونا چاہیے جو کہ ٹروپئیل کے لیے کافی بڑا ہو جب کہ یہ ایک اور ہی طرح کا پنجرہ ہے۔اور اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ جو پنجرہ تمھیں بنانے کے لیے کہا گیا تھا، وہ پنجرہ یہی ہے۔''

ذہنی طور پر الجھے ہوئے، بالتھازار نے کہا: ''یہ بالکل وہی ہے، اسی لیے میں نے اسے بنایا ہے۔''

ڈاکٹر نے بے صبری کا مظاہرہ کیا تو ارسلا نے کہا: ''تم ایک دوسرا بھی تو بنا سکتے ہو۔'' پھر اپنے شوہر کی جانب سے، ڈاکٹر کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے کہا: ''آپ کو جلدی تو نہیں۔''

''میں نے آج سہ پہر کو، اسے اپنی بیوی کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے ڈاکٹر۔میں آپ کو وہ چیز نہیں بیچ سکتا جو کہ پہلے سے ہی بکی ہوئی ہے۔'' بالتھازار بولا۔

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔ اپنی گردن پر آئے پسینے کو رومال کے ساتھ خشک کرتے ہوئے، اس نے متفکرانہ انداز میں خاموش رہتے ہوئے، بظاہر لاپروائی سے پنجرے کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اس جہاز کی طرف دیکھے جاتا ہے جو کہ بس روانہ ہونے ہی والا ہو۔''انھوں نے تمھیں اس کے لیے کیا ادائی کی ہے۔''

بالتھازار نے بغیر کوئی جواب دیے ارسلا کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ساٹھ پیسوز۔''وہ بولی۔

ڈاکٹر نے پنجرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:''یہ بہت خوب صورت ہے۔''اس نے آہ بھری:''بہت زیادہ خوب صورت''دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ مسکرایا اور اس نے تیزی سے خود کو پنکھا کیا اور تب اس واقعے کا نشان تک ہمیشہ کے لیے اس کی یادداشت سے محو ہو گیا۔

اس نے کہا:''مونٹیل بہت امیر ہے۔''

سچ یہ تھا کہ مونٹیل حقیقت میں اتنا امیر نہیں تھا لیکن وہ اس کا اہل تھا کہ امیر بننے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہاں سے کچھ ہی بلاک دور، ساز و سامان سے اٹے ایک ایسے گھر میں، جہاں کسی نے ایسی کسی بھی چیز کے بارے میں نہیں سوچا تھا، جسے کہ بیچا جا سکتا ہو۔ وہ پنجرے کے بارے میں پھیلنے والی خبروں سے لاتعلق تھا۔ موت کے خوف میں مبتلا، اس کی بیوی نے لنچ کے بعد دروازے کھڑکیاں بند کیں اور کمرے کے سائے کو، کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی، دو گھنٹے تک لیٹی رہی جب کہ مونٹیل نے قیلولہ کیا۔ تبھی بہت سی آوازوں کے شور نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے بیٹھک کا دروازہ کھولا تو لوگوں کے ایک ہجوم کو، اپنے گھر کے سامنے پایا اور ہجوم کے درمیان، اس نے بالتھازار کو پنجرے کے ساتھ موجود پایا۔ اس نے تازہ شیو کی ہوئی تھی اور ایک ایسا صاف ستھرا اور مہذب قسم کا سفید لباس پہن رکھا تھا، جیسا کہ غریب لوگ امرا کے گھر آتے وقت پہنتے ہیں۔

''کیا شان دار چیز ہے۔''مونٹیل کی بیوی نے پر جوش انداز میں بالتھازار کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

دروازے پر جمع ہونے والے لوگوں کے لیے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے، اس نے مزید کہا:''میں نے اپنی زندگی میں ایسی چیز نہیں دیکھی لیکن اس سے پہلے کہ لوگ نشست گاہ کو ریس کورس میں بدل دیں تم اسے اندر لے آؤ۔''

بالتھازار،مونٹیل گھرانے کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں تھا۔وہ بہت موقعوں پر اپنی مہارت اور صحیح لین دین کی بدولت چھوٹے موٹے ترکھانے کے لیے یہاں بلایا جا چکا تھا۔لیکن اس نے امیروں کے درمیان خود کو کبھی آسودہ نہیں پایا۔عموماً وہ ان کی بیویوں کے برے، کج بحثی پر مبنی زخمی کر دینے والے رویوں کا شاکی تھا اور اسے ایسے لوگوں کے بارے میں سوچ کر افسوس ہی ہوتا تھا۔وہ جب ان لوگوں کے گھروں میں داخل ہوتا تھا تو اسے اپنے پاؤں گھسیٹنے پڑتے تھے۔

''کیا پیپ گھر پر ہے۔''اس نے پوچھا۔

اس نے پنجرہ کھانے کی میز پر رکھ دیا۔''وہ سکول گیا ہوا ہے لیکن وہ آتا ہی ہوگا۔''اس نے کہا:''مونٹیل نہارہا ہے۔''اس نے مزید کہا۔

''حقیقت میں مونٹیل کے پاس نہانے کا وقت ہی نہیں تھا۔باہر آ کر یہ دیکھنے کے لیے کہ وہاں کیا ہورہا تھا۔مونٹیل بڑی شتابی والے شراب کے شغل میں مصروف تھا۔وہ ایسا چوکنا شخص تھا کہ سوتے ہوئے پنکھا بھی نہیں چلاتا تھا کہ سوتے ہوئے بھی،اسے گھر میں پیدا ہونے والا شور سنائی دے سکے۔

''اڈیلیڈ۔''وہ چلایا:''کیا ہورہا ہے؟''

''یہاں آؤ اور دیکھو یہ کیسی شان دار چیز ہے۔''اس کی بیوی نے اونچی آواز میں کہا۔

بالوں بھرے جسم والا تو ندیل مونٹیل،جس کی گردن کے گرد تولیہ لپٹا ہوا تھا،بیڈروم کی کھڑکی پر آیا:''کیا ہے یہ؟''

بالتھازار نے کہا''یہ پیپ کا پنجرہ ہے۔''

اس کی بیوی نے متغیر ہو کر پوچھا:''کس کا۔''

بالتھازار نے جواب دیا:''پیپ کا۔''پھر اس نے مونٹیل کی طرف مڑ کر کہا:''پیپ نے اس کا آرڈر دیا تھا۔''

ایک لمحے کے لیے تو کچھ نہ ہوا لیکن بالتھازار نے محسوس کیا،جیسے اس کے سامنے کسی نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا ہو۔مونٹیل انڈرویئر پہنے ہوئے بیڈروم سے برآمد ہوا:''کیا کہا پیپ نے۔''وہ چیخا۔

اس کی بیوی نے بے حرکت رہتے ہوئے سرگوشی کی:''وہ ابھی واپس نہیں آیا ہے۔''

پیپ دروازے کے پاس نظر آیا۔ پیپ کی عمر بارہ سال تھی اور اس کی آنکھوں کی پلکیں مڑی ہوئی تھیں اور وہ اپنی ماں کی طرح رنجیدہ خاطر نظر آتا تھا۔

مونٹیل نے اس سے کہا: ''یہاں آؤ۔ کیا تم نے اس کا آرڈر دیا تھا؟''

بچے نے اپنا سر جھکا لیا۔

مونٹیل نے اسے بالوں سے پکڑ کر اپنی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور کیا: ''مجھے جواب دو۔'' بچے نے جواب دیے بغیر، اپنے ہونٹوں کو کاٹا۔ اس کی بیوی نے آہستہ سے کہا: ''مونٹیل''

مونٹیل نے بچے کو چھوڑ دیا اور غصے میں بالتھازار کی طرف گھوما۔ اس نے کہا: ''بالتھازار مجھے افسوس ہے لیکن تمھیں ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔ اگر تم کسی نابالغ سے کوئی معاہدہ کرتے ہو تو اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔'' جب اس نے یہ کہا تو اس کے چہرے کی طمانیت واپس آ چکی تھی۔ اس نے پنجرے کی طرف دیکھے بغیر، اسے اٹھایا اور بالتھازار کو پکڑا دیا: ''اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ اور جس کسی کو بھی بیچ سکتے ہو، اسے بیچ دو۔ اور سب سے مقدم بات یہ ہے کہ تم مجھ سے کسی قسم کی کوئی بحث نہ کرنا، یہ میری تم سے درخواست ہے۔ اس نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے وضاحت کی۔ ڈاکٹر نے مجھے غصے میں آنے سے منع کیا ہے۔''

جب تک بالتھازار بے یقینی سے پنجرہ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا، بچہ اپنی آنکھیں جھپکائے بغیر ساکت رہا تھا۔ تب اس نے کتے کی غراہٹ جیسی آواز اپنے حلق سے نکالی اور چیختے ہوئے اس نے اپنے آپ کو فرش پر گرا دیا۔ مونٹیل کوئی حرکت کیے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا جب کہ اس کی ماں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''اسے اوپر بھی مت اٹھانا'' مونٹیل بولا: ''اسے اپنا سر فرش پر ٹکرا کر توڑنے دو۔'' اور پھر اس پر لیموں اور نمک بھی چھڑک دو تا کہ یہ اپنے دل کی گہرائی تک غصہ محسوس کر سکے۔'' بچہ اپنی خشک آنکھوں کے ساتھ چلائے جا رہا تھا اور اس کی ماں نے اسے کلائیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ ''اسے تنہا چھوڑ دو۔'' مونٹیل نے اصرار کیا۔

بالتھازار نے بچے کا یوں جائزہ لیا، جیسے وہ کسی جاں کنی میں مبتلا کسی جانور کو دیکھ رہا ہو۔ یہ تقریباً سہ پہر چار بجے کا وقت تھا۔ عین اسی لمحے گھر پر اس کی بیوی ارسلا، پیاز کے باریک ٹکڑے کرتے ہوئے ایک بہت پرانا گیت گا رہی تھی۔

''پیپ'' بالتھازار نے کہا۔

وہ بچے کی طرف بڑھا اور اس نے مسکراتے ہوئے بچے کو وہ پنجرہ پکڑا دیا۔ بچہ اچھل پڑا۔ اس نے اپنے جتنے بڑے سائز کے پنجرے کو سینے سے لگا لیا۔ اس نے تاروں کی اس کاری گری کے اندر بالتھازار کو جھانکا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سے کیا کہے۔ اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا۔

مونٹیل نے نرمی سے کہا: "بالتھازار میں نے تمھیں پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اسے لے جاؤ۔"

"اسے واپس کرو۔" عورت نے بچے کو حکم دیا۔

بالتھازار نے کہا: "تم اسے رکھو۔" اور تب اس نے مونٹیل سے کہا: "بہر حال یہ وہ چیز ہے جو میں نے اسی کے لیے بنائی ہے۔"

مونٹیل اس کے پیچھے نشست گاہ تک آیا: "احمق مت بنو۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کا راستہ روک رہا تھا: "بے وقوفی نہ کرو اور اپنی یہ بنائی ہوئی چیز گھر لے جاؤ۔ میں تمھیں ایک سینٹ کی ادائی کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں"، بالتھازار نے کہا: "میں نے اسے ایک تحفے کے طور پر پیپ کے لیے بنایا ہے۔ میں اس کے عوض کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔"

جب بالتھازار تماشائیوں کے درمیان میں سے، جنھوں نے اپنے وجود سے دروازے پر رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی گزرا تو مونٹیل لونگ روم کے درمیان کھڑا چیخ رہا تھا۔ وہ زرد ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہونا شروع ہو گئی تھیں: "احمق" وہ چلا رہا تھا، "اپنی فضولیات کو اٹھاؤ یہاں سے۔ آخری اور حتمی بات یہ ہے کہ اس گھر سے کسی کو بھی، کسی چیز کا آرڈر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتیا کا بچہ۔"

پول ہال میں بالتھازار کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اس لمحے تک وہ سوچ چکا تھا کہ اس نے جو پنجرہ مونٹیل کے بیٹے کو بنا کر دیا تھا، وہ اس کے اب تک بنائے گئے، تمام پنجروں سے بہتر پنجرہ تھا۔ وہ رو دھو نہیں رہا تھا کہ کوئی بھی چیز خصوصی طور پر اہم نہیں تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ زیادہ لوگوں کے نزدیک ایسی چیزوں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ وہ تھوڑا سا جوش میں آ گیا۔

"انھوں نے تمھیں پنجرے کے عوض پچاس پیسوز دیے۔"

"ساٹھ۔" بالتھازار نے کہا۔

"تمھارے لیے ایک نغمہ" کسی نے کہا: "تم وہ واحد شخص ہو جو مسٹر مونٹیل سے اتنی خطیر رقم حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔"

انھوں نے اس کے لیے ایک بیئر خریدی اور بالتھازار نے جواباً ہر ایک کے ساتھ راؤنڈ لیا چوں کہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ شراب نوشی کر رہا تھا، اس لیے وہ شام تک مکمل طور پر ٹُن ہو گیا۔ وہ ساٹھ پیسوز قیمت والے ایک ہزار پنجروں کے شان دار پراجیکٹ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ پھر ان کی تعداد ایک ملین ہو گئی اور پھر یہ بڑھ کر ساٹھ ملین تک جا پہنچی۔ نشے میں وحشت وہ کہہ رہا تھا: ''ہمیں امیروں کے مرنے سے پہلے ان کو بیچنے کے لیے ہزاروں چیزیں تیار کرنا ہوں گی۔ یہ سارے کے سارے بیمار ہیں اور یہ سارے مرنے والے ہیں۔ یہ اتنا ہیر پھیر کر چکے ہیں کہ وہ اب کسی بات پر غصہ نہیں کرتے۔''

دو گھنٹوں سے وہ جیوک باکس کے لیے ادائی کر رہا تھا جو کہ بغیر رکے چلے کیے جا رہا تھا۔ ہر ایک نے بالتھازار کے لیے اچھی قسمت، اچھی صحت اور امیروں کے لیے، ان کی موت کا جام تجویز کیا لیکن اسی دوران میں انھوں نے بالتھازار کو پول ہال میں اکیلا چھوڑ دیا۔

ارسلا نے پیاز کے قتلوں سے سجی بھنے ہوئے گوشت کی پلیٹ کے ساتھ آٹھ بجے تک انتظار کیا۔ کسی نے اسے بتایا تھا کہ اس کا شوہر خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے، ہر ایک کے لیے بیئر خرید رہا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کیوں کہ بالتھازار نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ جب وہ آدھی رات کے قریب سونے کے لیے بیڈ پر لیٹی تو اس وقت بالتھازار، ایک روشن کمرے میں تھا، جہاں چار کرسیوں والی چھوٹی میزیں تھیں اور وہاں ایک بیرونی ڈانس فلور تھا، جہاں اردگرد مرغ باراں چل پھر رہے تھے۔ اس کا چہرہ سرخی مائل تمازت سے چمک رہا تھا اور جب وہ مزید ایک بھی قدم اٹھانے کے قابل نہ رہا تو اس نے سوچا کہ وہ ایک ہی بستر میں دو عورتوں کے ساتھ لیٹنا چاہتا ہے۔ اس نے اتنا خرچا کر لیا تھا کہ اسے اپنی گھڑی گروی رکھنی پڑی، اس دعوے کے ساتھ کہ وہ ساری ادائی اگلے دن کر دے گا۔

صرف ایک لمحے بعد گلی میں کسی پر پھیلائے ہوئے عقاب کی طرح پڑے ہوئے، اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے جوتے اتار کر لے جا رہا تھا، تا ہم وہ اپنی زندگی کے، ان خوش کن خوابوں سے ابھی دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ عورتیں جو پانچ بجے کے قریب گرجے کی عبادت کے لیے، وہاں سے گزر رہی تھیں، انھوں نے اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی کیوں کہ ان کے خیال میں وہ مر چکا تھا۔

☆☆☆☆

گیبریل گارشیا مارکیز

خواب بھولنے والا

تب اس نے میری طرف دیکھا۔میرا خیال تھا کہ وہ پہلی بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔لیکن جب وہ لیمپ کے پیچھے سے ادھر مڑی اور میں نے کندھوں کے اوپر سے، اپنی پشت پر اس کی پھسلویں' چکنی نگاہ کو محسوس کیا، تو میں سمجھا کہ یہ تو میں تھا، جو پہلی بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کرسی کی پچھلی ٹانگوں پر، خود کو متوازن کرتے ہوئے، جھولنے سے پہلے ایک زبردست قسم کا تیز کش لیا۔اس کے بعد میں نے اسے وہاں دیکھا، جہاں وہ ہر رات کو میری طرف دیکھتے ہوئے، لیمپ کے قریب کھڑی رہی تھی۔ چند مختصر سے لحات میں ہم نے صرف یہ کیا کہ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔کرسی کی پچھلی ٹانگوں میں سے ایک پر، توازن برقرار رکھتے ہوئے، میں نے دیکھا۔وہ اپنے لمبے اور خاموش ہاتھ کو لیمپ پر رکھے ہوئے، کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے پپوٹوں کو ہر رات کی طرح روشن ہوتے دیکھا۔تب ہی میں نے اس معمول کی چیز کو یاد کیا۔میں نے اس سے کہا: ''نیلے کتے کی آنکھیں''اس نے لیمپ سے اپنا ہاتھ پرے ہٹائے بغیر مجھ سے کہا: ''یعنی ہم اس بات کو بالکل نہیں بھولیں گے۔''اس نے منظر سے پرے ہوتے ہوئے لمبی سانس لی۔''نیلے کتے کی آنکھیں'' میں نے اس کو ہر جگہ پر تحریر کیا ہے۔''

میں نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کی جانب حرکت کرتے ہوئے پایا۔میں نے ریاضی جیسی اشکال کے انداز کی روشنی کے، آخر میں آگے پیچھے ہوتے ہوئے، اس وقت اسے آئینے کے گول شیشے میں نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے، اس کی دہکتے کوئلے جیسی آنکھوں کے ساتھ، مسلسل اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔اس وقت وہ موتیوں والی گلابی سیپی کے ڈھکن والے چھوٹے سے ڈبے کو کھول رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی ناک پر پاؤڈر لگاتے ہوئے دیکھا۔ یہ کام ختم کر کے اس نے ڈبے کو بند کیا اور دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتے ہوئے، ایک بار پھر لیمپ کی جانب آئی کہ: ''مجھے خدشہ ہے کہ کوئی اس کمرے کے خواب دیکھ رہا ہے اور میرے رازوں کو افشا کر رہا ہے۔'' اور آئینے کے سامنے بیٹھنے سے پہلے

اپنے لرزاں لمبے ہاتھ کو گرم روشنی پر تاپتے ہوئے، اس نے کہا: ''تم سردی محسوس نہیں کر رہے۔'' میں نے اس سے کہا: ''ہاں کچھ کچھ'' اس نے مجھ سے کہا: ''تمھیں اس وقت اسے محسوس کرنا چاہیے۔'' اور تب میں نے جانا کہ میں کیوں اپنی نشست پر اکیلا نہیں رہ سکا تھا۔ یہ ٹھنڈک تھی جو مجھے تنہائی کا یقین دلا رہی تھی۔ اب میں اسے محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا: ''اور یہ عجیب بات ہے کیوں کہ رات خاموش ہے۔ ہوسکتا ہے پردہ گر گیا ہو۔'' اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوبارہ آئینے کی طرف آئی اور اپنا منہ دوسری طرف کیے ہوئے، میں نے کرسی میں پہلو بدلا۔ اسے دیکھے بغیر مجھے پتہ تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری پشت کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ آئینے کے سامنے بیٹھ چکی ہے اور اس طرح اس کے پاس اتنا وقت تو تھا کہ وہ اپنی نگاہوں کے توسط سے آئینے کی گہرائیوں میں اتر سکے اور اتنا وافر وقت بھی اس کے پاس تھا کہ وہ ان گہرائیوں سے واپس آ سکے اور اس کے ہاتھ کی پہلی جنبش سے پہلے حتیٰ کہ اس کے ہونٹ پیازی اور ارغوانی ہو جائیں، اس کے ہاتھ کے پاس اتنا وقت موجود تھا کہ وہ پھر سے پلٹا کھا سکے۔ میں نے اپنی مخالف سمت میں دیکھا۔ یہ ایک ہموار دیوار تھی جو ایک اور اندھے آئینے جیسی تھی، جس میں سے، میں اسے اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں یہ تصور کر سکتا تھا کہ وہ ممکنہ طور پر کہاں ہوسکتی ہے: جیسے دیوار کی جگہ ایک آئینہ لٹکا دیا گیا ہو۔ ''میں تمھیں دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ اور دیوار پر جو میں نے دیکھا، وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی نگاہیں اٹھائی تھیں اور اس نے مجھے کرسی میں پہلو بدل کر آئینے کی گہرائیوں میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ میرا چہرہ دیوار کی طرف ہو گیا تھا۔ تب میں نے اسے دوبارہ اپنی نگاہیں جھکاتے ہوئے دیکھا اور کچھ نہ کہتے ہوئے، اس سارے وقت میں، اس کی آنکھیں اپنی بریزئیر پر رہی تھیں۔ میں نے اسے دوبارہ کہا: ''میں تمھیں دیکھ رہا ہوں۔'' اور اس نے دوبارہ اپنی نگاہیں بریزیئر سے اٹھائیں۔ ''یہ ناممکن ہے۔'' اس نے کہا۔ میں نے پوچھا: کیوں۔ اور اس نے خاموش نگاہوں کے ساتھ دوبارہ بریزئیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''کیوں کہ تمھارا چہرہ دیوار کی طرف ہے۔'' تب میں نے کرسی کو گھمایا۔ میرے منہ میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ جب میرا رخ آئینے کی طرف ہو گیا تو اس کا رخ دوبارہ لیمپ کی طرف مڑ گیا۔ اب اس کے ہاتھ مرغی کے دو بازوؤں کی طرح گرم کرنے کی غرض سے شعلے کے بالکل اوپر پھیلے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ اپنی انگلیوں کے سائے تلے آ گیا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔'' اس نے کہا: ''اسے برف کا شہر کہا جانا چاہیے۔'' اس نے اپنا چہرہ سیدھا کر لیا اور اس کی جلد تانبے جیسی رنگت سے سرخ ہوتی ہوئی، یک دم

اداس ہو گئی۔ ''اس کے متعلق کچھ کرو۔'' اس نے کہا۔ اور تب اس نے اپنی بریزئیر سے آغاز کرتے ہوئے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتارنا شروع کر دیے۔ میں نے کہا: ''میں دیوار کی طرف اپنا چہرہ کر لیتا ہوں'' ۔نہیں تم مجھے اس حالت میں دیکھ سکتے ہو، بالکل ویسے ہی جیسے تم دیوار کی طرف منہ موڑ کر بھی مجھے دیکھتے رہے تھے۔ اور جوں ہی اس نے یہ جملہ ادا کیا وہ تقریباً مکمل طور پر بے لباس ہو چکی تھی اور شعلہ اس کی لمبی تانبے کے مانند جلد کو چوم رہا تھا۔ ''تمھارے پیٹ کی تمام تر گہرائیوں سمیت میں نے تمھاری جلد کو ہمیشہ اس انداز میں دیکھنے کی خواہش کر رکھی تھی جیسے کہ دھنائی کی گئی ہو۔'' اور اس سے پہلے کہ اس کے ننگے پن کے نظارے پر، میں اپنے لفظوں کے بھونڈے پن کو محسوس کر سکوں، وہ لیمپ کے گلوب پر خود کو گرم کرتے ہوئے بے حرکت ہو گئی اور اس نے کہا: ''بعض اوقات مجھے لگتا ہے کہ میں دھات کی بنی ہوئی ہوں۔'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں کی پوزیشن خفیف انداز میں بدلتی رہی۔ میں نے کہا: ''بعض دفعہ ایک اور طرح کے خوابوں میں' میں نے تمھیں کسی عجائب گھر کے ایک کونے میں رکھے ہوئے تانبے کے چھوٹے سے مجسمے کی طرح سوچا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تم سردی محسوس کر رہی ہو۔'' ''کبھی کبھی جب میں گہری نیند سو رہی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا جسم کھوکھلا ہو رہا ہے اور میری جلد تختی کے مانند ہو رہی ہے۔ اور جب خون میرے اندر گردش کرتا ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی میرے معدے پر دستک دے رہا ہو۔ اور میں اپنی تانبا آواز کو اپنے بستر پر محسوس کر سکتی ہوں۔ یہ اس طرح سے ہے کہ تم اسے ڈھانپی ہوئی دھات کہہ سکتے ہو۔'' وہ لیمپ کے اور زیادہ قریب ہو گئی۔ ''میں تمھیں باتیں کرتے ہوئے سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس نے کہا: ''اگر ہم دوبارہ کسی وقت مل پائیں اور جب میں سو رہی ہوں تو تم اپنا کان بائیں طرف میری پسلیوں کے ساتھ لگاؤ تو تم میرے اندر کی گونج سن سکو گے۔ میں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ کبھی تم ایسا کرو۔'' جب وہ بات کر رہی تھی تو میں نے اسے بھاری سانس لیتے ہوئے سنا۔ اور اس نے کہا کہ سالوں سے اس نے کچھ مختلف نہیں کیا۔ حقیقت میں اس کی زندگی مجھے پانے کے لیے وقف رہی تھی۔ ''نیلے کتے کی آنکھیں'' جیسے پہچان پا لینے والے جملے کے ذریعے۔ اور وہ اونچی آواز میں کہتے ہوئے باہر گلی میں جاتی تھی۔ اس انداز میں جیسے کہ وہ صرف اس شخص کو وہ یہ سب کچھ بتا رہی ہو جو کہ اسے سمجھتا تھا۔

''یہ صرف میں ہوں جو ہر رات کو تمھارے خوابوں میں آتی ہوں اور کہتی ہوں: ''ایک نیلے کتے کی آنکھیں۔'' اور اس نے کہا جب وہ ریستورانوں میں جاتی ہے تو کچھ آرڈر کرنے سے پہلے

ویٹروں سے کہتی ہے:'' نیلے کتے کی آنکھیں'' ۔لیکن وہ ویٹرز اپنے خوابوں میں اسے یاد کیے بغیر تعظیم سے جھک جاتے ہیں ۔تب وہ نیپکن کے اوپر لکھ دیتی ہے، چاقو سے میز کی وارنش کو کھرچتے ہوئے لکھتی ہے: '' نیلے کتے کی آنکھیں۔''اور اسٹیشنوں ،ہوٹلوں ،تمام عوامی عمارتوں کی بھاپ چھوڑتی کھڑکیوں پر انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے لکھتی ہے:'' نیلے کتے کی آنکھیں۔''اس نے کہا کہ ایک بار وہ ایک ڈرگ سٹور میں گئی تو اس نے ویسی ہی خوشبو، جو ایک رات کو،اس نے سوتے ہوئے مجھے خواب میں دیکھ کر محسوس کی تھی ،وہاں پائی ۔ڈرگ سٹور کی صاف ستھری نئی ٹائلوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا اسے یہیں قریب ہونا چاہیے ۔تب وہ ایک کلرک کے پاس گئی اور اس نے اس سے کہا:''میں نے ہمیشہ ایک ایسے آدمی کا خواب دیکھا ہے، جو مجھ سے کہتا ہے:'' نیلے کتے کی آنکھیں۔'' کلرک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا:''مس' حقیقت یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں اس طرح کی ہیں ۔''اور تب اس نے اس سے کہا:''میں اس شخص کی تلاش میں ہوں جس نے بالکل یہی الفاظ میرے خوابوں میں کہے تھے ۔''اور کلرک نے ہنسنا شروع کر دیا اور وہ کاؤنٹر کے دوسرے کونے کی طرف مڑ گیا ۔وہ صاف ستھری ٹائل کو دیکھتی رہی اور اس کی خوشبو کو سونگھتی رہی ۔اور اس نے اپنا پرس کھولا اور اپنی قرمزی لپ اسٹک سے ٹائلوں پر سرخ حروف میں لکھا:'' نیلے کتے کی آنکھیں۔'' کلرک جدھر کہ وہ تھا واپس آیا ۔اس نے اسے بتایا ''میڈیم ،آپ نے ٹائلوں کو گندا کر دیا ہے ۔اس نے اسے ایک گیلا کپڑا تھماتے ہوئے کہا ۔اسے صاف کرو۔''اور اس نے لیمپ کے قریب ساکن رہتے ہوئے کہا ۔''اپنے چاروں ہاتھوں پاؤں پر جھکے ہوئے اس نے یہ ساری سہ پہر ان ٹائلوں کو دھوتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے صرف کی:''نیلے کتے کی آنکھیں''، حتیٰ کہ لوگ دروازے پر اکٹھے ہو گئے اور انھوں نے اسے پاگل گردانا ۔''

اور اب جب اس نے بولنا بند کیا تو میں ایک کونے میں کرسی پر بیٹھا جھولتا رہا ۔''ہر روز میں اس فقرے کو یاد کرتا ہوں ،جس کی وجہ سے مجھے تم کو پا لینا چاہیے ۔''میں کہتا ہوں،''اب میرا نہیں خیال کہ میں کل اسے بھلا دوں گا ۔حالاں کہ ہر بار میں نے ہمیشہ یہی کچھ کیا ہے لیکن جب میں نیند سے بیدار ہوتا ہوں تو ان الفاظ کو، جن کی وجہ سے میں تمھیں پا سکتا ہوں، ہمیشہ بھول جاتا ہوں ۔''اور اس نے کہا:''تم نے پہلے ہی دن انھیں خود سے گھڑ لیا ۔''میں نے کہا:''میں نے انھیں گھڑا کیوں کہ میں نے تمھاری خاک رنگ آنکھیں دیکھیں تھیں ۔لیکن اگلی صبح کو میں انھیں یاد نہ رکھ سکا ۔''اس نے لیمپ کے قریب اپنی موڑی ہوئی کلائیوں کے ساتھ بھاری سانس لی اگر تم کم از کم اب یہ یاد رکھ سکو کہ میں انھیں کون سے شہر میں لکھتی

رہی ہوں۔''

اس کے مضبوطی سے جمے ہوئے دانت روشنی کے اوپر چمکے۔ ''میں تمھیں اب چھونا چاہوں گا۔'' میں نے کہا۔ اس نے اس چہرے کے ساتھ، جو روشنی کی طرف دیکھ رہا تھا، اپنی طرح اور اپنے ہاتھوں کی طرح جلتی بجھتی ہوئی نگاہ اوپر کی اور میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھے اس کونے میں جہاں میں کرسی میں بیٹھا ہوا جھول رہا تھا، دیکھا۔ ''میں تمھیں بتا رہا ہوں اور یہ ایک سچ ہے۔'' میں نے کہا۔ لیمپ کی دوسری طرف سے اس نے ایک سگریٹ مانگا۔ سگریٹ کا سرا میری انگلیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے کہا: ''نہیں جانتی کہ میں کیوں یاد نہیں کر پا رہی کہ میں نے ان الفاظ کو کہاں لکھا تھا۔'' اس نے اداس ہو کر کہا: ''نہیں بات صرف اتنی سی ہے کہ بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ میں نے بھی خواب ہی دیکھا تھا۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا اور لیمپ کی جانب بڑھ آیا۔ وہ تھوڑا سا آگے کی طرف تھی اور میں سگریٹوں کے ساتھ ادھر جا تا گیا اور ماچس میرے ہاتھ میں تھی جو کہ لیمپ سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اسے اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور میرے ماچس کی تیلی جلانے سے پیشتر ہی وہ شعلے تک پہنچنے کے لیے جھک گئی: ''دنیا کے کسی شہر میں اس کی دیواروں پر یہ لفظ لکھے ہوئے ملیں گے۔'' نیلے کتے کی آنکھیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میں یاد رکھ سکا تب میں کل تمھیں ڈھونڈ لوں گا۔'' اس نے دوبارہ اپنا سر اٹھایا۔ اور اب جلتا ہوا کوئلہ اس کے ہونٹوں کے درمیان موجود تھا۔'' نیلے کتے کی آنکھیں۔'' اس نے آخری آہ بھری۔

آنکھیں آدھی بند کیے ہوئے، اس نے اپنی ٹھوڑی پر جھکے ہوئے سگریٹ کے ساتھ یاد کیا۔ تب اس نے انگلیوں کے درمیان دبے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کو نگلتے ہوئے تعجب کیا۔ ''یہ اب کچھ اور ہی طرح ہے میں حرارت پکڑ رہی ہوں۔'' اس نے نیم گرم اور کسی قدر تیز آواز کے ساتھ یوں کہا جیسے اس نے حقیقت میں نہ کہا ہو بلکہ ایسے جیسے کہ اس نے یہ سب کچھ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا ہو، اور اس کاغذ کو وہ شعلے کے قریب لے آئی ہو، جب کہ میں زور سے بولا: ''مجھے حرارت پہنچ رہی ہے۔'' اور وہ اپنے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان کاغذ کو مسلسل پکڑے ہوئے موڑ رہی تھی اور یہ ختم ہو رہا تھا اور میں زور سے بولا: ''اوپر ۔۔۔۔'' پھر کاغذ مکمل طور پر جل گیا اور اس کی سلوٹیں جو کہ دھول اور روشنی میں بدل گئی تھیں نیچے گر گئیں۔ ''یہ بہتر ہوا۔'' میں نے کہا: ''بعض اوقات میں تمھیں ایسی حالت میں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔''

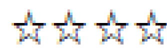
ہم کئی سالوں سے ایک دوسرے کو مل رہے تھے۔ بعض مرتبہ جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو کوئی شخص باہر ایک چمچ وغیرہ گرا دیتا اور ہم جاگ جاتے۔ آہستہ آہستہ ہم سمجھتے جا رہے تھے کہ ہماری دوستی چیزوں اور سادہ ترین وقوعوں کے زیر اثر آ چکی ہے۔ ہماری ملاقاتیں (نیندیں) اکثر معمولی سے شور سے ختم ہو جاتی تھیں۔

اب وہ لیمپ کے پاس سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ وہ ایک پرانے خواب میں سے، ماضی کے جھروکے سے، اسی انداز میں میری طرف دیکھا کرتی تھی، جب میں اپنی کرسی کو پچھلی ٹانگوں پر جھکا دیتا تھا اور ایک خاک رنگ آنکھوں والی عورت کی طرف میرا دھیان رہتا تھا۔ یہ وہ خواب ہی تھا جس میں، میں نے پہلی بار اس سے کہا تھا: ''تم کون ہو؟'' اور اس نے مجھ سے کہا تھا: ''مجھے کچھ یاد نہیں۔'' میں نے اس سے کہا: ''لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اس سے پہلے بھی ایک دوسرے کو مل چکے ہیں۔'' اس نے کہا: ''بالکل صحیح کہا تم نے۔ مجھے یاد آ رہا ہے۔'' اور اس نے کہا: ''کتنی عجیب بات ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ ہم کئی اور خوابوں میں آپس میں مل چکے ہیں۔''

اس نے سگریٹ کے دو لمبے کش لیے۔ میں ابھی تک کھڑا لیمپ کی طرف رخ کیے ہوئے تھا پھر اچانک ہی میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اوپر اور نیچے تک دیکھا اور اب بھی وہ تانبے جیسی تھی۔ وہ اب ٹھنڈی اور سخت دھات جیسی نہیں تھی بل کہ زرد نرم ملائم تانبے جیسی تھی۔ ''میں تمھیں چھونا چاہوں گا۔'' میں نے دوبارہ کہا۔ اور اس نے کہا: ''تم ہر چیز کو برباد کرو گے۔'' میں نے کہا: ''کچھ نہیں ہوگا۔'' ''بس ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہمیں دوبارہ ملاپ کے لیے تکیے کو الٹ دینا ہوگا۔'' اور اس نے لیمپ کے اوپر سے ہاتھ آگے کیا۔ وہ نہیں ہلی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے چھوؤں اس نے دوبارہ کہا۔ ''تم ہر چیز برباد کر دو گے۔'' ''شاید تمھیں لیمپ کے پیچھے سے آنا چاہیے، ہم سہمے ہوئے پتہ نہیں دنیا کے کس حصے میں جاگیں گے۔'' لیکن میں نے اصرار کیا۔ ''کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے کہا۔ اگر تکیے کو الٹ دیا جائے تو ہم ایک دوسرے سے ملاپ کر سکیں گے۔ لیکن جب تم جاگو گے تو تم سب بھول چکے ہو گے۔'' میں نے کونے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ شعلے پر اپنے ہاتھ تاپتی ہوئی، وہیں رکی رہی۔ اور میں اس وقت کرسی کے قریب نہیں تھا تب میں نے اپنے پیچھے اسے کہتے ہوئے سنا: ''جب میں آدھی رات کو جاگوں گی تو میں مسلسل بستر میں پہلو بدلتے ہوئے تکیے کی جھالر کے ساتھ، اپنے گھٹنے کو از حد گرم ہوتے ہوئے محسوس کروں گی اور میں اس عمل کو صبح ہونے تک دہراتی رہوں گی: نیلے کتے کی آنکھیں۔''

تب میرا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ ''صبح تقریباً ہو رہی ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''جب دو بجے کا عمل ہوا تو میں جاگ رہا تھا اور یہ بہت عرصے پہلے کی بات تھی۔'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔ جب میں نے ناب کو ہاتھ سے چھوا۔ میں نے اس کی وہی مستحکم آواز دوبارہ سنی۔ ''دروازہ مت کھولو۔'' اُس نے کہا: ''ہال کا راستہ مشکل خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔'' اور میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمھیں کیسے معلوم ہوا ہے؟'' اس نے مجھے بتایا: ''کیوں کہ میں ایک لمحے کے لیے وہاں موجود تھی اور مجھے واپس آنا پڑا کیوں کہ میں نے جانا کہ میں سو رہی تھی۔'' میں نے دروازے کو آدھا کھلا پایا۔ میں نے اسے تھوڑی سی حرکت دی۔ تب ٹھنڈی اور پتلی ہوا کے ذریعے مجھ تک گیلی فصلوں والی نباتی زمین کی مہک پہنچی۔ وہ دوبارہ بولی۔ میں نے خاموش قبضوں پر جھولتے دروازے کو حرکت دیتے ہوئے ایک اور موڑ دیا اور میں نے اس سے کہا: ''میں نہیں سمجھتا کہ یہاں باہر کوئی ہال ہے۔ مجھے دیہی علاقے کی مہک آ رہی ہے۔'' اور کچھ فاصلے سے وہ بولی: ''میں یہ تم سے بہتر طور پر جانتی ہوں۔ جو ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ باہر ایک ایسی عورت موجود ہے جو گاؤں کے بارے میں خواب دیکھ رہی ہے۔'' اس نے اپنے بازو شعلے کے اوپر ترچھے کیے۔ وہ بولتی رہی۔ ''یہ ایک ایسی عورت ہے، جس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ کسی گاؤں میں اس کا گھر ہو لیکن وہ شہر نہ چھوڑ سکی۔'' مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک ایسی عورت کو پچھلے خواب میں دیکھا تھا اور اب میں کھلے دروازے کے ساتھ جانتا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر مجھے ناشتے کے لیے نیچے جانا ہوگا۔ اور میں نے کہا: ''مجھے جاگ کر یہاں سے جانا ہوگا۔''

ایک لمحے کے لیے باہر ہوا پھڑ پھڑائی، پھر خاموش ہو گئی اور کوئی جس نے بستر میں اپنا پہلو بدلا، اُس کے سانس لینے کی آواز کو سنا جا سکتا تھا۔ کھیتوں سے آنے والی ہوا بند ہو گئی۔ مزید مہک بھی نہیں تھی۔ ''کل میں تمھیں اس سے پہچان لوں گا۔'' میں نے کہا: ''میں تمھیں پہچان لوں گا، اس وقت جب کہ کوئی عورت گلی میں دیواروں پر لکھ رہی ہوگی: ''نیلے کتے کی آنکھیں۔'' اور وہ اپنی ایک اداس مفتوح مسکراہٹ کے ساتھ، جو پہلے ہی سے ایک ناممکن اور ناقابلِ رسائی شے تھی، بولی۔ ''تاہم تم دن کے دوران میں ہر چیز کو بھول چکے ہو گے۔'' اور اس نے اپنے ہاتھ واپس لیمپ کے اوپر رکھے۔ اس کے خدوخال ایک گہرے بادل کے پیچھے چھپ گئے۔ ''تم وہ واحد شخص ہو، جسے جاگنے کے بعد یہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا خواب دیکھا تھا۔''



مبارک رابی

حامو گنجے کا قصہ

پہلے تو یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی'لیکن شاید اس کے دل میں کہیں موجود ضرور تھی' کیوں کہ بعد میں یہ لوگوں کا معاملہ بن گیا یا پھر اس عمارت کے مکینوں کا بھی مسئلہ بن گیا اور صحیح طور پر کہا جائے تو یہ کہ 'اس وقت جب ان سب نے اس کے متعلق بات چیت کی تو وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ آیا وہ اسے جانتے بھی تھے یا نہیں۔ یہ مسئلہ اس کے اچانک غائب ہو جانے پر سامنے آیا۔ اخبارات نے جو اشتہار شائع کیا وہ کچھ یوں تھا:''حامو سعید جو عرف عام میں ''حامو گنجا'' کہلاتا تھا اور جس کی عمر پچاس سال تھی ، چھ ماہ پہلے غائب ہو گیا۔ وہ رباط کی محافظ سٹریٹ میں ۷ نمبر کی عمارت میں بطور چوکیدار ملازم تھا۔ جو شخص اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو،اس سے درخواست ہے کہ براہ مہربانی اس کی اطلاع پولیس کو،اس کی بیوی مسز ---یا اس کے بچوں کو اس پتے ---پر دے۔''

اور تب ہی اس عمارت کے مکینوں کو،اس کی غیر حاضری محسوس ہوئی اور انھوں نے اس کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ جب انھوں نے اس کی گمشدگی کے بارے میں آپس میں تبادلہ خیال کیا تو تبھی وہ ایک دوسرے سے متعارف بھی ہوئے، حالاں کہ وہ ایک عرصے سے،ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔

انھیں معلوم تھا کہ حامو -----معاف کیجیے---حامو گنجا، ازل سے اس عمارت میں موجود تھا۔ سب سے پرانا مکین، جو اس عمارت میں پچھلے دس سال سے رہ رہا تھا'ان کا استقبال حامو گنجے نے ہی کیا تھا۔ شاید اس عمارت کا مالک ہی یہ جانتا تھا کہ حامو کب اس عمارت میں پہلے پہل آیا تھا۔ لیکن اپنے دفاع پر بہت زور دینے کے بعد،اس نے پولیس مین اور اپنے قریب کھڑے،اس عمارت کے مکینوں کو بتایا کہ میں اس کی،اس عمارت میں آمد کے بارے میں قطعی طور پر نہیں جانتا۔ اصل میں وہ کافی عرصے سے میری ملازمت میں ہے۔ لیکن کب سے ہے ---یہ میں نہیں جانتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس بات کا اندراج ضرور کہیں کیا ہوگا لیکن اس وقت، میں بھول چکا ہوں۔

سب سے پرانے مکین نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:''یہ شخص یقیناً یہاں اس

عمارت میں دس سال سے زیادہ عرصے سے موجود تھا' کیوں کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حقیقت میں اسی نے اس وقت میرا استقبال کیا تھا۔'' حامو کی بیوی نے کہا: ''میں ابھی تک اسی گھر میں رہ رہی ہوں، جہاں رہتے ہوئے میں چار بچوں کی ماں بن چکی ہوں اب مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن وہ یہاں اس وقت سے تھا جب آج سے کئی سال پہلے اس وقت ابھی میرے شوہر نے کوئی نوکری بھی حاصل نہیں کی تھی۔ ہمارا گھر بہت چھوٹا سا ہے اور اس شہر کے نواح میں واقع ہے۔'' اس نے مزید کہا: ''اس عمارت میں، اسے رہنے کے لیے جو جگہ مہیا کی گئی تھی وہ بس اتنی سی تھی کہ وہ بہ مشکل وہاں اپنی ٹانگیں پسار سکتا تھا اور اسی لیے، اس نے ہمیں یہاں اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ میرا شوہر دن اور رات کے کسی بھی موقعے پر یہاں چند گھنٹوں کی فرصت نکال کر روز گھریلو کام کاج کو نپٹانے کے لیے ضرور گھر آتا تھا۔ اس کے تعلقات ہمارے ساتھ بالکل پہلے ہی جیسے تھے۔'' پولیس مین نے انھی الفاظ کی روشنی میں عمارت کے داخلی راستے پر اکٹھے ہو جانے والے پڑوسیوں سے پوچھا: ''اس کا مطلب ہے کہ آپ میں سے، کسی نے بھی اس کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کیا۔۔۔۔ یعنی کہ کب وہ اپنے بیوی بچوں کو ملنے کے لیے گیا؟'' ایک خوب صورت نوجوان نے عینک کو، اپنے چہرے پر درست کرتے ہوئے کہا:

''اصل میں مجھے جب بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے ہمیشہ اسے یہیں حاضر پایا۔''

پولیس مین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے پوچھا:

''یعنی ہمیشہ۔۔۔۔؟''

''جی ہاں۔۔۔۔!''

''کیا رات کے وقت بھی۔۔۔۔ یعنی رات گئے بھی؟''

اس خوب صورت چہرے والے نوجوان نے جواب دیا:

''بعض اوقات آدھی رات کے بعد بھی۔''

پولیس مین نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے نہایت چالاکی سے سوال کیا:

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ رات کے، اس پہر کو تمھیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی تھی؟''

نوجوان ہکلانے لگا، اس نے اپنی گھبراہٹ اور خوف زدہ سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے جیبوں میں سگریٹ تلاش کرنے کی کوشش کی اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا:

''ہم سارے ایک جیسے ہی ہیں۔''

پولیس مین نے نوجوان پر سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹائیں جیسے کہ وہ کوئی مشکوک شخص ہو یا اس سے کوئی ضروری سراغ ملنے کی توقع ہو۔

"پہلے میں نے تم سے تمھارے بارے میں پوچھا۔ پھر میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تمھیں اس کی رات کے اس پہر ضرورت کیوں پڑتی تھی اور آخر میں جو کچھ تم نے کہا، اس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ ایسا تمھارے علاوہ سب ہی کرتے تھے اور مسٹر۔۔۔۔۔"

پولیس مین کو غائب ہو جانے والے شخص کا نام یاد کرنے کے لیے، اپنی نوٹ بک سے رجوع کرنا پڑا۔

نوجوان نے، جو اپنا سگریٹ ابھی تک نہیں سلگا سکا تھا، جواب دیا:

"میں نے بتا دیا ہے کہ ایسا ہم سب ہی کرتے تھے۔"

عین اسی وقت اس عمارت میں رہنے والی ایک عورت نے کہا:

"نہیں وہ صرف اپنے متعلق کہہ رہا ہے۔۔۔۔ یا پھر دوسرے مردوں کے بارے میں۔ لیکن ہم عورتوں کا، اس قصے سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ ہم عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی حاموگنجے سے کوئی سروکار نہیں رہا۔"

پولیس مین نے اس عورت کی طرف، اس کے بارے میں حاصل کردہ اپنی معلومات کے حوالے سے خاص توجہ کے ساتھ دیکھا۔ وہ ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کرتی تھی۔۔۔۔ تقریباً طلاق یافتہ کہ اس کی طلاق کا کیس ابھی التوا میں پڑا تھا۔۔۔۔ اس کی بیٹی ایک بورڈنگ سکول میں نرسری کلاس کی طالبہ تھی۔

تاہم اسے عورت کے چہرے پر گھبراہٹ وغیرہ کے کوئی آثار نہیں ملے۔ اس نے اردگرد کھڑے لوگوں کو بھی غور سے دیکھا۔ ان کے متعلق حاصل شدہ معلومات نے، اسے امید کی ایک کرن سے ہمکنار کر دیا۔

"اور کیا وہ کبھی تم لوگوں میں سے کسی کو بھی ملنے آیا؟"

اس عمارت کی نزدیکی ایک دکان کے مالک نے کہا:

"جناب دکان تو سب کے لیے کھلی ہوتی ہے۔"

"اس کا مطلب وہ تمھارے پاس آتا تھا۔"

''ہاں وہ سودا سلف لینے آتا تھا۔''

''کس قسم کا؟''

''ہر قسم کا۔۔۔۔روٹی۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔۔''

''اور اس کے علاوہ؟''

''بس اسی قسم کی ہی چیزیں جناب۔۔۔۔''

پولیس مین نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سوالات کے نتیجے میں وہ کولہو کے بیل کی طرح وہیں اسی جگہ گھوم رہا ہے، اس لیے اس نے اپنی تحقیقات کا دائرہ بڑھاتے ہوئے کہا:

''اچھا۔۔۔تو اب تم مجھے اس کے دوستوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔۔۔۔اس کے بھی ہماری طرح کچھ دوست تو ضرور رہے ہوں گے؟''

اگرچہ اس کی توجہ کنٹریکٹر پر مرکوز تھی لیکن تحقیقات کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے ایک طرح سے یہ سوال اس نے سبھی سے کیا تھا کنٹریکٹر نے بڑے جچے تلے انداز میں جواب دیا:

''یقیناً یہ شخص ہمارے پاس ایک عرصے سے تھا۔۔۔۔لیکن میری اس کے ساتھ واقفیت بس ''خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے'' اور جواباً اس کی طرف سے بھی ''اور تمھیں بھی خدا اپنی امان میں رکھے'' جیسے الفاظ تک محدود تھی۔

ہجوم کی طرف سے ملنے والے بہت سے جوابات آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

سوالات اور جوابات کی وسعت کا نظریہ بھی تقریباً ناکام ہی رہا تھا' پولیس مین نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور ایک دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے وہ لوگوں کی طرف مڑا اور کہنے لگا: ''میرے نزدیک اب یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ وہ شخص نہ تو کوئی مجرم تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی ایسی ویسی چیز کا ثبوت موجود ہے' تحقیقات سے یہ بھی پتہ چل چکا ہے کہ کسی کا مقروض بھی نہ تھا نہ ہی وہ بڑ ہانکنے والا شخص تھا اور نہ ہی مہم جو قسم کا آدمی۔ وہ تو ایک تنہائی کا مارا ہوا شخص تھا۔ اور دوسری طرف ان چھ مہینوں کے دوران میں جب سے کہ یہ شخص حاموبعنی ''حاموگنجا'' کے متعلق ایسی معلومات اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے' جن کے ذریعے اسے جس مصیبت میں وہ اس وقت گرفتار ہو سکتا ہے' نجات دلانے کی کوشش کی ضرورت ہے' یا یوں کہنا چاہیے کہ اس طرح اسے تلاش کرکے اس کے بیوی بچوں سے دوبارہ ملوا دینے کی

ضرورت ہے۔ میرے نزدیک اہم نکتہ یہ ہے کہ اپنی محدود آمدنی کے باوجود خاص طور پر اس شخص کے تعلقات اپنے بیوی بچوں سے بہت اچھے تھے۔ آپ لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح اس کی گمشدگی کا معما کس طرح حل کیا جائے؟ اس کی بیوی کا بیان اور آپ لوگوں کی آرا کا، اگر موازنہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ایک داخلیت پسند شخص تھا۔ وہ اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں لوگوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی اور نے اس کے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ اور جب وہ دن اور رات کے کسی حصے میں اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لیے جاتا تھا تو بھی کوئی شخص اس کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ شاید اس نے اس کام کے لیے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ اسے روپے پیسے کا بھی کوئی لالچ نہیں تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اتنی کم تنخواہ پانے کے باوجود اس نے اپنے مالک کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا بل کہ وہ اس کام سے مطمئن تھا۔ وہ کرایے کی ادائیگی کی کبھی کبھار کی دیری سے بھی پریشان نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ حقیقتاً ایک انسانی مسئلہ، اس لیے آپ میں سے کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کی، اس تقریر کا مثبت اثر پڑا۔ اور آخر کار اس خوب صورت نوجوان نے سگریٹ سلگا ہی لیا۔ لوگوں کے چہرے کا کھچاؤ ختم ہو گیا اور وہ نارمل ہوتے چلے گئے۔

انشورنس کمپنی کی ملازمہ بولی۔

''بے چارہ!۔۔۔۔خدا کرے وہ اپنے بیوی بچوں میں حفاظت کے ساتھ واپس آجائے۔''

اس کے گرد کھڑے لوگوں نے کہا: ''آمین'' اور سبھی خدا سے اس کے لیے سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔

یہ بات یقینی تھی کہ حاموگنجے کو اس وقت تک کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا جب کہ وہ الحافظ سٹریٹ کی اس عمارت میں ملازمت کرنے آیا تھا۔ بعد میں بہر حال اس کے دل کے اندر کسی مسئلہ نے ضرور گھر کر لیا تھا۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی کہ اپنی گمشدگی کی وجہ سے وہ لوگوں کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے، جن کا اس عمارت سے کوئی تعلق تھا مثلاً: مالک اس عمارت کے مکین یا اس کے پڑوسی وغیرہ۔ اگر اس نے ایسا ہی کوئی طریقہ اختیار کیا ہوتا تو بھی یہ بات حتمی نہیں ہو سکتی تھی کہ دوسرے لوگ اس سارے معاملے کے متعلق یا تھوڑا بہت ہی اس کے اس اقدام کے بارے میں ضرور ہی جانتے ہوں گے۔

اس عمارت میں رہنے والے سبھی لوگ' صاف ستھرے اور مخلصانہ اطوار کے مالک تھے۔
عمارت کا مالک بھی ایسی ہی شخصیت کا حامل شخص تھا' گو کہ وہ کم ہی یہاں آتا تھا۔ ہر مہینے کے آخر میں جب وہ کرایہ وصول کرنے آتا' خالی فلیٹوں کے بارے میں استفسار کرتا یا پھر ان فلیٹوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا جو کہ عنقریب خالی ہونے والے ہوتے تھے تو تب بھی وہ چوکیدار سے بات چیت کرنے یا اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ جب بھی وہ یہاں آتا تو حامو گنجا، اسے کبھی تنہا نہ چھوڑتا' مل کہ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا اور یوں اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی ہوگی۔ لیکن سارا قصہ یہ ہے کہ عمارت کے مالک نے جب اپنی یادداشت پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ وہاں سے جانے والا ہوتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ حامو ہمیشہ اس سے کچھ پوچھنے یا سوال کرنے کی تگ و دو میں ہوتا تھا۔ مالک جب واپس جاتے ہوئے صرف اس لیے رک جاتا کہ حامو، اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہے، پوچھ لے۔ حامو گنجا ہمیشہ یہی کہتا کہ نہیں اسے اس سے کوئی بات نہیں کہنی مثلاً: اپنی تنخواہ وغیرہ کے بڑھانے کے بارے میں یا ایڈوانس لینے کے بارے میں بھی نہیں۔۔۔۔ وہ اگر کچھ کہتا تو بس یہی کہ: ''بس جناب کوئی خاص بات نہیں۔'' مالک کہتا:

''کہو میاں کہو۔۔۔۔''

وہ جواب میں ہکلانے لگتا اور یوں لگتا کہ اظہار کے لیے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے وہ مزید کہتا:

''دیکھیے جناب جب کوئی شخص اپنے اندر بہت گہرائی میں کچھ محسوس کرتا ہے۔۔۔۔ یعنی کچھ۔۔۔۔؟''

لینڈ لارڈ کے پاس چوں کہ ہمیشہ ہی وقت کم ہوتا تھا، اس لیے وہ جاتے جاتے کہتا:

''اچھا بھئی۔۔۔۔ پھر سہی۔۔۔۔ پھر کبھی سہی۔۔۔۔!''

اور پھر وہ وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جب دائیں طرف کے فلیٹ نمبر ۳ میں رہنے والے شخص نے حامو کو ایک دن رات کے دو بجے اپنی رات کی محفل سجانے کے لیے کوئی چیز اس جگہ سے خریدنے کے لیے بھیجنا چاہا، جس جگہ کے بارے میں صرف حامو ہی جانتا تھا تو اس لمحے حامو کی زبان پر وہ دیرینہ سوال بالکل واضح ہو کر آ ہی گیا تھا' حامو نے اس خوب صورت نوجوان کی مطلوبہ چیز اسے پکڑاتے ہوئے کہا:

''جناب ۔۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟''

نوجوان جس کی آنکھیں اس وقت سرخ ہو رہی تھیں بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں بولا:

''باقی پیسے اپنے پاس ہی رکھو ۔۔۔۔ خدا حافظ!''

اس بات چیت کے صرف چار گھنٹے بعد، جب اس نوجوان نے، ان لڑکیوں کو واپس ان کے گھروں تک پہنچانے کے لیے کہا۔'' کیوں کہ وہ خود انھیں وہاں تک پہنچانے کی حالت میں نہیں تھا' تو اس وقت بھی وہ سوال حامو کے ذہن میں ابھی بالکل تازہ اور واضح تھا' لیکن وہ سوال اس نے اس سے اس لیے نہ کیا کہ وہ جانتا تھا کہ اسے اس کا کوئی جواب نہیں ملے گا۔ پھر اس نے اپنے طور پر بہت بنا سنوار کر وہ سوال ان دونوں میں سے ایک لڑکی سے کر ہی دیا:

اس نے اس لڑکی سے پوچھا:

''دنیا میں اس وقت کیا ہو رہا ہے؟''

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور اپنی دوست پر جھکتے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا:

''دنیا! بھلا تمھیں اس سے کیا سروکار؟ ۔۔۔۔ بس تم اپنے خدا پر بھروسہ رکھو۔''

اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنی ساتھی کے ساتھ، اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

جب اس دن وہ، انشورنس کمپنی میں ملازم، اس مطلقہ کے براؤن بلاؤز کے لیے دو بٹن لے کر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بلاؤز کے کھلے حصے کو اپنے ہاتھوں میں تھامے اپنے دروازے پر ہی اس کی منتظر تھی۔ اس نے وہ سوال اپنے ذہن میں تیار کر لیا' اور جب اس عورت نے اپنی چیز اس سے وصول کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا:

''میں اس عمارت میں ایک ایسی حالت میں ۔۔۔۔''

لیکن اس عورت نے اس کی بات سنے بغیر اسے وہیں چھوڑ کر، اپنا دروازہ بند کر لیا تھا' پھر ایک لمحے بعد وہ تیزی سے باہر نکل کر یوں چلنے لگی جیسے اس کے جوتے اس کے پاؤں کو تکلیف دے رہے ہوں۔ وہ ابھی تک وہیں عمارت کے داخلی راستے پر کھڑا تھا کہ اس نے اس عورت کی بڑبڑاہٹ سنی۔

''خدا کی پناہ ۔۔۔۔ وقت تو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔''

ایک پڑوسی دکان دار نے اس سے ایک بار پوچھا تھا:

''حامو ۔۔۔۔ میں نے آج تمھیں ایسے موڈ میں دیکھا تھا جیسے کہ تم کوئی بات ۔۔۔۔ یعنی

کچھ۔۔۔۔"

حامو گنجے نے محسوس کیا کہ جو کچھ اس کے اندر پک رہا ہے، اس کا اظہار وہ اس شخص سے کر سکتا ہے' وہ اس کی بات سمجھ سکتا تھا کیوں کہ وہ شخص اپنے اردگرد بکھری چیزوں کو اٹھا کر ٹوکری میں ڈال رہا تھا۔

حامو گنجے نے کہا:

"اصل میں بات یہ ہے میرے بھائی کہ کچھ عرصے سے میرا دماغ بہت معاملات کی وجہ سے الجھا ہوا ہے۔"

دکان دار نے اس کی ساری مطلوبہ چیزوں کو اٹھا کر ٹوکری میں رکھتے ہوئے کہا:

"اب جاؤ۔۔۔۔میرے بھائی' جلد اپنے آقا کے پاس پہنچو۔۔۔۔اس نے تو تمھیں ڈھونڈنا بھی شروع کر دیا ہے۔مہربانی کر کے مجھے ان چیزوں کے پیسے پہنچا دینا۔"

اس عمارت میں رہنے والا سب سے پرانا مکین، حقیقت میں حامو گنجے کو تیزی سے واپس آتے ہوئے، اپنی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ جب حامو نے دوسرے فلور پر وہ ٹوکری، اس کے دروازے پر اسے پکڑائی اور واپس جانے ہی والا تھا تو اس شخص نے اسے روک کر اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے حامو کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا:

"کیا وہ چلی گئی۔۔۔۔؟"

حامو اس کی بات سمجھ نہ سکا۔لیکن وہ آدمی بڑے مخصوص انداز میں مسکرایا، تا کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کر سکے' اس طرح اس کی مصنوعی دانتوں کی بتیسی اپنی جگہ سے ہل گئی، اس نے دانتوں کو دوبارہ جبڑے میں صحیح حالت میں لاتے ہوئے پھر اپنی پلکیں جھپکائیں اور کہا:

"وہ نچلی منزل والی پڑوسن یا۔۔۔۔"

"وہ اچھا وہ۔۔۔۔وہ تو ابھی نہیں گئی۔۔۔۔"

"خدا تمھارا بھلا کرے مسٹر حامو۔۔۔۔"

جب پولیس والا وہاں سے چلا گیا اور باقی لوگ بھی وہاں سے ہٹنے ہی والے تھے تو لینڈ لارڈ نے ان کرایہ داروں سے' جنھوں نے ابھی تک کرایہ ادا نہیں کیا تھا' ان سے کرائے کے متعلق بات کرنے کا یہ موقع غنیمت جانا' اسی لمحے اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"بے چارہ چوکیدار۔۔۔۔میں نے کبھی اسے کچھ کہتے ہوئے نہیں پایا۔"

محمد مرابط

ڈاکٹر صفی

صفی اکیلا رہتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور وہ وہاں ایسے ہی زندگی بسر کر رہا تھا جیسے کہ دوسرے سب لوگ کرتے تھے، سوائے ایک فرق کے کہ وہ کوکین کے نشے کے ذریعے ایک خاص لطف بھی حاصل کرتا تھا۔ وہ سرخ پوست جمع کرتا اور جوا سے مل پاتے وہ انھیں گھر لے آتا۔ وہ ان کی پتیاں علاحدہ کرتا اور ان کے دو سبز بیجوں والے ڈوڈے لکڑی کے چھوٹے سے ٹکڑے کے ذریعے کچل کر ایک پیالے میں ڈالتا۔ وہ چائے دانی میں تھوڑی سی کوکین کا گودا ڈالتا، اس میں چائے چینی اور ابلتا ہوا پانی ڈالتا اور اس برتن کو چولہے پر رکھ دیتا۔ جب یہ تیار ہو جاتا تو وہ اس برتن میں تازہ پودینا ڈالتا۔ آخر میں وہ اپنے لیے گلاس میں چائے انڈیلتا اور چٹکی بھر نسوار لیتا۔ لیکن اس نسوار میں کوکین بھی شامل ہوتی۔ وہ خشک ڈوڈوں کا سفوف بناتا تھا اور وہ تمباکو کے ساتھ، اسے اس پر چھڑکتا تھا۔

ایک دن وہ اپنی چائے پی چکنے اور نسوار سونگھنے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں سے وہ صحن میں موجود اپنے گدھے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا، جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو محسوس کیا وہ وہ کچھ نہیں کر رہا تھا جیسے کہ وہ معمول کے مطابق کیا کرتا تھا۔ وہ ایک عجیب طریقے سے زمین پر لڑھک رہا تھا اور اس کے منہ سے تھوڑی سی جھاگ بھی نکل رہی تھی۔ صفی اٹھ بیٹھا اور اس کے پاس آیا۔ یہ ایک بوڑھا گدھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے دانت خراب ہو چکے تھے۔ اس نے اس کے منہ کے اندر جھانکا اور پھر اس نے اس کے چار دانت کھینچ کر باہر نکال دیے۔

تمھارے پاس اب تھوڑے سے ہی صحت مند دانت رہ گئے ہیں۔ اس نے گدھے کو اطلاع کی۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ اگر میں انھیں بھی باہر نکال دوں تو میں تمھیں مصنوعی دانتوں کا ایک سیٹ لگوا دوں گا۔ تم چیزوں کو چبانے کے لائق تو پھر بھی رہو گے۔

بعد میں دن ختم ہونے پر، صفی اپنے دوستوں کے ساتھ گاؤں کی مسجد کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طالب اپنے چہرے پر ہاتھ رکھے ہوئے، وہاں سے گزرا۔ ''میرا دانت'' وہ چلا رہا تھا۔ صفی کو کین

کے مکمل سرور میں تھا اور اس کی یادداشت میں گدھے کے نکالے ہوئے دانت، ابھی تک محفوظ تھے۔ اس نے طالب سے کہا میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمھارا دانت نکال دوں گا۔''

وہ طالب کو اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ وہاں اس نے اسے چٹائی پر بیٹھنے کو کہا اور ساتھ ہی اس نے اسے اس خاص چائے کا گلاس پینے کو دیا۔ تب اس نے طالب کو کوکینی نسوار کی چند چٹکیاں دیں۔

پھر جلد ہی صفی نے طالب سے کہا۔ اپنا منہ کھولو، وہ والا دانت کدھر ہے؟ اچھا یہ والا!!

اس نے اس کے ساتھ ایک ڈوری باندھی۔ کہو اللہ۔ اس نے طالب سے کہا۔ پھر اس نے دانت کو ایک جھٹکے سے اکھاڑ دیا اور اس نے اسے نمک ملے گرم پانی کا گلاس دیا اور اسے کہا کہ وہ اس سے غرارے کرے۔

کتنے پیسے؟ طالب نے پوچھا۔

صفی نے کچھ سوچا اور کہا اس بار تو بالکل فری کیوں کہ تم میرے پہلے گاہک ہو۔

طالب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔ صفی جب اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو اس نے اپنے آپ سے کہا: ''اور اب میں اپنا کلینک بناؤں گا۔''

صفی نے اپنی اضافی زمین پر ایک جھونپڑی جیسی عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔ جب یہ مکمل ہوگئی تو اس نے اس کی دیواروں کے ساتھ بینچ رکھ دیے۔ اس نے تین آئینے خریدے اور چاقو اور پلاس رکھنے کے لیے ایک عدد میز حاصل کی۔ اس نے کئی بوتلوں میں نمک ملا پانی بھر دیا۔ کمرے میں داخلے کے لیے ساتھ ساتھ دو دروازے تھے۔ ایک پر، اس نے ایک بورڈ لٹکایا جس پر لکھا تھا: ''ڈاکٹر صفی: انسانوں کے لیے'' دوسرے پر درج تھا۔ ''ڈاکٹر صفی۔ حیوانوں کے لیے''

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک سہ پہر کو ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ عورت اپنے دو دانت نکلوانا چاہتی تھی، صفی کوکین کے نشے میں دھت تھا اور اسے کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے عورت کے ہاتھ، اس کی کمر پر باندھے اور اس کے منہ میں جھانکنے سے پہلے اس کی دونوں ٹانگیں بھی باندھ دیں۔

اس نے مرد سے کہا: ''اس کا سر مضبوطی سے پکڑو''۔ پھر اس نے پلاسوں کا ایک جوڑا اپنے ہاتھ میں لیا۔ ''اپنا منہ کھولو''!!

کیا یہی ہے وہ دانت؟ ہاں عورت چیخی۔

تو کہو۔اللہ اور ابھی وہ کہہ ہی رہی تھی کہ اس نے دانت باہر نکال دیا۔عورت نے درد سے کراہنا شروع کر دیا۔اس نے اسے نمک والے پانی کا گلاس دیا۔تب وہ اس کی طرف بڑھا اور اس نے اس کا دوسرا دانت بھی نکال دیا۔اس بار وہ بے ہوش ہوگئی اور فرش پر گر گئی۔

جب صفی نے اسے فرش پر گرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا تو وہ ڈر گیا۔لیکن وہ اپنے کمرے میں گیا اس نے تھوڑا نرم صابن لیا تا کہ وہ اسے مسوڑوں کے ان سوراخوں میں بھی بھر سکے، جو دانت نکالنے کی وجہ سے بن گئے تھے۔ جب عورت ہوش میں آئی تو اس نے اپنے شوہر سے باتیں کرنا شروع کر دیں اور پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کے منہ سے ڈھیروں جھاگ نکلنے لگا۔یہ دیکھ کر اس کا شوہر خوف زدہ ہوگیا لیکن صفی اسی طرح اپنے کام میں محو رہا۔وہ جست کا آمیزہ اور تھوڑا سا لوبان لایا۔عورت کوئلوں کی انگیٹھی کے قریب بیٹھی ہوئی تھی،اس نے لوبان کے ٹکڑے آگ میں پھینکے عورت نے اس دھوئیں والی سانسیں اپنے اندر کھینچیں۔اب اس نے عورت کو کوکین والی چائے کا گلاس دیا اور اسے کہا:''اسے گرم گرم پی جاؤ۔''

جلد ہی عورت اپنے شوہر کو بتانے لگی کہ سارا درد جاتا رہا تھا۔تب صفی نے اپنے آپ سے کہا: ''میں نے دانتوں کے لیے صحیح دوائی ڈھونڈ نکالی ہے۔''

''کیا پیش کروں؟وہ شخص بولا۔

صفی نے دونوں دانت ہاتھ میں لیے کچھ دیر تک انھیں بغور دیکھنے کے بعد کہا:''بڑے دانت کے پانچ ریال اور چھوٹے دانت کے دو ریال آپ کو دینا ہوں گے۔''

ایک اور دن ایک آدمی آیا اور اس نے صفی کے دروازے پر دستک دی۔''السلام علیکم''کسان نے کہا:''میرے پاس ایک گائے ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کے دانت خراب ہیں۔''

''اندر آجاؤ۔''صفی نے کہا،''اور گائے کو دوسرے دروازے سے اندر لے آؤ''کسان گائے کو اندر لے آیا۔صفی نے گائے کا منہ کھولا اور اندر دیکھا۔وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہاں کوئی مسئلہ تھا یا نہیں۔اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور کوکین کے خمیر کے ساتھ اس نے اسے موٹی سی شکل میں پھیلا لیا۔جب گائے نے اسے کھا لیا تو اس نے اس کا منہ دوبارہ کھولا اور ہتھوڑے سے ایک ایک کر کے اس کے دانتوں پر ہولے ہولے ضرب لگائی۔اس نے کسان کو بتایا۔گائے کے دانتوں میں کوئی خرابی نہیں۔تم یہ دوائی لے لو۔وہ پہلے سے بہتر محسوس کرے گی۔اس نے کسان کو کوکین کا خمیر ایک بڑی مقدار میں دیا۔

''مجھے کتنی ادائیگی کرنی ہوگی؟''

''ڈیڑھ ریال۔''

اس آدمی نے ادائیگی کی اور چلا گیا۔ جب وہ گھر گیا تو اس نے گائے کو دوائی دی اور اسے دوسرے جانوروں کے ساتھ چھوڑ دیا لیکن کوکین تو گائے کے سر کو چڑھ گئی۔ اس نے ڈکرانا شروع کر دیا اور لاتیں مارتے ہوئے، دوسرے جانوروں پر حملہ آور ہوئی۔ جب کسان یہ معلوم کرنے کے لیے باہر نکلا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا تو وہ اسے دیکھ کر، اس کی طرف دوڑی آئی اور اس نے اسے ٹکر مار کر ہوا میں اچھال دیا۔ پھر وہ مڑی اور اس نے اپنا ایک سینگ اس کی ران میں گھونپ دیا، جس سے اسے گہرا زخم آیا۔ ہمسائے دوڑے ہوئے آئے اور انھوں نے گائے کو باندھ دیا۔

ہمسایوں نے سوچا ہمیں اسے ڈاکٹر صفی کے پاس لے کر چلنا چاہیے۔ وہ کسان کو ساتھ لے کر کلینک پر آئے۔ ڈاکٹر صفی نے اس کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ اس نے ایک سوئی اور موٹا دھاگا لیا۔ کراہنا مت! اس نے کسان سے کہا۔ میں تمھاری ٹانگ کے زخم کو سینے والا ہوں۔ اس نے سوئی اس آدمی کے گوشت میں گھسائی اور آدمی نے درد سے چلانا شروع کر دیا۔ اس نے سوئی نکال لی اور اس کے لیے، اسی چائے کا گلاس لایا۔ جب اس آدمی نے یہ گلاس پی لیا تو وہ اس کے لیے ایک اور گلاس لایا۔ اس نے سوئی دوبارہ داخل کی اور آدمی دوبارہ چلایا۔ مجھے اس طرح کی صورتِ حال کے مطابق صحیح دوا حاصل کرنی چاہیے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ کوکین کا سفوف لایا اور چائے کا تیسرا گلاس بھی لایا۔ اس سفوف کو اپنے منہ میں رکھو اور اسے پی لو۔ اس نے اسے بتایا۔ اس نے پندرہ منٹ تک انتظار کیا کسان اس دوران میں سو گیا تھا۔ تب صفی نے اس کی ٹانگ میں ٹانکے لگائے۔ اب اسے گھر لے جاؤ اور اسے بستر پر لٹا دو۔

ہمسایوں نے پوچھا ہم آپ کو کیا پیش کریں؟

یہ ایک بھاری کام تھا۔ صفی نے انھیں بتایا میں نے کافی مہنگا دھاگا استعمال کیا اور اس عمل میں میری چار سوئیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس لیے میں تم سے بیس ریال لوں گا۔

ہر ہمسائے نے تھوڑا تھوڑا حصہ ڈالا۔ انھوں نے صفی کو ادائیگی کی اور کسان کو گھر لے گئے۔ جب وہ چلے گئے تو صفی بھیڑ کی کھال پر بیٹھ کر لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے اپنے لیے اسی خاص چائے کا گلاس تیار کیا اس میں کوکین کا چمچ بھر خمیر ڈالا اور اسے پی گیا۔ اب اس نے اپنے آپ کو، چوں کہ ایک

ڈاکٹر سمجھنا شروع کر دیا تھا، اس لیے اس نے سوچا کہ اب اسے شہر سے دوائیاں خرید کر لانی چاہئیں۔ مجھے ان چیزوں کی، جن کی مجھے ضرورت ہے ایک فہرست بنانی چاہیے۔ وہ اُٹھا، اس نے لکھنے کے لیے ایک گتا اور بید کے ایک ٹکڑے سے بنایا گیا قلم لیا۔

پہلی دوائی جس کی مجھے ضرورت ہے۔ وہ ہے سرخ مرچ۔ اس کے بعد مجھے ضرورت ہے سفید زیرے اور کالی مرچ کی۔ اور پھر مہندی کی۔ وہ بہت سی اور چیزوں کے نام جنھیں وہ خریدنا چاہتا تھا لکھنے میں لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو چل دیا۔ اس نے سرائے میں اپنا گھوڑا باندھا۔ پھر وہ اس شخص کو ملنے چلا گیا، جس کا دروازے کے ساتھ ایک سٹال تھا۔ مجھے دو پیسے کی سرخ مرچ اور دو پیسے کی کالی مرچ دو۔ اتنی ہی قیمت کا سفید زیرہ، دار چینی اور سونف بھی دے دو۔ اس نے اس شخص کو پیسے دیے اور اگلے سٹال پر گیا۔ مجھے دو پیسے کا Yasoul، سنگترے کے پھولوں کے رس کی ایک بوتل اور اتنے ہی پیسوں کا Chibb دے دو۔ اس نے پیسے ادا کیے اور بازار کی طرف بڑھا، جس کی حد بندی پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر ایک چھتری پھیلی ہوئی تھی اور اس کے سامنے بہت سی قسموں کے سفوف اور پیروزے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ریال کا لوبان خریدا۔ پھر وہ ایک پرچونیے کے پاس گیا اور اس سے ایک پاؤنڈ شہد، ڈوری اور سوئیاں خریدیں۔

شہر سے نکلنے سے پہلے اس نے لکڑی کے تین بڑے کریٹ خریدے کیوں کہ وہ مریضوں کے لیٹنے کے لیے بینچ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے ساری چیزوں کو گھوڑے پر لادا اور گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

جب صفی گھر واپس آیا تو وہ مختلف کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے دونوں آتش دانوں میں چولہے بنائے اور اس نے چولہے پر پانی کی بالٹی رکھی، دوسرے کمرے سے وہ ہر سائز کی بوتلیں لایا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو اس نے تینوں کریٹوں کے ٹکڑے علاحدہ کیے اور میخیں نکال لیں۔ جب پانی کھول گیا تو اس نے ایک بالٹی میں سونف اور دوسری میں سفید زیرہ ڈال دیا اور دونوں بالٹیوں کو چولہے پر رکھ کر پانی کو ابلنے دیا۔ جب کافی دیر کے بعد پانی ابل گیا تو اس نے بوتلوں میں اسے بھرنا شروع کر دیا۔ اس نے بوتلوں پر کارک لگائے اور انھیں الماری میں رکھ دیا۔ باقی کی اشیا کو اس نے ڈبوں میں ڈالا اور انھیں دوسری الماری میں رکھ دیا۔ سب سے آخر میں اس نے کریٹوں سے بینچیں بنائیں اور ان کو پٹ سن کے تھیلوں سے ڈھانک دیا تاکہ وہ لیٹنے پر آرام دہ ثابت ہوں۔

ایک شام کو جب اس نے کوکین کی ایک بھاری مقدار لے لی تھی اس نے دروازے پر دستک

کی آواز سنی۔اسے کوئی پکار رہا تھا۔اس نے دروازہ کھولا،اسے ایک بندہ نظر آیا۔کہو۔کیا بات ہے؟
میری بیوی کو بچہ ہونے والا ہے اور کیس دائی کے بس سے باہر ہے۔

میں جا کر اس کا معائنہ کروں گا۔صفی نے کہا۔اس نے ابلی ہوئی سونف والی بوتل لی اور ایک سفید زیرے والی اور اس بندے کے پیچھے چل پڑا۔وہ اس شخص کے گھر پہنچ گیا۔مجھے ایک گلاس دو صفی نے کہا۔اس نے سفید زیرے اور سونف والا پانی آپس میں ملایا اور اس بندے کو کہا کہ وہ اسے اپنی بیوی کو پلا دے۔جب عورت نے وہ (جوشاندہ) پی لیا تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے بستر پر ادھر اُدھر حرکت کرنے لگی۔صفی نے اس کو چوتڑوں سے پکڑ لیا اور اسے آگے کی طرف دھکیلا تو بچہ باہر پھسل پڑا۔

عورت نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ناف کاٹ دی۔سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔صفی نے کہا۔

کتنی فیس ہو گی آپ کی؟

میرے پاس جو بہترین دوا تھی وہ میں نے دی تھی۔صفی نے بتایا اور یہ بہت مہنگی بھی تھی۔
میں نے یہ تمھیں چالیس ریال کی قیمت کی دی تھی۔

میرے پاس ایک نوجوان گائے ہے،بندے نے بتایا،اگر آپ چاہیں تو میں وہ آپ کو دے سکتا ہوں۔

''ٹھیک ہے۔''صفی نے کہا۔''ہم کل شیخ کے سامنے،اس سودے کی تکمیل کریں گے۔''بندہ رضامند ہو گیا۔اگلی صبح صفی اس نوجوان گائے کے ساتھ اس شخص سے ملنے گیا اور پھر وہ دونوں شیخ کے پاس گئے۔وہ بچھڑے کو گھر لے آیا اور اس نے اسے دوسری گائیوں کے ساتھ باندھ دیا۔وہ بہت خوش تھا کیوں کہ اس کی قیمت چالیس ریال سے یقیناً زیادہ تھی۔

ایک دن چند لوگ ایک دوسرے شہر کے پاشا کو اسے دکھانے کے لیے لائے۔وہ ایک ایسا شخص تھا جو ہر وقت بیمار ہی رہتا تھا اور جب بھی وہ کسی سفر پر جاتا تھا تو اسے کسی ڈاکٹر کو ضرور دکھانا پڑتا تھا۔جب اسے،اپنے میزبانوں کی زبانی پتہ چلا کہ گاؤں میں ایک ڈاکٹر موجود ہے تو اس نے،اسے فوری طور پر ملنا چاہا۔اور یوں وہ اسے سٹریچر پر ڈال کر اس کے کلینک میں لائے۔

پاشا سوچ رہا تھا شاید یہی شخص مجھے بالآخر صحیح دوائی دے دے۔جب وہ کلینک پر پہنچے تو اس

وقت صفی ایک دوسرے جھونپڑے کی تعمیر کے آخری مراحل پر تھا: ''اسلام علیکم''، ''وعلیکم السلام'' یہ بُزدکا پاشا ہے، جو ادھر ہمارے پاس آیا ہوا ہے۔

''میں بہت بیار ہوں۔'' پاشا بول پڑا۔

''اسے اندر لے چلو،'' صفی نے کہا، ''تم کتنے لوگ ہو؟''

''ہم چھ بندے ہیں۔''

''میں صرف دس منٹوں میں کمرہ تیار کر دوں گا۔ تمھیں یہاں سونے کی ضرورت بھی پڑے گی کیوں کہ تم کو یہاں اس وقت تک ٹھہرنا ہوگا جب تک وہ صحت یاب نہیں ہو جاتا۔''

وہ مان گئے۔ صفی نے ہتھوڑے کو چلانا بند کر دیا اور فرش پر چند چٹائیاں بچھا دیں۔ تب پاشا اور اس کے دوست اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے صفی بھی چلا آیا۔ بعد میں اس نے ان کے لیے چائے تیار کی اور جب وہ اسے تیار کر رہا تھا تو اس نے اس میں کوکین بھی ڈال دی۔ پھر وہ ان کے لیے ایک پلیٹ میں کوکین ملا شہد لایا تاکہ وہ اسے چائے کے ساتھ کھا سکیں۔

جب وہ چائے پینے کے لیے بیٹھ گئے تو صفی نے پوچھا تم کیا بیاری محسوس کرتے ہو؟

مجھے نہیں معلوم۔ مجھے کوئی خاص قسم کی بیاری تو ہے نہیں۔

لیکن کوشش کرو اور مجھے بتاؤ کہ یہ کیسی ہے؟ صفی نے کہا۔

پاشا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں سوجاتا ہوں تو مجھے پتا نہیں لگتا کہ میں واقعی سو رہا ہوتا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا اور جب میں کچھ کھا لیتا ہوں تو مجھے پتا نہیں چلتا کہ میں نے کچھ کھایا ہے کہ نہیں اور جب میں سیر کر رہا ہوتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ میں واقعی سیر کر رہا ہوں یا نہیں حتیٰ کہ جب میں بے حرکت بیٹھا ہوتا ہوں تو حقیقت میں مجھے نہیں پتا ہوتا کہ میں بیٹھا ہوا ہوتا ہوں یا کہ نہیں۔ اور اس لمحے میں کیا بات کر رہا ہوں یا میں محض سوچ رہا ہوں کہ میں ایسا کر رہا ہوں؟

صفی اچھل پڑا۔ کیسی خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس مرض کے لیے میرے پاس صحیح دوائی موجود ہے۔ میں نے اس طرح کے کئی کیس دیکھے ہیں اور میں نے ان کا کامیابی سے علاج کیا ہے۔

واقعی پاشا نے خوش ہو کر کہا۔

''یہ شخص بیار نہیں ہے۔'' صفی نے سوچا۔ یہ محض ایک امیر آدمی ہے اور مرنے سے ڈرتا ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے۔

اس نے پانی سے بھری بالٹی لی اور اسے چولہے پر رکھا۔ جب پانی ابلنے لگا تو اس نے اس میں بڑی مقدار میں سرخ مرچیں ڈال دیں۔

اور اس نے انھیں کئی گھنٹوں تک کھولنے دیا جیسے کہ وہ گائے کا گوشت گلا رہا ہو۔ جب وہ تیار ہو گئیں تو اس نے ایک دھلا ہوا کپڑا لیا اور اسے ایک دوسری بالٹی پر ڈال دیا۔ محلول بالٹی میں چلا گیا اور سرخ مرچوں کے ٹکڑے باہر کپڑے پر ہی رہ گئے۔ اس نے پانی سے بوتل بھری۔

پھر اس نے Yasoul کا ٹکڑا لیا اور وہ چکنی مٹی لی جس سے کہ عورتیں اپنے بال دھوتی ہیں۔ پھر وہ پاشا کے پاس آیا۔

''یا سیّدی!'' اس نے کہا یہ رہی دوائی۔ اصل میں دوائی نہیں یعنی تم اسے دوائی سمجھ بھی سکتے ہو اور نہیں بھی۔ یہ تمھیں صحت یاب کر بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی۔ پاشا نے صفی کی طرف دیکھا۔ تو پھر اس ساری خرافات کا مقصد کیا ہے؟''

تم نے بتایا ہے کہ تم سوتے ہو اور نہیں بھی سوتے۔ تم کھاتے ہو پر نہیں کھاتے اور بیٹھتے ہو لیکن نہیں بیٹھتے۔ میں تمھیں ان سب کی دوائی دے رہا ہوں۔ اس پہلی چیز کا آدھا گلاس ہر صبح کو پیو اور اسے پیتے ہوئے ساتھ ہی اس Yasoul کا ایک ٹکڑا بھی کھاؤ۔ اور رات کو سونے سے پہلے بھی اس عمل کو دہراؤ۔

''ٹھیک۔''

جب شام ہوئی تو پاشا نے فیصلہ کیا کہ اس علاج کو شروع کر دینا چاہیے۔ پہلے مجھے ٹھوس چیز منہ میں ڈالنی چاہیے پھر مائع کے ساتھ اسے حلق سے نیچے اتار لینا چاہیے۔'' اس نے سوچا۔

پس اس نے وہ چکنی مٹی منہ میں ڈالی اور مرچوں والا پانی کا گلاس پیا۔ جب یہ اس کے معدے میں گیا تو اس نے محسوس کیا جیسے اس کے اندر آگ سی لگ گئی ہو۔ اس کا گلا اور دل جل رہے تھے۔ حالاں کہ وہ کئی مہینوں سے اپنے بستر سے ہل بھی نہیں سکا تھا لیکن اس وقت وہ بغیر کسی کی مدد کے اٹھ بیٹھا اور تیزی سے آگے پیچھے چلنے پھرنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ منہ کھول کر سانس لینے لگا۔ جلد ہی وہ باہر گیا اور اس نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا اور اچانک اسے لگا کہ وہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بلایا۔ یہ ایک اچھی رات ہے۔ باہر آ کر ہوا کی مہک کو محسوس کرو۔

وہ سب باہر آئے انھوں نے اپنے سر اٹھا کر ہوا کو سونگھا اور انھوں نے اسے بتایا کہ یہ واقعی ایک خوب صورت رات تھی۔ جب وہ اندر چلے گئے تو پاشا ایک کونے میں تین گھنٹوں تک بیٹھا، اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ سو گیا۔

صبح جب پاشا جاگا تو اس نے فیصلہ کیا کہ چوں کہ وہ خود کو بھلا چنگا محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے وہ اور دوائی نہیں لے گا۔ وہ صفی سے بات کرنے گیا۔ میں صحت یاب ہو گیا ہوں۔ الحمدللہ۔ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ میں اپنے آپ کو بیس سال کا نوجوان شخص محسوس کر رہا ہوں۔ میں تمھاری کیا خدمت کروں؟

''یہ فیصلہ تم خود کرو۔'' صفی نے کہا: ''تم جانتے ہو کہ تمھارے نزدیک تمھاری صحت کی کیا قدر و قیمت ہے۔''

پاشا نے سونے کے سکوں سے بھری ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور صفی کو دے دی۔ اور پھر وہ اور اس کے دوست وہاں سے چلے گئے۔

صفی اپنے کلینک سے مطمئن نہیں تھا کیوں کہ وہ زخموں کی بحالی اور راس کو بینے جیسے گھمبیر کیسوں کے حوالے سے ابھی تک کوئی زبردست دوائی دریافت نہیں کر پایا تھا۔ اس نے اس پر روزانہ غور و فکر کیا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور چیزوں کو آپس میں ملاتا رہا پھر ان نسخوں کو خود پر آزماتا رہا۔

ایک دن اس نے چند پتے لیے اور انھیں آگ پر سکھایا۔ پھر اس نے ان کا سفوف بنایا اور پھر کھرل میں بھنگ کے بیجوں کو کوٹا۔ اس نے ان دونوں اشیا کو کوکین کے سفوف میں مکس کیا۔ اس میں سے کچھ میں اس نے ارگن (Argan) کا تیل ملایا اور زیادہ تر میں شہد ملایا۔ جو سفوف بچ گیا وہ اس نے ایک ڈبے میں محفوظ کر لیا۔

دیکھتے ہیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے اس (دوا) کو چمچ بھر کھایا اور اوپر سے گلاس بھر چائے پی۔ پھر وہ پیچھے کی طرف جھک گیا۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس سہ پہر کو تین مختلف لوگوں نے اس کے دروازہ کھٹکھٹایا لیکن وہ سوتا رہا۔ رات کو ایک شخص اپنے بیٹے کو لے کر آیا تا کہ وہ اس کے دانت کا معائنہ کر سکے لیکن وہ تب بھی نہ جاگا۔

اگلی صبح صفی نے گدھوں کو ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے اور مرغیوں کو کُڑ کُڑ کرتے ہوئے سنا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے باہر جھانکا۔ انھیں کیا مسئلہ پیش آیا ہے؟ اس نے سوچا۔ جب وہ ابھی دروازے

میں ہی کھڑا تھا تو چند لوگ اندر آ گئے۔صفی نے ان سے کہا۔''سہ پہر بخیر۔''

''ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔''انھوں نے کہا۔''ابھی تو صبح کا ہی وقت ہے۔''

''کیا یہ سوموار کا دن نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں وہ تو کل کا دن تھا۔''انھوں نے کہا۔

صفی اندر گیا۔''آہا''اس نے سوچا''میں نے وہ پا لیا،جس کی مجھے تلاش تھی۔''

اس شام کو اس کی ہمسائی عورت نے اس کے لیے طرخون پتوں کے ساتھ پکے ہوئے گھونگھوں اور پالک سے بھری ہوئی ایک بڑی کیتلی بھیجی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسی ڈشیں بہت پسند کرتا تھا۔جو کچھ اس نے بھیجا تھا،وہ اسے پا کر بہت خوش ہوا تھا،تبھی وہ بہت اچھے موڈ میں اسے کھانے بیٹھ گیا۔

لیکن ابھی اس نے چند لقمے ہی لیے تھے کہ کسی نے اس کے دروازے کو بہت زور و شور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

''ٹھہرو''وہ چلایا:''دروازہ مت توڑو۔''پھر وہ اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔یہ دو آدمی تھے،جنھوں نے ایک عورت کو اٹھا رکھا تھا۔

وہ اسے جلدی سے کلینک میں لے آئے۔

''اسے کیا ہوا ہے؟''صفی نے پوچھا:''اس بے چاری کو ادھر بینچ پر ڈال دو۔''

''اس کا سر چکرا رہا ہے اور اسے بخار بھی ہے۔''انھوں نے کہا:''اور اس کی اُلٹی کا رنگ گہرا زرد ہے۔''

صفی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور محسوس کیا کہ عورت خاصی بیمار ہے۔اس کی آنکھیں اور چہرہ انڈے کی زردی کی طرح پیلے تھے۔وہ ڈر رہا تھا کیوں کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کرے لیکن اس نے کہا''عورت کو یرقان کی بیماری ہے۔ہمیں اس تمام پیلے پن سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گا۔اس نے کچھ کھایا پیا ہے؟''

''نہیں۔تین دن سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا؟''

''اسے گھونگھوں کے شوربے کی ضرورت ہے۔''صفی نے کہا۔

وہ اپنے کمرے میں گیا اور گھونگھوں والا وہ سالن لے کر آیا جو وہ کھا رہا تھا۔جب وہ اسے لے

کر آیا تو اس نے اس میں نیا تیار کردہ چار چمچ سفوف ڈالا اور اسے اس شوربے میں مکس کیا۔عورت وہ سارا شوربہ پی گئی، پھر صفی نے اسے کوکین والی چائے کا گلاس دیا۔صرف دس منٹ بعد وہ اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔وہ بالکل ہشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی۔

دونوں آدمی بولے:''کیا کمال کی دوائی ہے یہ۔ہم یہ پورا پیالہ خریدنا چاہیں گے۔اگر آپ بیچنا پسند کریں تو۔۔۔۔''

صفی نے عورت کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو پھر ڈر گیا لیکن ساٹھ ریال کے عوض وہ اس سفوف والا پیالہ،ان لوگوں کے ہاتھ بیچنے پر رضامند ہو گیا۔انھوں نے رقم ادا کی اور عورت کو ساتھ لے کر وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا۔اس نے سونے کے سکوں سے بھری ہوئی اس تھیلی کے متعلق سوچا جو کہ اسے بُردکا پاشا نے دی تھی اور اس کے علاوہ، جو روپیہ اس نے بچایا تھا،اس کے متعلق بھی اس نے سوچا۔پھر وہ اچانک اٹھا اور وہ اس ہمسائے کے گھر کی طرف چل دیا، جو اس کے قریب ہی رہتا تھا۔اس نے اس شخص کے ہاتھ اپنی گائیں اور گدھے کو بیچ دیا اور گھر چلا آیا۔تب اس نے اپنے کپڑے اور دوائیاں اکٹھی کیں اور اس نے اپنا سارا اسباب گھوڑے پر لاد لیا۔اس نے سڑک کی جانب دیکھا اور اپنے آپ سے کہا۔

''یہ ہی صحیح راستہ ہے۔''تب وہ گھوڑے کی زین پر بیٹھا اور اپنے کلینک کو پیچھے چھوڑتا ہوا سڑک پر چل پڑا۔

تقریباً آدھی رات کے وقت دو آدمی کلینک کے دروازے پر آئے۔انھوں نے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ایک کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں کلھاڑا اور وہ ڈاکٹر صفی، ڈاکٹر صفی چلا رہے تھے۔جب انھوں نے دروازہ توڑ دیا تو اندر آ کر انھوں نے اسے تلاش کیا وہ انھیں نہیں ملا۔اس وقت تک گاؤں کا ہر شخص کلینک کے باہر موجود تھا۔شیخ دوڑتا ہوا آیا۔

جس آدمی کے ہاتھ میں کلھاڑا تھا، چلایا۔ڈاکٹر صفی نے مجھے دوائی دی تھی، جب میں نے یہ دوائی اپنی بیوی کو دی تو وہ پاگل ہو اٹھی۔وہ چیختی چلاتی ہوئی دوڑتی رہی اور ہم اسے نہ پکڑ سکے۔جب وہ گری تو خون اس کے منہ جاری ہو گیا اور پھر وہ مر گئی۔ہم ڈاکٹر صفی کو تلاش کر رہے ہیں۔۔۔۔وہ کہاں ہے؟

شیخ نے بولنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے سوچا۔پھر اس نے کہا تمھاری بیوی مر چکی ہے۔ اسے قبرستان لے جاؤ اور دفن کر دو۔اس طرح تم ایک نوجوان عورت سے شادی کر سکتے ہو اور ڈاکٹر صفی کا یہ کلینک تمھارے رہنے کے لیے موجود ہے۔تم اس پر قبضہ کر سکتے ہو۔جس گھر میں تم اس وقت رہ رہے ہو، اسے تم بیچ سکتے ہو یا اسے کرایے پر اٹھا سکتے ہو۔

اس شخص نے شیخ کی طرف دیکھا۔شکریہ۔اس نے کہا:''میں ایسا ہی کروں گا۔تم ایک بہت ہی بھلے آدمی ہو۔''

سب لوگ سونے کے لیے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔صفی ابھی تک رات کی تاریکی میں سڑک پر رواں دواں تھا۔وہ خوش تھا اور وہ پوری طرح کوکین کے نشے میں چور تھا۔

☆☆☆☆

نجیب محفوظ

پیلس واک

وہ آدھی رات کے وقت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہمیشہ کسی گھڑی کے الارم پر انحصار کیے بغیر ہی اٹھ بیٹھتی تھی۔ ایک ایسی خواہش نے، جس نے اس کے اندر جڑ پکڑ لی تھی، بالکل صحیح وقت پر، اسے جگا دیا تھا۔ چند لمحوں تک اسے یقین نہ آیا کہ وہ جاگ چکی ہے۔ خواب اور تخیل کا ملا جلا تاثر، اس کے ذہن میں موجود تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے، وہ کسی قدر پریشان سی تھی، اس ڈر سے کہ شاید نیند نے اسے دھوکا دیا ہے۔ آہستہ سے سر کو ہلاتے ہوئے، اس نے کمرے میں موجود مکمل تاریکی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ کوئی پتہ نہیں کہ اس وقت کیا بجا تھا۔ اس کے کمرے سے باہر گلی کا شور صبح ہونے تک جاری رہتا تھا۔ چاہے یہ شام ہو، آدھی رات ہو یا صبح ہونے سے پہلے کا وقت ہو وہ کافی ہاؤسوں اور شراب کی دکانوں سے اٹھتی آوازوں کی بک بک سن سکتی تھی۔ وقت کے تعین کے لیے اس کے پاس ایک حساس گھڑی جیسا اندرونی احساس اور گھر کو سے چاروں طرف گھیرنے والی خاموشی ہی تھی؛ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے شوہر نے ابھی تک دروازے پر دستک نہیں دی اور یہ کہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ابھی تک اس کی چھڑی کے ٹکرانے کی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

ٹھیک اس وقت، اسے جاگ پڑنے کی عادت ہوگئی تھی۔ یہ ایک پرانی عادت تھی، جسے اس نے، اپنی جوانی کے زمانے سے اپنا لیا تھا اور اب جب کہ وہ پختہ عمر کی ہو چکی تھی؛ پھر بھی یہ عادت برقرار تھی۔ ایسا کرنا اس نے شادی شدہ زندگی کے دوسرے لوازمات کے ساتھ ساتھ ہی سیکھا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی شام کی تفریحات سے واپس گھر لوٹنے کا انتظار کرنے کے لیے آدھی رات کو جاگ پڑتی تھی۔ پھر وہ اس کے سو جانے تک اس کی خاطر مدارت میں لگی رہتی۔ وہ نیند کے غلبے پر قابو پانے کے لیے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ وہ بسم اللہ پڑھ کر بستر سے باہر آئی اور فرش پر کھڑی ہوگئی۔ اس نے پہلے اپنی چارپائی اور پھر ایک کھڑکی کی چوکھٹ کے سہارے دروازے کا راستہ تلاش کیا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو بیٹھک میں پڑی، ایک شیلف پر رکھے لیمپ کی مدھم روشنی کمرے میں در آئی۔ وہ اسے

اٹھانے کے لیے آگے بڑھی اوراندھیرے میں اس کے شیشے سے منعکس ہوکر، اس کی پہلی روشنی کا دائرہ سا چھت پر لہرانے لگا۔اس نے صوفے کے ساتھ پڑی میز پر لیمپ رکھ دیا۔روشنی ہر طرف پھیل گئی، جس سے اس بڑے چوکور کمرے کی اونچی دیواریں' چھت اوراس کے متوازی شہتیر وغیرہ سب کچھ واضح طور پر نظر آنے لگا۔سجاوٹ کا معیار بالکل عیاں تھا۔شیرازی قالین'بہت بڑا پیتل کا بنا بیڈ'ایک بڑی الماری'مختلف رنگوں اوراشکال کے ڈیزائین سے مزین کپڑے سے ڈھکا ہوا ایک لمبا صوفہ۔

عورت اپنے سراپے پر ایک نظر ڈالنے کے لیے آئینے کی طرف بڑھی۔اس نے محسوس کیا کہ اس کا براؤن سکارف شکنوں سے پر ہے اور کسی قدر پیچھے کی طرف کھسک گیا ہے۔اس کے بھورے بال بکھر کر اس کے ماتھے پر پھیل گئے تھے۔اس نے اپنی انگلیوں سے سکارف کی گرہ کو ٹٹولا اوراسے کھول دیا۔اس نے سکارف کو اپنے بالوں کے گرد صحیح طور پر جمایا اورآہستگی اوراحتیاط کے ساتھ، اس کے دونوں سروں کو دوبارہ باندھا۔اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کے اطراف کو یوں صاف کیا جیسے وہ نیند کی باقیات کو وہاں سے مٹانے کی کوشش کررہی ہو۔وہ چالیس سال کی ایک درمیانی جسامت کی عورت تھی مگر تیلی دبلی لگتی تھی حالاں کہ اس کے بدن کی نرم جلد بے ڈھب نہ تھی بل کہ ایک نہایت ہی خوب صورت توازن کی حامل تھی۔اس کا ماتھا اونچا تھا اور قدرے لمبوترا چہرہ بے حد خوب صورت تھا۔اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بہت حسین تھیں، جو ہر وقت بیدار سی لگتی تھیں۔اس کی ناک بہت پتلی سی اور چھوٹی سی تھی، جو نتھنوں پر آکر قدرے پھیل گئی تھی۔اس کے نازک ہونٹوں کے نیچے اس کی ٹھوڑی ذرا نوکیلی تھی۔اس کے گورے چٹے گال پر ایک خوب صورت کالا سیاہ تل تھا۔اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹتے ہوئے بالکونی تک جانے کے لیے، جب وہ دروازے کی طرف بڑھی تو کسی قدر جلدی میں لگتی تھی۔اس نے دروازہ کھولا اور لکڑی سے بنی جعفری سے چاروں طرف سے بند جگہ پر پہنچ کر کھڑی ہوگئی اوراپنے چہرے کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے وہ جعفری کے ان چھوٹے چھوٹے گول سوراخوں سے لگ کر باہر جھانکنے لگی۔جن کی وجہ سے اس کا سراپا، باہر گلی میں سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔بالکونی پر سے قدیم رہائشی مکانوں پر بنے، پانی کے حوضوں کے نیچے اترتی سیڑھیاں اورایک اسکول کی اوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں دکھائی دیتی تھی۔یہ علاقہ پیلس واک یا بین القصرین کے درمیان واقع تھا۔دوسڑکیں یہاں آکر آپس میں مل جاتی تھیں۔ال نہاسین یا کاپرسمتھ سٹریٹ جو جنوب کی طرف جاتی تھی اور دوسری پیلس واک، جو شمال کی طرف جاتی تھی۔اس کے بائیں طرف گلی تنگ ہوتی اور موڑ مڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔یہ گلی

اداسی میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور وہاں سے ماحول اور بھی زیادہ غم زدہ ہو جاتا تھا، جہاں سے نیند میں ڈوبے گھروں کی کھڑکیاں نیچی دکھائی دیتی تھیں، جو صبح کے وقت تک کھلی رہنے والی دکانوں اور کافی ہاؤسوں کے دھندلے لیمپوں اور چھکڑوں سے برآمد ہونے والی مدھم روشنی میں، گلی کی سطح سے زیادہ واضح نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس کے دائیں طرف گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس طرف کوئی کافی ہاؤس نہیں تھا صرف بڑے بڑے سٹور تھے، جو بہت جلدی بند ہو جاتے تھے۔ وہاں اس طرف دلچسپی کی کوئی خاص چیز نہ تھی سوائے کالاؤن اور برقوق کی درسگاہوں کے، ان میناروں کے، جو روشن ستاروں کی روشنی میں رات کو مٹرگشت پر نکلے ہوئے بڑے بڑے دیووں کی طرح منڈلاتے ہوئے لگ رہے تھے۔

یہ وہ سارا منظر جو پچھلے پچیس سالوں سے اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ اس سے قطعاً بےزار نہیں ہوئی تھی۔ جس یکسانیت کے مارے ماحول میں وہ رہ رہی تھی، اس کے لیے شاید بےزاری یا بددلی کا تاثر کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ اردگرد کا ماحول ہی اس کی تنہائی کا ساتھی تھا اور ایک لمبے عرصے سے اس کے اکیلے پن کا واحد دوست تھا، جب وہ اپنے بچوں کی پیدائش سے پہلے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے محروم کر دی گئی تھی۔ جب وہ ایک گہرے کنوئیں' گرد آلود صحن اور بڑے بڑے کمروں کی اونچی چھتوں والے، اس دو منزلہ بہت بڑے مکان کی واحد مکین کی صورت میں اپنے دن رات گذارا کرتی تھی۔

ابھی وہ چودہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی تھی اور پھر جلد ہی اپنے شوہر کے والدین کی وفات کے بعد، اس نے اپنے آپ کو اس بڑے گھر کی مالکن کے طور پر پایا۔ ایک بوڑھی عورت اس گھر کی دیکھ بھال کے لیے اس کی مدد کرتی تھی' لیکن سرِشام ہی 'صحن میں بنے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی جاتی تھی اور یوں وہ بد روحوں اور بلاؤں سے بھری، سیاہ راتوں میں اکیلی رہ جاتی تھی۔ وہ ایک گھنٹے تک اونگھتی رہتی اور دوسرے گھنٹے میں جاگتی رہتی' یہ جاگنے اور سونے کا عمل جاری رہتا، حتیٰ کہ اس کا مشکوک شوہر، اپنی رات کی لمبی سیر و تفریح کے بعد واپس پہنچ جاتا۔ اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے، اس نے اپنی ملازمہ کے ساتھ' جس نے ہاتھ میں لیمپ پکڑا ہوتا تھا، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومنے پھرنے کی عادت اپنائی تھی۔ وہ ان کمروں میں گھومتے ہوئے ڈری' سہمی ہوئی نظروں سے کچھ تلاش کرتی رہتی تھی۔ وہ پہلی منزل سے شروع کرتی اور اوپر والی منزل تک جاتی' اس دوران میں، وہ بد روحوں کو بھگانے کے لیے قرآن کی سورتیں پڑھتی رہتی۔ وہ اس کام کو اپنے کمرے پر پہنچ کر ختم کرتی، اپنے کمرے کے دروازے کو تالا لگاتی اور پھر بستر پر چلی جاتی مگر گہری نیند میں جانے

سے پہلے تک، وہ قرآنی آیات کی تلاوت جاری رکھتی۔

پہلے پہل وہ اس گھر میں رہتے ہوئے، رات سے بہت خوف زدہ رہتی تھی۔ وہ انسانوں سے زیادہ جنات کی دنیا سے بہتر طور پر واقف تھی اور اس کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس بڑے مکان میں اکیلی نہیں رہتی۔ ایک عرصے سے بالکل خالی رہنے والے، اس مکان کے بڑے بڑے کمروں سے جنات بھلا کیسے دور رہ سکتے تھے۔ شاید انھوں نے، اس کے اس گھر میں آنے سے پہلے، حتیٰ کہ اس کے دن کی روشنی دیکھنے سے پہلے ہی، یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہ اکثر اوقات، ان کی سرگوشیاں سنتی تھی۔ کئی بار وہ سوتے ہوئے، ان کے گرم سانسوں کے احساس سے جاگ پڑتی تھی۔ جب وہ بالکل اکیلی رہ جاتی، تو وہ قرآنی آیات کی تلاوت ہی میں اپنے آپ کو محفوظ پاتی، زیادہ تر اس کی ایک سو بارہویں سورۃ کی تلاوت میں، جس میں خدا کی مطلق حاکمیت کو بیان کیا گیا ہے، یا پھر وہ جعفری کے چھوٹے سوراخوں سے لگی بڑی بے چینی سے کافی ہاؤسوں اور چھکڑوں کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے، نہایت احتیاط سے، کسی کی کھانسی یا ہنسی کی آواز کو سننے کی کوشش کرتی تاکہ اس طرح، وہ اپنے حواس بحال کر سکے۔

پھر ایک کے بعد ایک بچے پیدا ہوتے گئے۔ اپنے ابتدائی دنوں میں، جب بچے ابھی نوخیز ہی تھے، وہ اس کے خوف کو دور کرنے یا اس کی ڈھارس بندھانے میں معاون ثابت نہ ہوئے۔ اس کے برعکس ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کے احساس اور اس ڈر فکر سے کہ کہیں ان کو نقصان نہ پہنچ جائے، اس کا خوف کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ وہ منتروں، ٹونے ٹوٹکوں، تعویذ اور قرآنی سورتوں کی حفاظت میں، سوتے جاگتے ان کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے، ان کے اردگرد رہتے ہوئے، ان پر اپنی محبت نچھاور کرتے ہوئے، وقت گذارتی تھی۔ جب تک کہ اس کا شوہر، اپنی شام کی تفریحات سے واپس نہ آجاتا، اس وقت تک اسے مکمل ذہنی سکون حاصل نہ ہوتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ اپنے کسی شیر خوار بچے کو سلانے کے لیے جھولا جھلا رہی ہوتی، تو اچانک وہ اسے اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے، اپنے سینے سے لگا لیتی۔ وہ نہایت غور سے، کچھ سنتے ہوئے خوف زدگی کے عالم میں کسی خطرے کو بھانپ کر کمرے میں موجود کسی ذی روح کو مخاطب کرکے اونچی آواز میں کہتی: "ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ تمھارا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا۔ ہم مسلمان ہیں اور ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔" اور پھر وہ جلدی سے نہایت خشوع و خضوع سے قرآن کی ایک سو بارھویں سورت پڑھتی، جس میں خدا کے بے مثل ہونے کی دلیل دی گئی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ، جب اس نے

روحوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا تجربہ حاصل کرلیا تو اس کا خوف کافی حد تک کم ہوگیا ۔اب وہ بغیر ڈرے ہوئے ،نہایت خاموشی سے ،ان کے ساتھ معاملات کرنے لگی ۔اگر وہ ان میں سے ،کسی ایک کو اپنے قریب دبے پاؤں چلتا ہوا محسوس کرتی ،تو وہ تقریباً ایک مانوس لہجے میں کہتی :''کیا تمھارے پاس ان لوگوں کے لیے، کوئی عزت نہیں، جو اپنے مہربان خدا کی پرستش کرتے ہیں ۔ وہی ہماری حفاظت کرنے والا ہے'اس لیے مہربانی کر کے یہاں سے دفعان ہو جاؤ ۔'' لیکن اس کا ذہن ،اپنے شوہر کی واپسی تک کبھی بھی مطمئن نہ ہوتا ۔ بے شک سوتے ہوئے یا جاگتے ہوئے 'اس کے شوہر کی گھر میں موجودگی ہی ،اس کے تحفظ کے احساس کے لیے کافی تھی ۔اس وقت اس بات کی کوئی وقعت نہ ہوتی کہ آیا دروازے کھلے ہیں یا بند ہیں' لیمپ جل رہا ہے یا کہ بجھا ہوا ہے ۔

اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے' پہلے سال کے دوران میں ،متواتر راتوں کو باہر رہنے پر جب اس نے نرم لہجے میں کمزور سا احتجاج کیا تو اس کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا ۔اس کے جواب نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا'اس نے نہایت تحکمانہ لہجے میں اونچی آواز سے کہا تھا :''میں ایک مرد ہوں ۔میرا کام حکم دینا اور ممانعت کرنا ہے ۔ میں اپنے کسی رویے پر تنقید کو قبول نہیں کروں گا ۔جو میں تم سے چاہتا ہوں ،وہ یہ ہے کہ تم میرا حکم مانو ۔مجھے سختی برتنے پر مجبور نہ کرو ۔''

اس واقعہ سے اس نے سبق لیا اور دوسرے سبق، جو اس نے حاصل کیے وہ یہ تھے کہ وہ ماحول سے مطابقت حاصل کرلے' حتیٰ کہ اس کی غضب ناک آنکھ کی چمک سے بچنے کے لیے ،اسے جنوں کے ساتھ بھی زندگی بسر کرنا پڑے گی ۔بغیر کسی شرط یا استحقاق کے ،اپنے شوہر کا حکم ماننا اس کا فرض تھا ۔وہ اس حد تک مغلوب ہو چکی تھی کہ تنہائی میں بھی ،وہ یوں راتوں کو اس کے باہر رہنے پر کوئی الزام نہ دھر پاتی ۔اس نے اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ صحیح مردانہ پن 'جبر اور آدھی رات کے بعد بھی ،گھر سے باہر رہنا دراصل کسی ایک شخص کی عام خصوصیات تھیں ۔وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ' چاہے وہ خوش تھی یا ناخوش اس نے اپنی سزا کو بہ رضا اور غبت قبول کرلیا تھا ۔کچھ ہی کیوں نہ ہو جاتا' وہ ہمیشہ ایک محبت کرنے والی' تابع دار اور مطیع بیوی کی طرح رہتی ۔شکست پر مبنی تحفظ کے اس انداز سے سمجھوتہ کرنے پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا ۔

جب بھی اس نے اپنی پچھلی زندگی کو یاد کرنے کی کوشش کی ،تو ہمیشہ اچھائی اور خوشی کا تاثر ہی اس کے ذہن میں آیا ۔خوف اور غم اس کے نزدیک بے معنی ہو چکے تھے ۔ایک رحم بھری مسکراہٹ سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی ۔اگر وہ اپنے اس شوہر کے ساتھ نہ رہ رہی ہوتی 'اور اس نے پچیس سال پر محیط

محرومیاں نہ سہی ہوتیں' تو وہ ان بچوں کی ماں نہ بن پاتی، جو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے اور زندگی کے تمام تر لوازمات اور آسائشات سے پُر، یہ گھر بھی اسے نہ ملتا اور یہ خوش کن با شعور زندگی بھی اس کا مقدر نہ بن پاتی؟ یقیناً اس کے پاس یہ سب کچھ تھا۔ ایک جن کے ساتھ، زندگی بسر کرنا قابلِ برداشت بات تھی اور اسی طرح ہر شام بھی قابلِ برداشت تھی۔ جنوں میں سے کسی نے بھی، اسے یا اس کے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ انھوں نے اسے تنگ کرنے کے لیے چند بے ضرر سی شرارتیں ہی کی تھیں۔ ''خدا کی تعریف بیان کرنی چاہیے کہ تمام اچھائیاں اسی سے منسوب ہیں۔''

اگر چہ اس طرح اس کی خوش گوار نیند خراب ہوتی تھی اور وہ گھریلو کام کاج' جسے دن کے وقت ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا' اس وقت تک، اسے کرنا پڑتا تھا مگر پھر بھی اس طرح اس کے آنے کا انتظار کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انتظار اس کی بہت سی یادوں سے وابستہ زندگی کا ایک لازمی عنصر بن چکا تھا' بل کہ وہ ہر آنے والی رات کو، اپنے اس انتظار کے حوالے سے اپنے مرد کے ساتھ، اپنی بے پناہ محبت' دلی اپنائیت اور اسے خوش رکھنے کی ایک زندہ علامت کے طور پر اپنی تابع فرمانی کا اظہار کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بالکونی میں کھڑی، وہاں سے پیلس واک اور النحرونفش کے بازاروں اور یا پھر حمام السلطان یا بہت سے میناروں کا نظارہ کرتی تو اس کی ذات صبر وشکر وقناعت کا ایک بہترین نمونہ بنی ہوتی۔

وہ سڑک کے دورویہ بنے بے ڈھنگے پن سے آپس میں پیوست مکانوں پر نگاہیں ڈالتی، جو سکون کی حالت میں کھڑے، ان سپاہیوں کی قطار کی طرح لگتے تھے' جیسے وہ سخت قسم کے نظم وضبط سے آزاد ہو کر آرام کر رہے ہوں۔ وہ سڑک کے اس پسندیدہ نظارے سے محظوظ ہوتی ہوئی مسکراتی، جو صبح ہونے تک جاگتا رہتا تھا' جبکہ دوسرے بازار اور گلیاں اس وقت نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ منظر نیند کی طرف سے، اس کی توجہ ہٹا دیتا اور اس کے خوف کو دور کیے ہوئے، اس کی تنہائی کا ساتھی بنا رہتا۔

رات اردگرد کے ماحول کو ایک ایسی گہری خاموشی کے سپرد کر دیتی، جس میں گلی میں سے برآمد ہونے والی، ہر آواز یوں واضح ہو جاتی، جیسے کسی پینٹنگ کے کناروں پر موجود Shades اس کے کام کو گہرائی اور وضاحت بخشتے ہیں۔ کسی قہقہے کی آواز، یوں گونجتی جیسے کوئی اس کے کمرے میں قہقہے لگا رہا ہو' اور ایک دھیمے لہجے میں، کی گئی بات بھی بالکل واضح طور پر سنائی دیتی تھی۔ وہ کسی شخص کی کھانسی کی کھرکھراہٹ کو، آخر میں ایک کراہ میں تبدیل ہوتے ہوئے بھی سن سکتی تھی۔ یہاں سے کسی ریسٹورنٹ کے ویٹر کی آواز ایک موذن کی پکار کی طرح لگتی تھی۔ ''پائپ کے لیے تھوڑا اور تمباکو لاؤ بھئی۔'' اور یہ سن کر وہ اپنے آپ

سے کہتی: ''خدا کی پناہ۔ یہ لوگ رات کے اس پہر کو مزید تمبا کو بھرنے کا آرڈر دے رہے ہیں؟''
وہ اسے اپنے غیر حاضر شوہر کی یاد دلاتے تھے۔ وہ فکر مند ہو کر سوچتی: ''بھلا اس وقت وہ کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ بہر حال، جہاں کہیں بھی وہ ہے اور جو کچھ کر رہا ہے، اسے صحیح سلامت ہونا چاہیے۔''
ایک بار، اسے باور کرایا گیا تھا کہ مسٹر احمد عبدالجاوید جیسے دولت مند' مضبوط اور خوب صورت مرد جو اپنی راتیں باہر گذارنے کے عادی ہوں' کسی دوسری عورت کی زلف کے اسیر ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کی زندگی حسد کے زہر سے آلودہ ہو گئی تھی اور وہ ایک گہرے غم میں گھر گئی تھی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اس سے، اس کے بارے میں کچھ پوچھ سکے' لیکن اس نے اپنے اس دکھ کا اظہار، جب اپنی ماں سے کیا، تو اس نے نرم لہجے میں بھر پور طریقے سے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا: ''اس نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد تم سے شادی کی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اسے بھی اپنی بیوی کے طور پر رکھ سکتا تھا۔ یا دو تین چار بیویاں بھی رکھ سکتا تھا۔ اس کے باپ کی کئی بیویاں تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اس کی واحد بیوی ہو۔''
اگر چہ اس کی ماں کے ان الفاظ نے، اس کی کوئی خاص ڈھارس نہ بندھائی، تاہم آخر کار اس نے ان کی صداقت' اور معقولیت کو تسلیم کر لیا۔ اگر اس افواہ میں کوئی صداقت بھی تھی، تو شاید راتوں کو دیر سے آنے اور جبر کرنے کی طرح یہ بھی مردانہ پن کی ایک اور خصوصیت تھی۔ بہر طور بہت سی برائیوں کے مقابلے میں صرف ایک برائی تو پھر بھی اچھی تھی۔ محض ایک شک کی بنیاد پر، اپنی یہ خوشیوں اور راحت بھری دنیا تباہ کرنا ایک غلطی ہی ہوتی۔ مزید یہ کہ ہر چیز کے باوجود شاید یہ افواہ محض ایک تصور یا ایک جھوٹ ہی تھی۔ اس نے جانا کہ حسد اس کی زندگی میں پہلے سے موجود دکھوں اور تکلیفوں سے کچھ زیادہ مختلف چیز نہیں تھا۔ ان دکھوں' اور تکلیفوں کی حقیقت کو تسلیم کرنا ایک اٹل اور حتمی بات تھی۔ ناقابل قبول حالات کے خلاف جدو جہد کا ایک بڑا ذریعہ، اس نے اپنی روحانی طاقت اور صبر سے کام لینے کو قرار دیا۔ حسد اور اس کے محرک کو، اس نے اپنے شوہر کی دوسری دکھ دینے والی خصوصیات یا جن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے مترادف پایا۔
وہ بدستور سڑک کی طرف دیکھتی رہی اور لوگوں کی گپ شپ سنتی رہی' حتیٰ کہ اس نے گھوڑے کے سموں کی آواز سنی۔ اس نے اپنا سر النحاسین سٹریٹ کی طرف گھمایا اور اندھیرے میں روشن لیمپوں کے ساتھ ایک بگھی کو آہستہ آہستہ قریب آتے دیکھا۔ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بڑبڑائی: ''آخر کار۔۔۔۔'' یہ اس کے شوہر کے ایک دوست کی بگھی تھی اور وہ کئی اور دوستوں کے ساتھ جو یہاں

انغر ونفش ہی میں رہتے تھے، شام کی اس معمول کی سیر وتفریح کے بعد، اس بگھی کے مالک کی وساطت سے اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ بگھی گھر کے بالکل سامنے آکر رک گئی، اس کے شوہر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی: ''فی امان اللہ۔''

جب اس کے شوہر نے اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہا تو اس کی آواز کو، اس نے ایک تحیر آمیز محبت کے ساتھ سنا۔ اگر اس نے، اس کی آواز کو یوں ہر رات نہ سنا ہوتا تو اسے اس کا کبھی یقین نہ آتا۔ وہ اور اس کے بچے اس کی سنجیدگی، وقار اور ہوشمندی ہی کے عادی تھے۔ اس وقت نہ جانے کس طرح وہ ایک کھلنڈرے اور چنچل اطوار کے حامل شخص میں ڈھل گیا تھا؟ بگھی کے مالک نے اس کے شوہر کو یہ کہتے ہوئے چھیڑا: ''جب تم بگھی سے اتر رہے تھے تو کیا تم نے سنا کہ گھوڑا اپنے آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کتنی قابلِ رحم بات ہے کہ میں جس شخص کو ہر رات گھر واپس لاتا ہوں، وہ ایک گدھے پر سواری کرنے کے لائق ہے۔''

بگھی میں موجود تمام لوگوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ اس کے شوہر نے ان کے خاموش ہونے کا انتظار کیا اور پھر جواب دیا: ''کیا تم نے جواب نہیں سنا۔۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ اس صورت میں مَیں ''تم'' پر سوار ہونا پسند کروں گا۔''

سب لوگ ایک بار پھر ہنس پڑے۔ بگھی کے مالک نے کہا: ''باقی لطیفے ہم کل رات کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔''

بگھی پیلس واک کی طرف بڑھ گئی اور اس کا شوہر اپنے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بیڈ روم میں جانے کے لیے بالکنی چھوڑ دی۔ لیمپ اٹھا کر وہ بیٹھک میں آ گئی اور پھر ہال میں آ کر سیڑھیوں کے اوپری سرے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ باہر کے دروازے کے کھلنے بند ہونے اور چٹخنی لگانے کی آواز سن سکتی تھی۔ پھر اس نے تصور میں اس لمبے قد کے آدمی کو صحن عبور کرتے دیکھا، جس نے اپنی سنجیدگی اور متانت کو تکلیف دہ ہنسی مذاق میں ڈبو دیا تھا' اگر اس نے اوپر سے سب کچھ سن نہ لیا ہوتا تو وہ کبھی ایسی بات پر یقین نہ کر پاتی۔ سیڑھیوں پر اس کی چھڑی کی نوک کی آواز کو سنتے ہوئے، اس نے اسے راستہ دکھانے کی خاطر جنگلے کے اوپر سے لیمپ کو اونچا کر کے اٹھا لیا۔۔۔۔!!

☆☆☆☆

نجیب محفوظ

ہاتھ کی صفائی

''وقت آ گیا ہے کہ تم کار آمد آدمی بنو۔''ماں نے مجھ سے کہا اور ساتھ ہی اپنی جیب میں ہاتھ سرکاتے ہوئے کہنے لگی:''۔۔۔۔یہ لو اور جا کر تھوڑا سا لوبیا لے آؤ۔دیکھو راستے میں کھیل کود میں مت لگ جانا اور ٹریفک سے بھی بچنا۔''

میں نے تھالی لی۔کھڑاویں پہنیں اور ایک دھن گنگناتا ہوا چل پڑا۔لوبیا بیچنے والے کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔میں نے انتظار کیا اور تب مجھے اس سنگِ مرمر کی میز تک جانے کا راستہ ملا۔

''جناب۔۔۔۔مجھے ایک پیاستر کے برابر لوبیا چاہیے۔''میں نے چیخنے کے انداز میں کہا۔

اس نے فوراً پوچھا:''خالی لوبیا؟ تیل یا گھی کے ساتھ نہیں؟''

میں کوئی جواب نہ دے پایا تو اس نے بے رخی سے کہا:''جاؤ کسی اور کو آنے دو۔''

میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا اور شکست خوردہ گھر لوٹا۔

''ہوں۔۔۔۔خالی تھالی کے ساتھ لوٹ آئے۔شریر لڑکے تم نے کیا کیا۔۔۔۔لوبیا گرا دیا یا پیاستر گم کر بیٹھے۔''

ماں مجھ پر چلائی:

''صرف لوبیا چاہیے تھا۔یا تیل یا گھی کے ساتھ چاہیے تھا۔تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔''

میں نے احتجاج کیا۔

''احمق ہر روز صبح کے وقت تم کیا کھاتے ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''نکمے آدمی اسے کہو تیل کے ساتھ لوبیا۔''

''میں اس شخص کے پاس پہنچا اور کہا:''جناب ایک پیاستر کا لوبیا تیل کے ساتھ۔''

اس نے نہایت عجلت کے انداز میں تیوری چڑھا کر پوچھا:''السی کا تیل،اخروٹ کا تیل یا

زیتون کا تیل؟''

میں حیران رہ گیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا: ''کسی اور کے لیے جگہ چھوڑو بھئی۔'' وہ چلایا۔

میں غصے میں تپا ہوا اماں کے پاس پہنچا تو وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی: ''تم پھر خالی ہاتھ واپس آ گئے نہ لوبیا نہ تیل۔''

''السی کا تیل، اخروٹ کا تیل یا زیتون کا تیل۔۔۔۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''تیل کے ساتھ لوبیے کا مطلب ہوتا ہے السی کے تیل کے ساتھ۔''

''اب مجھے یہ کیسے معلوم ہوتا۔''

''تم نکمے ہو اور وہ ایک تکلیف دینے والا شخص ہے۔ اسے کہو کہ لوبیا، السی کے تیل کے ساتھ۔''

''اب مجھے کیا پتہ تھا۔''

میں جلدی سے واپس ہوا اور ابھی دکان سے کچھ دوری پر ہی تھا کہ میں نے اس آدمی سے کہا۔ ''جناب لوبیا السی کے تیل کے ساتھ۔''

اس نے کرچھے کو (تیل والے) برتن میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ ''پیاستر کاؤنٹر پر رکھ دو۔''

میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا مگر پیاستر وہاں نہیں تھا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں تلاش کیا۔ جیب کو باہر کی طرف الٹ دیا لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ آدمی نے بے زاری کے ساتھ خالی کرچھا پیچھے ہٹا لیا۔ تو تم نے پیاستر گم کر دیا۔ تم قابلِ اعتماد لڑکے نہیں ہو۔'' میں نے نیچے اپنے پاؤں کی طرف اور اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے نہیں کھویا۔۔۔۔ یہ سارا وقت میری جیب میں رہا ہے۔''

''مسئلہ کھڑا مت کرو اور کسی دوسرے کے لیے جگہ خالی کرو۔''

میں خالی تھالی کے ساتھ ماں کے پاس لوٹا۔

''افسوس۔۔۔۔ بے وقوف لڑکے۔ پیاستر۔۔۔۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

''وہ میری جیب میں نہیں تھا۔''

''کیا تم نے اس کی مٹھائی خرید لی؟''

''میں قسم کھاتا ہوں میں نے ایسا نہیں کیا۔''

''تم نے کیسے اسے گم کیا؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''کیا قرآن کی قسم کھا سکتے ہو کہ تم نے اس کے عوض کچھ نہیں خریدا۔''

''میں قسم کھاتا ہوں۔''

''کیا تمھاری جیب میں سوراخ ہے؟''

''نہیں۔''

''ہوسکتا ہے تم نے پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ اس شخص کو دیا ہو۔''

''ہوسکتا ہے۔''

''کیا تمھیں کسی بھی بات کا یقین نہیں۔''

''مجھے بھوک لگی ہے۔''

ماں نے راضی بہ رضا ہو کر ہاتھوں کو تالی کے انداز میں جوڑا۔''چلو کوئی بات نہیں۔''وہ بولی: ''میں تمھیں ایک اور پیاستر دوں گی لیکن یہ میں تمھاری گولک سے نکالوں گی اور اگر تم اب خالی تھالی کے ساتھ واپس آئے تو میں تمھاری گردن توڑ دوں گی۔''

میں ایک مزے دار ناشتے کا خواب دیکھتا ہوا دوڑنے کے انداز میں روانہ ہوا۔گلی کا وہ موڑ جہاں لوبیا بیچنے والا بیٹھا تھا وہاں میں نے جشن کے انداز میں خوشی کی آوازیں نکالتے بچوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ میں نے اپنے پاؤں کو گھسیٹا کیوں کہ میرا دل ان کی طرف کھنچتا تھا۔کم ازکم تھوڑی دیر کے لیے سرسری طور پر ہی مجھے ان کو دیکھ لینا چاہیے۔ میں ان میں گھس گیا اور مجھے لگا کہ ہاتھ کی صفائی دکھانے والا سیدھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ایک مدہوش کردینے والی خوشی مجھ پر چھا گئی۔ میں اپنے آپ میں بالکل نہیں رہا تھا۔ میں اپنے پورے حواس کے ساتھ خرگوشوں، انڈوں، سانپوں اور رسوں کے کرتبوں میں محو ہوگیا۔ جب وہ شخص پیسے اکٹھے کرنے کے لیے آگے آیا تو میں بڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا: ''میرے پاس تو پیسے ہی نہیں۔''وہ وحشیانہ طریقے سے میری طرف بڑھا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچایا۔ میں دوڑ پڑا۔اس کے مکے کی ضرب سے میری کمر تقریباً ٹوٹ ہی چلی تھی۔تاہم جب میں لوبیا بیچنے والے کی طرف جا رہا تھا تو بے انتہا خوش تھا۔

''ایک پیاسٹر کا لوبیا السی کے تیل کے ساتھ جناب۔'' میں نے کہا۔

وہ کوئی حرکت کیے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''مجھے تھالی دو۔'' اس نے غصے سے مطالبہ کیا۔

''تھالی۔'' تھالی کہاں تھی؟ کیا میں نے اسے دوڑتے ہوئے گرا دیا تھا؟ کہیں اس شعبدہ باز نے تو اس کے ساتھ ہاتھ کی صفائی نہیں دکھا دی تھی؟''

''لڑکے۔۔۔ تم بالکل پاگل ہو۔''

میں واپس مڑا اور اپنے راستے پر چلتے ہوئے کھوئی ہوئی تھالی کو تلاش کرنے لگا۔ جہاں شعبدہ باز موجود تھا۔ اس جگہ کو میں نے خالی پایا لیکن بچوں کی آوازیں مجھے ایک قریبی گلی میں اس تک لے گئیں۔ میں دائرے کے گرد گھوما، جب شعبدہ باز نے مجھے دیکھا تو وہ دھمکی آمیز لہجے میں چیخا۔ پیسے دو ورنہ فوراً یہاں سے چل دو۔

''وہ تھالی۔'' میں مایوسی سے بولا۔

''ننھے شیطان۔۔۔ کونسی تھالی؟''

''مجھے میری تھالی واپس کرو۔''

''یہاں سے دفعان ہو جاؤ ورنہ میں تمھیں سانپوں کی غذا بنا دوں گا۔''

اس نے تھالی چرائی تھی۔ بہر حال خوف کے مارے میں اس کی نظروں سے دور ہو گیا اور رونے لگا۔ جب بھی کوئی راہ گیر مجھے روتے ہوئے پا کر مجھ سے رونے کی وجہ پوچھتا تو میں کہتا: ''شعبدہ باز نے میری تھالی غائب کر دی ہے۔'' میں اس مصیبت میں گھرا ہوا تھا تو ایک آواز میرے کانوں میں پڑی: ''یہاں آؤ اور نظارہ کرو۔''

میں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ ایک ''سیر بین'' والے نے وہاں پر اپنا پڑ جمایا ہوا تھا۔ میں نے درجنوں بچوں کو دیکھا جو سیر بین والے ڈبے کی طرف بڑھ رہے تھے اور باری باری موکھے کے سامنے کھڑے ہو کر اندر جھانک رہے تھے اور وہ شخص ساتھ ساتھ تصاویر پر تبصرہ کرتا جا رہا تھا۔ ''آؤ۔۔۔ بہادر بانکا دیکھو اور عورتوں میں سب زیادہ خوب صورت عورت زینت البنات دیکھو۔'' اپنے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے اور شعبدہ باز اور تھالی کو مکمل طور پر بھولتے ہوئے، میں نے شوق کے ساتھ ڈبے کی طرف دیکھا۔ میں اپنی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ میں نے پیاسٹر ادا کیا اور اس لڑکی سے آگے ہو کر موکھے

کے اندر جھانکنے لگا وہ ایک دوسرے مو کھے کے آگے کھڑی تھی۔وہاں ہماری نظروں کے سامنے خوش کن تصویری کہانیاں تیر رہی تھیں۔ جب میرے ہوش وحواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں پیاستر اور تھالی دونوں چیزیں کھو چکا ہوں اور شعبدہ باز کا کوئی پتہ نہیں تھا۔تاہم میں نے نقصان پر دھیان نہ دیا وہ اس لیے کہ میں تصاویر کی شان، محبت اور جرأت کے کارناموں سے مغلوب ہو چکا تھا۔ میں اپنی بھوک بھول گیا تھا اور گھر واپس پہنچنے پر جو کہ میرے ساتھ ہونے والا تھا، اسے بھی بھول چکا تھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا اور میں نے قدیم دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔جہاں کسی زمانے میں افسر مالیات کا دفتر اور افسر اعلیٰ کا گھر ہوا کرتا تھا اور پھر میں جاگتی آنکھوں سے سپنا دیکھنے لگا۔ بہت دیر تک میں شان وشوکت، زینت البنات اور غول بیابانی کے خواب دیکھتا رہا۔اسی خواب میں اپنی حرکات وسکنات کے توسط سے میں اپنے لفظوں کو معانی دینے کے لیے اونچی آواز میں بولتا رہا۔ میں نے تصوراتی نیزے سے حملہ کرتے ہوئے کہا۔''او غول بیابانی، یہ لو سید ھا تمھارے دل میں۔''

''اور اس نے اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھائی ہوئی زینت البنات کو اوپر اٹھایا۔''ایک ملائم آواز پیچھے سے ابھری۔ میں نے اپنی دائیں طرف دیکھا یہ وہی لڑکی تھی جو اس تفریحی پروگرام میں میرے قریب موجود رہی تھی۔اس نے گندہ لباس پہن رکھا تھا، اس کی کھڑاویں رنگ دار تھیں۔وہ اپنے بالوں کی ایک لمبی لٹ سے کھیل رہی تھی، اس کے دوسرے ہاتھ میں سرخ اور سفید رنگ کی وہ مٹھائیاں تھیں، جنھیں''لڑکیوں کی خاص پسند''کہا جاتا ہے اور جنھیں وہ اطمینان سے چوسے جا رہی تھی۔ ہماری نظریں آپس میں ملیں اور میرا دل جاتا رہا۔

''آؤ کہیں بیٹھتے ہیں اور ستاتے ہیں۔''میں نے اُس سے کہا۔

اس نے میری تجویز پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا اور ہم پرانی دیوار کے دروازے سے نکل کر باہر آ گئے اور سیڑھی دار راستے کے ایک مقام پر جا بیٹھے۔وہ سیڑھی دار راستہ اوپر کی طرف بڑھتا ہوا ایک ایسے پلیٹ فارم پر جا کر ختم ہوتا تھا، جس کے پیچھے سے نیلا آسمان اور مینار دیکھے جا سکتے تھے۔ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو دبایا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ کیا کہا جائے اس لیے خاموش بیٹھے رہے۔ میں ایسے احساسات کے تجربے سے گزر رہا تھا، جو نئے، عجیب اور مبہم تھے۔اپنا چہرہ اس کے قریب کرتے ہوئے میں نے اس کے بالوں کی فطری خوشبو کو سونگھا؛ جس میں مٹی کی مہک اور مٹھائیوں کی خوشبو میں ملی جلی، اس کی سانسوں کی خوشبو بھی

شامل تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور اپنے تھوک کو نگلا، جس میں اسی ''لڑکیوں کی خاص پسند'' والی مٹھائیوں کی مٹھاس تحلیل ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کیا، اس کی خاموشی برقرار رہی اور میں اس کے گالوں اور لبوں کے بوسے لیتا رہا۔

جب میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما تو یہ غیر متحرک ہو گئے لیکن فوراً ہی یہ دوبارہ ان مٹھائیوں کو چوسنے میں لگ گئے۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ اب ہم کو اٹھ جانا چاہیے تھا۔ میں نے بے قراری سے اس کا بازو تھام لیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

''کہاں۔۔۔؟ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''دائی اُمِ علی کے ہاں۔'' اور اس نے نیچے کی طرف، اس مکان کی جانب اشارہ کیا، جس کی نچلی منزل میں لوہار کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔

''کیوں؟''

''اسے کہنے کے لیے کہ وہ جلدی سے آئے۔''

''کیوں؟''

''میری والدہ گھر پر زور زور سے چلا رہی ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں دائی اُمِ علی کے پاس جاؤں اور جلدی سے، اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں۔

''کیا تم اس کے بعد واپس آؤ گی؟''

اس نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس نے جب اپنی والدہ کا حوالہ دیا تو اس نے مجھے میری ماں کی بھی یاد دلا دی۔ میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ پرانے سیڑھی دار راستے سے اٹھتے ہوئے، میں گھر کی طرف چل دیا۔ میں اونچی آواز میں رونے لگا یہ ایک آزمودہ نسخہ تھا، جس سے میں اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ مجھے تو توقع تھی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے گی لیکن وہاں تو اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا: ''میری ماں کہاں چلی گئی؟ وہ کب لوٹے گی؟'' میں خالی گھر میں بور ہونے لگا۔ مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے کچن سے ایک تھالی لی اپنی بچت کی رقم میں سے ایک پیاسٹر لیا اور فوراً لوبیا بیچنے والے کی طرف چل پڑا۔ میں نے اسے دکان کے باہر ایک بینچ پر اپنے بازو سے چہرے کو ڈھانپ کر

سوئے ہوئے پایا۔لوبیا والے برتن غائب تھے۔تیل کی لمبی گردن والی بوتلیں واپس الماری میں رکھی ہوئی تھیں اور سنگِ مرمر سے بنے کاؤنٹر کے اوپر والی سطح کو دھودیا گیا تھا۔

''جناب۔۔۔۔''میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر سرگوشی کی۔

مجھے کوئی جواب نہ ملا۔بس اس کے خراٹے ہی سنائی دے رہے تھے۔ میں نے اس کے کندھے کو چھوا۔اس نے چوکنا ہوکر اپنا بازو بلند کیا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا:

''جناب۔''

اس نے میری موجودگی محسوس کرتے ہوئے اور مجھے پہچانتے ہوئے نہایت کھردرے طریقے سے پوچھا:

''کیا چاہتے ہو؟''

''ایک پیاستر کا لوبیا۔السی کے تیل کے ساتھ۔''

''ہوں۔''

''میرے پاس پیاستر بھی ہے اور تھالی بھی۔''

''لڑکے تم پاگل ہو۔''وہ چیخا۔دفع ہو جاؤ ورنہ میں مار مار کے تمھارا بھیجا نکال دوں گا۔''جب میں وہاں سے نہ ٹلا تو اس نے مجھے اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں کمر کے بل نیچے گر گیا۔میں خاصی تکلیف کے ساتھ اٹھا۔میں اس چیخ کو روکنے کی کوشش کرنے لگا،جس نے میرے ہونٹوں کو سکیڑ دیا تھا۔میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک میں پیاستر اور دوسرے میں تھالی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔میں نے اسے غصیلے انداز سے دیکھا۔واپس ہونے پر میں اپنی امید کو ختم ہوتے ہوئے محسوس کرنے لگا لیکن دلیری اور ہمت کے تصور نے میرے عملی اقدام کو بدل کر رکھ دیا۔پورے یقین کے ساتھ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور تھالی کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس پر پھینکا۔یہ ہوا میں اڑتی ہوئی گئی اور اس کے سر سے ٹکرائی اور اس دوران میں،میں ہر چیز سے بے پرواہ ہوکر وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔مجھے پورا یقین تھا کہ میں نے اسے مار دیا تھا جیسے کہ اس بانکے نے اس غول بیابانی کو مار دیا تھا۔میں پرانی دیوار کے قریب پہنچنے تک بھاگتا رہا۔پھولی ہوئی سانس کے ساتھ میں نے اپنے پیچھے دیکھا کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔میں اپنی سانسیں بحال کرنے کے لیے رکا تب میں نے اپنے آپ سے پوچھا:اب مجھے کیا کرنا چاہیے کیوں کہ اب تو میں نے دوسری تھالی بھی کھو دی تھی۔کسی چیز نے مجھے روکا کہ میں فوری طور

پر سیدھا گھر نہ جاؤں اور پھر جلد ہی میں نے اپنے آپ کو لاتعلقی کی ایک ایسی لہر کے سپرد کر دیا جس نے میری خواہش کو مضبوط کر دیا۔ گھر واپسی پر کم وبیش ایک مارتو ضرور میری منتظر تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے لیے ضرور اس سے جان چھڑا ہی لینی چاہیے۔ میرے ہاتھ میں ایک پیاستر تو تھا ہی اس لیے مجھے سزا پانے سے پہلے، اس سے کچھ نہ کچھ تو خوشی حاصل کر ہی لینی چاہیے تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ سوچوں کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں۔ لیکن وہ ہاتھ کی صفائی دکھانے والا کہاں تھا۔ وہ سیربین والا کدھر تھا۔ میں نے ہر طرف انھیں ڈھونڈا لیکن بے سود تھا۔

اس بےثمر تلاش سے تھک کر میں اسی پرانے سیڑھی دار راستے کی طرف چل دیا، جہاں مجھے اس سے ملنا تھا۔ میں اس ملاقات کے متعلق سوچتے ہوئے اس کا انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے مٹھائیوں کی خوشبو سے معطر ایک اور بوسے کی آرزو کی۔ میں نے تسلیم کیا کہ اس چھوٹی سی لڑکی نے مجھے ایسے لمس سے آشنا کیا تھا، جس سے میں پہلے واقف نہ تھا۔ ایسے میں جب کہ میں انتظار کر رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا، مجھے ذرا دور اپنے پیچھے سے ایک سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ میں احتیاط سے سڑھیوں پر چڑھا اور اختتامی چبوترے پر کسی کی نظر میں آئے بغیر، یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے پیچھے کیا ہو رہا ہے، میں منہ کے بل سیدھا لیٹ گیا۔ میں نے ایک بہت اونچی دیوار کے گھیرے میں کچھ کھنڈرات دیکھے جو مالیاتی دفتر اور افسر اعلیٰ کے گھر کی باقیات میں سے تھے۔ سیڑھیوں کے بالکل نیچے ایک مرد اور عورت بیٹھے ہوئے تھے اور اس سرگوشی کا باعث وہی تھے۔ وہ مرد ایک آوارہ شخص کی طرح تھا اور عورت ان خانہ بدوشوں جیسی تھی جو کہ بھیڑوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ میرے اندر سے برآمد ہوتی آواز نے مجھ سے کہا کہ ان کی ملاقات بھی بالکل ویسی ہے جیسی کہ میں خود کر چکا تھا۔ ان کی آنکھوں اور ہونٹوں سے یہ سب کچھ آشکار ہو رہا تھا لیکن ان کی اس غیر معمولی سرگرمی میں ایک حیران کن مہارت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرا ان کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا، اصل میں تجسس، حیرانی، خوشی اور بہت حد تک میری بے تابی کی وجہ سے تھا۔ آخر کار وہ ایک دوسرے کے بہت قریب بیٹھ گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص بولا:

"روپے"

"تم کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔" وہ شک مزاجی سے بولی۔

زمین پر تھوکتے ہوئے وہ بولا: "تم پاگل ہو۔"

''تم ایک چور ہو۔''

مرد نے اپنے ہاتھ کی پشت سے عورت کو ایک بھاری تھپڑ جڑ دیا۔عورت نے جواب میں مٹھی بھر مٹی مرد کے چہرے پر پھینکی۔مرد نے عورت پر جھپٹتے ہوئے اس کے نرخرے کو اپنی انگلیوں سے دبایا۔عورت نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ، مرد کی گرفت سے نکلنے کی بے سود کوشش کی۔اس کی آواز میں ناکامی تھی۔اس کی آنکھیں اس کے حلقوں سے باہر ابل پڑیں جب کہ اس کے پاؤں ہوا میں بلند ہو گئے۔ایک گونگی دہشت میں ڈوبے ہوئے، میں نے اس منظر کو دیکھا۔تب میں نے عورت کی ناک سے خون کی ایک باریک دھار کو نکلتے دیکھا۔ایک چیخ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔اس سے پہلے کہ وہ شخص اپنا سر اٹھاتا، میں ایک ہی چھلانگ میں نیچے اترتے ہوئے پیچھے کی طرف رینگ گیا۔جہاں تک میری ٹانگیں مجھے لے جا سکتی تھیں، میں نے ایک پاگل شخص کی طرح دوڑ لگا دی۔جب تک میری سانس نہ پھول گئی میں مسلسل دوڑتا رہا۔سانس بحال کرنے کے لیے جب میں رکا تو میں قطعی طور پر یہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت میں کہاں ہوں لیکن جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک چوراہے کے درمیان تعمیر کی گئی ایک محراب کے نیچے پایا۔آج سے پہلے میرے قدم وہاں کبھی نہیں پہنچے تھے اور مجھے بالکل نہیں سوجھ رہا تھا کہ میں اپنے گھر سے کتنی دوری پر اور کدھر موجود ہوں۔دونوں اطراف میں اندھے گداگر بیٹھے ہوئے تھے اور ہر طرف سے لوگ گزر رہے تھے جو ایک دوسرے سے بے تعلق لگ رہے تھے۔ایک خوف کے تحت میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا راستہ بھول چکا ہوں اور اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر کی طرف جانے والا راستہ ڈھونڈ سکوں، ان گنت مشکلات میرے انتظار میں تھیں۔کیا مجھے کسی راہ گیر کی مدد حاصل کرنی چاہیے تا کہ وہ میری راہنمائی کر سکے۔لیکن اگر مجھے لوبیا بیچنے والے شخص جیسا کوئی شخص ٹکر گیا یا اس ویرانے والے آوارہ جیسا کوئی بندہ مل گیا تو کیا ہوگا؟ کیا ایسا کوئی معجزہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ماں کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر اس کی طرف دیوانہ وار بڑھ سکوں؟ کیا مجھے خود سے اپنا راستہ تلاش کرنا چاہیے تا کہ یوں ہی ناک ٹوئیاں مارتے ہوئے مجھے کوئی ایسی مانوس حد بندی مل جائے جو صحیح راستے کی نشاندہی میں میری راہنما ثابت ہو سکے۔میں نے خود سے کہا: مجھے پرعزم رہنا چاہیے اور جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔دن گزرتا جا رہا تھا اور پراسرار اندھیرا چھانے والا تھا۔

☆☆☆☆

عادا ابوریما

دروازہ

سوئی سوئی آنکھوں والا چھوٹے قد کا مگر اس نوجوانی کے زمانے میں کسی قدر موٹاپے کی طرف مائل میرا دوست امادو، جس کی پینتالیس سالہ زندگی میں کوئی ہلچل نہ تھی اور جس کے گرد خوشی اور قہقہے بکھرے پڑے تھے۔ میرے خیال میں دنیا کا سب سے پرسکون شخص تھا۔ اس نے سکون، خاموشی اور تنہائی سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا تھا۔ اس نے یہ وطیرہ اپنی مسلسل ہٹ دھرمی سے اختیار کیا تھا۔ وہ ہجوم کے شور شرابے سے گھبراتا تھا۔ تنہائی ہی اس کی ساتھی تھی۔

خدا نے اس کی خواہشات پوری کر دی تھیں۔ پچھلے دس سالوں سے ایک تجارتی ادارے میں بطور اکاؤنٹنٹ کام کرتے ہوئے، اس کی مالی پوزیشن خاصی بہتر ہو گئی۔ اس دوران میں اس نے شادی کی اور ایک ایسا گھر بھی اس نے بنالیا جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ وہ گھر جو ذرا اونچائی پر بنایا گیا تھا۔ اور جس کا پچھلا صحن ایک حفاظتی تار میں لپٹا ہوا تھا۔ عام گھروں سے کافی ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ تو مشرق کی طرف سے تھا۔ جو یوکلپٹس کے درختوں کے گھنے بن کے درمیان سے ہو کر جاتا تھا اور دوسرا شمال کی طرف سے تھا، جو پہلے راستے کو کاٹتا ہوا قریبی باغ میں گم ہو جاتا تھا۔

مکان کی پچھلی طرف سے داخلے کا راستہ شمالی راستے کی جانب جاتا تھا۔ وہ ہر شام کو کام سے فارغ ہونے کے بعد مکان کے پچھواڑے کے لان میں آرام کرسی میں نیم دراز ہو کر اپنے ہاتھوں میں کتاب پکڑے مطالعے سے لطف اندوز ہونا پسند کرتا تھا۔

میں ہر دوسرے دن اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ مجھے اور اپنی بیوی کو ایک اور کرسی لانے کو کہتا۔ اور پھر رسمی خیر خیریت پوچھنے کے بعد میں اس کے قریب بیٹھ جاتا اور پھر سورج غروب ہونے تک ہم دونوں بیٹھے خاموشی میں ڈوبے رہتے۔

زندگی کی اس یک سانیت اور سکون کو، جس میں کبھی کبھی درختوں پر چہچہانے والے پرندوں کی آواز در آتی تھی، کسی شخص نے ایک دن، اس گھر سے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس واقعے سے چند دن پہلے امادو کی بیوی ایک مہینے کے لیے ایک قریبی گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ اکیلا تھا اور اپنی زندگی کی تنہائیوں کی خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چوں کہ میں اس کے مزاج سے واقف تھا اس لیے میں ایک ہفتے تک اس سے دور رہا۔ پھر ایک شام کو کھانے کے وقت سے ذرا پہلے، وہ اپنے ہاتھ میں ایک بیگ پکڑے، گھبرائے ہوئے انداز میں مجھ سے ملنے آیا۔

تین دن پہلے' حالاں کہ یہ بات بہت عجیب محسوس ہوگی، اس نے ایک فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا جس میں لوئیس دی فیونز مرکزی کردار ادا کر رہا تھا اور اس خیال سے کہ اس طرح، بہت سے لوگوں سے سامنا کرنا ہوگا، وہ اس شام گھر سے باہر نکلتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ تفریح کی خواہش بہر حال پہلی بار اس پر حاوی ہوگئی۔

اس نے جلدی جلدی نہانے کے بعد اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا آملیٹ تیزی سے نگلا اور پھر لباس بدلنے کے بعد، اس نے شو شروع ہونے کے صرف چند منٹ پیشتر اپنے آپ کو سینما ہال میں پایا۔ اس شام میں بھی بہت سے فلم بینوں کے درمیان موجود تھا اور یہ اس نے فلم دیکھنے کے بعد جانا۔ ہر کوئی اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے قہقہے لگا رہا تھا اور دور سے، میں امادو کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ قطعاً خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ وہ ابھی سینما ہال سے اٹھ بھاگے گا۔ اداکاروں کے فن سے متاثر ہو کر وہ فلم کے اختتام تک بیٹھا رہا۔ اور رات گئے گھر لوٹا۔

وہ بیرونی احاطے کا دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوا تو ان بلبوں کی روشنی میں نہا گیا، جن کو وہ جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو وہاں بھی روشنی تھی۔ لیکن جس چیز نے اس کے پاؤں جکڑ لیے تھے، وہ یہ تھی کہ دروازہ بالکل کھلا تھا۔

اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ باہر جاتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کر کے گیا تھا۔۔۔۔ تو پھر یہ دروازہ کس نے کھولا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ شاید یہ میں تھا، جو اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا جب کہ ہم دونوں نے شو ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے کو الوداع کہا تھا؟ اور اگر یہ میں ہی تھا تو میں کیسے داخل ہوا جب کہ میرے پاس اس گھر کی دوسری چابی ہی نہیں تھی۔ کیا یہ کوئی اجنبی ہے۔ لیکن نہیں۔ وہ تو اجنبیوں سے ملتا ہی نہیں۔ شاید یوں ہوا تھا کہ وہ چابی دروازے میں ہی بھول گیا تھا۔ لیکن پھر وہ اپنی قمیص کی ایک جیب کے کونے میں چابی کی موجودگی کو کس طرح محسوس کر سکتا ہے۔ اگر یہ یہاں نہ ہو تو پھر اسے دروازے کے چابی کے سوراخ میں ہونا چاہیے تھا؟ اس بات کا اسے پکا یقین

تھا کہ اس نے دروازہ بند کیا تھا۔۔۔۔ہاں اسے یقین تھا۔اسی لمحے اس نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا کوئی اندر ہے؟ لیکن جواب ندارد۔اندر کوئی ہے؟ وہ دوبارہ بول اٹھا۔۔۔۔وہی خاموشی۔یہ خاموشی نا قابل برداشت حد تک پراسرار طریقے سے اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔

وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔اس نے بھاگ جانا چاہا مگر پھر اس نے اس اقدام کو بےوقوفی سمجھا۔وہ پھر آگے بڑھا اور اس نے اس دروازے کی طرف دیکھا، جس نے اب اس کے اندر ایک خوف بھر دیا تھا۔رات اب بھیگ چلی تھی۔چار چو فیرے ٹھنڈک تھی مگر اس نے گھر میں داخل ہونے کی جرات نہ کی۔وہ مسلح نہیں تھا اور اسی لیے وہ حیران ہو کر سوچ رہا تھا کہ وہ حملے کی صورت میں اپنا بچاؤ کیسے کرے گا۔آج سے پہلے اس نے کبھی مسلح ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔اس نے محسوس کیا کہ ضرورت پڑنے پر ایک آدمی کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے۔وہ یہ بات جانتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس صرف ایک ہی زندگی ہوتی ہے۔

بعض اوقات آئندہ زندہ رہنے کے لیے دوسرا لمحہ موجود ہی نہیں ہوتا۔وہیں کھڑے کھڑے اس نے کسی دوسری جگہ پر یہ رات گزارنے کے بارے میں سوچا۔

لیکن اگر یہ بات پھیل گئی تو اسے بزدل سمجھا جائے گا۔نہیں بھاگ جانے سے مرجانا اچھا ہے۔مستحکم ارادے کے ساتھ اس نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے روشنی میں نہائی ٹیرس کو عبور کیا۔دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر اس نے دروازے کو پورا کھول دیا اور پھر وہ لاؤنج کے درمیان کھڑا، پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔

وہ ایک تحیر میں کھڑا ہوا تھا۔کھانے کی میز اپنی جگہ پر موجود تھی۔کچن کے آخری سرے پر بالکل دیوار کے ساتھ اور اس پر، وہ پلیٹ ابھی تک وہیں پڑی تھی، جس میں اس نے آملیٹ کھایا تھا۔اس اس کے قریب چاقو 'فورک' ایک خالی گلاس اور ایک ڈش کلاتھ بھی پڑا ہوا تھا۔اس کی بازوؤں والی چار کرسیاں بھی وہیں گہرے سبز قالین پر پڑی تھیں اور اپنی جگہ سے ہلی تک نہ تھیں۔لیکن مہاگنی لکڑی سے بنی الماری، ہاں اسے ضرور چھوا گیا تھا۔یہ کھلی پڑی تھیں اور وہ جس نے کچن کے برتنوں وغیرہ کے علاوہ یہاں کچھ اور تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے اس کے پٹ یوں ہی چھوڑ دیے تھے۔پچھلی طرف موجود، دو شاخوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی، وہ ان کے قریب آیا اور ایک چھوٹی سی لوہے کی سلاخ کے پاس ایک گیلا کپڑا پڑا دیکھا۔یہ چیزیں یہاں کس نے ڈالیں ہیں؟ اس نے ایک لمحے کے

لیے سوچا اور محسوس کیا کہ شاید سلاخ کو دروازے کا تالہ توڑنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن یہ کپڑا؟

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ کوئی گھر میں ضرور داخل ہوا تھا۔ لیکن کون؟ اور اگر وہ اس وقت گھر ہی میں کہیں کسی جگہ چھپا ہوا ہو تو۔۔۔۔وہ اس خیال ہی سے کانپ گیا کہ کوئی اس وقت بھی اسے دیکھ رہا ہے اور اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس نے باہر چلے جانے کے بارے میں سوچا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اس بے بسی کی حالت میں کسی کو مدد کے لیے پکارنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا جو اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس نے اسے آہستگی سے کھول دیا۔ اس نے یہ محسوس کرنے کے لیے کہ کوئی اور تو اندر موجود نہیں پہلے اس تھوڑے سے کھلے ہوئے دروازے میں اپنا ہاتھ اندر بڑھایا۔ صندوق، بیگ اور الماری ساری چیزیں وہیں تھیں۔ جہاں وہ انھیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے باتھ روم اور بیڈ روم میں جھانکنے کی ضرورت اس لیے محسوس نہ کی کہ اس کے نزدیک وہاں کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی۔

وہ آرام کرسی پر گر گیا۔ کسی نے اس کے گھر میں نقب ضرور لگائی تھی اور اب اس کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا۔ اجنبی یقیناً چور نہیں تھا۔ وہ یہاں سے ہر چیز اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ یہاں کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں تھا۔ تو پھر۔۔۔۔کیا وہ اسے جان سے مار دینے کے لیے آیا تھا؟ ہاں ایسا ہونا ناممکن بھی تو نہیں تھا۔۔۔۔؟ لوگوں کی نظروں میں ایک اکاؤنٹنٹ بہت اچھی مالی حیثیت کا مالک ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی حاسد شخص اس کے وجود کو ختم کرنے اور اس کی جائیداد کو ہتھیانے کے لیے ایسا اقدام کر سکتا تھا؟

اس نے اپنے قریب پڑے ٹیلی فون کا ریسور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو۔۔۔۔پولیس اسٹیشن؟ مہربانی کر کے مجھے پولیس چیف مسٹر دوکی سے ملوائیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

چند لمحوں بعد اسے بتایا گیا کہ جناب پولیس چیف مسٹر دوکی سے بات کیجیے؟

''مسٹر کمشنر۔۔۔۔میں امادو بول رہا ہوں۔ مہربانی کر کے فوراً میرے گھر تشریف لائیے۔ کوئی یہاں میری جان کے درپے ہے۔'' بڑے کلاک کے مطابق اس وقت رات کے دو بجے تھے۔

پانچ منٹ بعد پولیس چیف اپنے ایک ماتحت کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ امادو کے سامنے بیٹھ گیا اور فوراً ہی انکوائری شروع ہو گئی۔ دوکی الف سے ی تک ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ

چھوٹی چھوٹی جزئیات کوبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا کہ امادو نے کسی ہمسائیگی کےبغیر یہاں اتنی دور یہ مکان کیوں بنوایا۔اس کے پاس کتنی چابیاں ہیں؟اس کی بیوی کہاں گئی ہے۔اور کتنے عرصے کے لیے گئی ہے؟ کیااس کے پاس کوئی نوکر بھی ہے؟ کوئی محافظ؟ کون کون سی چیزیں چرائی گئیں تھیں؟ کیااس نے باغ میں قدموں کے کوئی نشان دیکھے ہیں۔اسے ختم کر کے کون فائدہ اٹھا سکتا تھا، دوسرے جو سوالات اس سے پوچھے گئے۔ان کی نوعیت کیا تھی۔یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔جب کہ جوابات اس سے بالکل مختلف نہیں جو آپ پہلے ہی جانتے ہیں۔۔۔۔دوکی نے سب کچھ نوٹ کرلیااور یہ راز کی بات نہ ہوگی۔ اگر میں آپ کو یہ بتادوں کہ دوکی بھی امادو سے متفق تھا کہ سلاخ کوواقعی دروازہ کھولنے کے لیے استعمال کیا گیا تھااور کپڑے کواپنی انگلیوں کےنشانات مٹانے کے لیےاستعمال کیا گیا تھا۔اوروہ پراسرار شخص جو یہاں مکان میں داخل ہوا تھا۔اس کی نیت یہاں سے کچھ چرانے کی نہیں بلکہ کچھ اور تھی۔

اب چوں کہ کافی دیر ہوگئی تھی اس لیےانسپکٹر وہاں سے چلا آیا،مگر پولیس مین کوامادو کے پاس وہیں چھوڑ گیا۔اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ہوسکتا تھا وہ ''شریف آدمی'' پھر چلا آئے۔

اگلے دن اور رات پولیس مین وہاں اس لیےموجود رہا تھا کہ اس طرح وہ اس نقب والے پر ہاتھ ڈال سکےتو امادو نے بھی اس حالت میں یہ وقت گزارا جیسےاس کی زندگی کے دن ختم ہونے والے ہوں۔دن اور رات کے مختلف حصوں میں نیند لیتے ہوئےامادو نے خوابوں میں ایک لمبےقد کے آدمی کو اپنے سر پر ایک تلوار تانے ہوئے پایا۔وہ اپنے اس ڈراؤ خواب کے دوران میں ہمیشہ اس وقت ڈر کر جاگ گیا تھا۔جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ خوف ناک ہتھیار اس کی گردن پر گرنے والا ہے۔

تیسری صبح تک جب کوئی انہونی بات ظہور پذیر نہ ہوئی تو پولیس چیف نے اپنے آدمی کو واپس بلا لیااور امادو پھر اکیلا رہ گیا۔سہ پہر کے بعد واپسی پر امادو اپنے گھر کے باغ میں بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ اس کے چہرے پر ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔وہ باڑ پر جھکا یوکلپٹس کے درختوں کےاس جھنڈ کی طرف دیکھتا رہا، جوایک حقیقی جنگل کی طرح لگ رہا تھا۔

یہ جھنڈ۔۔۔۔ہاں واقعی۔۔۔۔اس نے اس کے بارے میں پہلے کیوں نہیں سوچا؟ وہ ادھر ہی سے آیا ہوگا۔۔۔۔وہ یقیناً ان بھتوں میں سےایک تھا جنھوں نے اس جھنڈ میں رہائش اختیار کررکھی تھی اور اس رات اس سے ملنے آیا ہوگا۔وہ کانپ گیا۔بھتوں کی بستی کے درمیان میں رہنے کے تصور نے اس کا خون خشک کر دیا تھا۔

وہ ایک طرف ہوا۔ باڑ پیچھے ہٹائی۔ اور پھر گھر میں داخل ہوگیا ایک لمحے کے بعد وہ اپنے ہاتھ میں ایک بیگ پکڑے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا، باہر آیا اور شہر کی طرف چل پڑا۔ جہاں کسی مینار کے اوپر سے کوئی موذن دن کی چوتھی یعنی مغرب کی اذان دے رہا تھا۔ اور اس طرح امادو نے جب اپنی تنہائی کو خیرباد کہا تو اس لمحے اس کے تمام خوف وخطرات بھی ہوا ہو گئے۔

☆☆☆☆

چنوااچیبے

فوق مافوق

جولیئس آبی بیٹھا اپنے ٹائپ رائٹر کو گھور رہا تھا۔موٹا چیف کلرک، جو اس کا باس تھا، اپنی میز کے پاس بیٹھا خراٹے لے رہا تھا۔گیٹ کیپر، جس نے سبز وردی پہن رکھی تھی باہر اپنی جگہ پر سو رہا تھا لیکن آپ اس پر، کوئی الزام نہیں دھر سکتے کہ تقریباً ایک ہفتے سے کسی ملاقاتی کا گزر اس دروازے سے نہیں ہوا تھا۔وزن کرنے والی دیو ہیکل مشین پر ایک خالی ٹوکری پڑی تھی ۔مشین کے گرد چند پام گری پودے اداسی میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔وہاں صرف مکھیوں کی حکومت تھی۔

جولیئس اس کھڑکی کی طرف آیا، جو نائیجر دریا کے کنارے پر موجود، بڑی مارکیٹ کی نگرانی کرتی نظر آتی تھی۔اگر چہ یہ قصبہ جو آبادی کی بڑھوتری اور پھیلاؤ کی وجہ سے ایک بڑی پام آئل بندرگاہ میں تبدیل ہوتے ہوئے، دریائے آفو تک بڑھ آیا تھا، ابھی تک اس کی یہ مارکیٹ گووہی کہلاتی تھی، تاہم اپنی حد سے تجاوز کرنے کے باوجود، یہ اپنے اصل گوودن کے موقع پر اب بھی مصروف ترین ہی تھی کیوں کہ وہ دیوی جو قدیم زمانے سے اس کی میر مجلس تھی' وہ اپنے خاص دن پر اب بھی اس پر سحر طاری کیے رکھتی تھی' تاکہ لوگ اس کے لوبھ میں پھلتے پھولتے رہیں۔

ایک کہاوت کے مطابق وہ مرغے کی بانگ سے کچھ دیر پہلے ہی مارکیٹ کے مرکز میں ایک بوڑھی عورت کے روپ میں ظاہر ہوتی تھی اور کافی فاصلوں پر رہنے والے مردوں اور عورتوں کو مارکیٹ میں کھینچ لانے کے لیے اپنے جادوئی پنکھے کو اپنے دائیں بائیں' آگے پیچھے زمین کے چاروں اطراف میں لہراتی تھی اور وہ لوگ اپنی زمینوں کی پیداوار، پام آئل اور مغزیات، کولا اخروٹ، کیساوا، چٹائیاں، ٹوکریاں اور مٹی کے برتن اپنے ساتھ لاتے تھے اور اپنے گھروں میں بہت سے رنگین کپڑے، دھواں رنگ مچھلیاں، لوہے کے برتن اور پلیٹیں لے جاتے تھے۔یہ جنگلوں میں رہنے والے لوگ تھے۔دوسری آدھی دنیا جو عظیم دریاؤں کے کناروں پر آباد تھی وہ بھی ڈونگا کشتی میں آتی تھی اور اپنے ساتھ دھاگا اور مچھلی لاتی تھی۔بعض اوقات یہ ایک بڑی ڈونگا کشتی ہوتی تھی، جس میں ایک درجن سے زیادہ لوگ

ہوتے تھے اور بعض اوقات تیز بہاؤ والے انیم بارا کے ذریعے ایک چھوٹی کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ آنے والا کوئی اکیلا مچھیرا ہوتا تھا۔ وہ اپنی ڈونگا کشتی کنارے پر لنگر انداز کرتے ہوئے، خاص سودے بازی کے بعد اپنی مچھلی بیچتے۔ تب ان کی عورت دریا کے ڈھلوانی کنارے سے چل کر تیل اور نمک خریدنے کے لیے مارکیٹ کے وسط میں چلی آتی 'اور اگر اس کا مال بہت اچھا بک گیا ہوتا تو تب وہ بہرحال تھوڑا سا کپڑا ابھی لے لیتی۔ اور وہ گھر پر موجود، اپنے بچوں کے لیے پین کیک اور مائی مائی خریدتی جو اگاراعورتوں نے تیار کیے ہوتے تھے۔ شام ہونے پر وہ دوبارہ اپنے چپوار پکڑتے اور غروب آفتاب کی روشنی میں ٹمٹماتے پانی میں کشتی کھینے لگتے اور ان کی ڈونگا کشتی دور جاتی ہوئی، مختصر سے مختصر ہو کر پانی کی سطح پر ایک کالے چاند جیسی شکل اختیار کر جاتی اور اس میں سوار دو کالے جسم آگے پیچھے ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگتے۔ تب جنگل کے لوگوں کے لیے جو اگبو کہلاتے تھے' اموروان کے ملنے کی جگہ ہوتی اور وہ اجنبی دریائی لوگ جنھیں یہ اگبو لوگ اولو کہتے تھے' ان کے آگے دنیا لامتناہی انداز سے پھیلی ہوئی تھی۔

جولیئس آبی اموروکا مقامی نہیں تھا' وہ دوسرے ان گنت لوگوں کی طرح ملک کے دوسرے جھاڑ گاؤں سے آیا ہوا تھا۔ وہ ایک مشن اسکول سے چھٹے درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس طاقتور یورپی ٹریڈنگ کمپنی کے دفاتر میں کلرک کے طور پر کام کرنے کے لیے امورو آیا تھا جو پام گری کو خود اپنی طے کردہ قیمت پر خریدتی تھی اور کپڑا اور دھات کے برتن اسی طرح اپنی من مرضی کی قیمت پر بیچتی تھی۔ یہ دفاتر اس مشہور مارکیٹ کے پہلو میں واقع تھے اس لیے جولیئس کو اپنے پہلے دو تین ہفتوں میں اس کے خاص پیچ و تاب کھاتی جھنجھناہٹ میں گھرے ہوئے ماحول میں اپنے کام کو سیکھنا تھا۔ بعض اوقات جب چیف کلرک موجود نہ ہوتا تو وہ کھڑکی کی طرف آجاتا اور جھک کر اس سرگرمی کو دیکھنے لگتا۔ وہ سوچتا، بہت سے لوگ کل یہاں موجود نہیں تھے پھر بھی مارکیٹ بھری ہوئی لگتی تھی۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو کہ اس طرح دن بہ دن اس کو مزید بھرنے کے لیے بھی ادھر آنے والے تھے۔ بے شک ایک کہاوت کے مطابق وہ سارے لوگ جو یہاں ادھر اس عظیم مارکیٹ میں آتے تھے اپنا حقیقی وجود نہیں رکھتے تھے، جیوٹ کی اماں نے ایسا کہا تھا۔ خوب صورت عورتوں میں سے چند ایک ہجوم میں سے اپنا راستہ بنا رہی ہوتی ہیں، وہ میری اور تمھاری طرح کے لوگ نہیں ہیں لیکن ہاں قیمتی ووتا لوگ ضرور ہیں جو کہ دریا کی گہرائیوں کے قریب موجود بستی میں رہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہمیشہ ایسا کہہ سکتے ہو کیوں کہ وہ ایسی خوب صورتی کے حوالے سے خوب صورت ہیں جو بے عیب بھی ہے اور بے پروا بھی ہے۔ تم اپنی

آنکھ کے پچھلے حصے سے بھی کسی عورت کی جھلک دیکھ سکتے ہو، پھر تم پلک جھپکتے ہوئے زیادہ مناسب طریقے سے بھی اسے دیکھ سکتے ہو لیکن وہ تو اس سے پہلے ہی ہجوم میں کہیں گم ہو چکی ہو گی۔

جولیس اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑا خاموش اور خالی مارکیٹ کی طرف دیکھتا ہوا ایسی ہی چیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کس کو یقین تھا کہ ایسی پرشور مارکیٹ کبھی یوں ٹھنڈی بھی پڑ سکتی تھی؟ لیکن ایسی طاقت صرف کنک پا کے پاس تھی جو چیچک کی طاقت کا مجسمہ تھا۔ صرف وہی تھا، جو لوگوں کو یہاں سے دھکیل کر باہر کر سکتا تھا اور اس مارکیٹ کو مکھیوں کے سپرد کر سکتا تھا۔

جب امورو ابھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا تب ایک عمر رسیدہ شخص ہوا کرتا تھا جو نکوو دن کے موقع پر مارکیٹ کے ہر حصے کی صفائی کیا کرتا تھا لیکن ترقی نے اسے ایک غیر مملوکہ زمین اور لوگوں کے ہجوم سے بھری' چت پڑی ہوئی ایک گندی مصروف ترین بندرگاہ میں تبدیل کر دیا تھا جواب زمین کے بیٹوں سے کہیں زیادہ لاتعداد اجنبیوں سے بھری پڑی تھی' وہ زمین کے بیٹے جو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اپنی عبادت سے مجموعی طور پر انحراف کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلاتے جائیں۔ لیکن بے شک انھوں نے (اور اس کے لیے ان پر کون الزام دھرے گا) اپنی بستی کے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی دعا ضرور کی تھی اور اس نے ترقی کر لی تھی۔ لیکن ایک چھوٹی ترقی ہوتی ہے اور ایک بری ترقی ہوتی ہے۔ صرف شراب اور غذا سے ہی تو ندنہیں بڑھتی۔ یہ ایک گندی بیماری کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے جو اس میں مبتلا شخص کو گھر بدر کر کے ختم کی جا سکتی ہے حتیٰ کہ وہ ابھی مکمل طور پر مرا ہوا بھی نہ ہو۔

جو اجنبی امورو میں در آئے تھے وہ یہاں کسی قسم کے فرائض مذہبی کی تلاش میں جو کہ خود ان کے اپنے گاؤں میں (جو کہ ان کا گھر تھا) میں بھی وافر موجود تھے نہیں آئے تھے بل کہ وہ یہاں دولت کے حصول اور تجارت کی غرض سے آئے تھے کیوں کہ یہ کوئی اطمینان بخش بات نہ تھی اس لیے امورو مٹی کے جنے نوجوان بیٹے بیٹیاں جو اسکولوں اور گرجوں سے ترغیب پاتے تھے' ان کا سلوک ان سے اجنبیوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے پہلے کے سارے سبق بھلا کر ان سے صرف اپنی رقابت کو نبھا رہے تھے۔

تب بستی کی ایسی ہی حالت تھی جب کنک پا اُسے دیکھنے اور یہاں کے رہنے والوں سے' جو زمینی دیوتاؤں کے مقروض و ممنون تھے' قربانی کا مطالبہ کرنے آیا تھا، وہ یہاں کے لوگوں کے اوپر چھائی ہوئی اپنی دہشت کے علم کے بھروسے پر یہاں آیا تھا۔ وہ بدی کا دیوتا تھا اور شیخی بھگارتا تھا، بقول کسے، ان کو جنھیں، اس نے مارا تھا کوئی تکلیف نہیں دی تھی کیوں کہ وہ مارے نہیں گئے تھے بل کہ وہ تو معزز

بنا دیے گئے تھے اُسی لیے کسی نے ان کے لیے رونے کی جرأت نہیں کی تھی ۔اس نے دیہات کے درمیان اور پڑوسیوں کے آپس میں آنے جانے کا خاتمہ کر دیا۔ کسی نے کہا'' کینک پا اس گاؤں میں موجود ہے ۔'' اور فوری طور پر اس کا اپنے پڑوسیوں سے قطع تعلق ہو گیا۔ جولیئس غمگین اور متفکر تھا کیوں کہ جیٹ یعنی وہ لڑکی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا' اسے اس نے تقریباً ایک ہفتے سے نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے اسے بڑی نرمی کے ساتھ بتایا تھا کہ اسے ان لوگوں سے ملنے، ابھی نہیں جانا چاہیے تا آں کہ بیوہ کی طاقت کے ذریعے یہ چیز نہ ہو جائے (ماں ایک نو معتقد پارسا عیسائی تھی اور وہ واحد وجہ، جس کی بنا پر، اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو جولیئس سے منسوب ہونے کی اجازت دی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ سی ایم ایس چرچ کے گانے والے طائفے میں شامل تھا)

''تمھیں خود کو اپنے اندر تک محدود رکھنا چاہیے۔'' اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کیوں کہ کینک پا سختی سے شور اور ادھم کی ممانعت کرتا ہے ۔ تمھیں نہیں معلوم کہ باہر تمھاری کس سے ملاقات ہو جائے ۔'' خاندان والوں کو معلوم ہو گیا ہے ۔'' اس نے اپنی آواز اور دھیمی کر لی اور اس مکان کی طرف پراسرار انداز میں اشارہ کیا، جو سڑک کی پرلی طرف واقع تھا اور جس کا دروازہ تاڑ کے زرد پتوں سے بند کر دیا گیا تھا۔

''اس نے پہلے ہی ان میں سے ایک کو سجایا ہوا ہے اور جو باقی کے تھے وہ آج ایک بڑی حکومتی لاری میں یہاں سے کوچ کر گئے تھے۔''

جیٹ نے مختصر سے راستے کو جولیئس کے ساتھ طے کیا اور رک گئی تو وہ بھی رک گیا۔ لگتا تھا کہ ان کے پاس ایک دوسرے کو کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ تبھی وہ پس و پیش کر رہے تھے' تب لڑکی نے خدا حافظ کہا اور اس نے بھی خدا حافظ کہہ دیا اور ایک عجیب بات تھی کہ انھوں نے آپس میں ہاتھ ملائے جیسے رات بھر کے لیے ان کا جدا ہونا کوئی نیا اور سنگین مسئلہ تھا۔

وہ سیدھا گھر کی طرف نہیں گیا کیوں کہ وہ نہایت مایوسانہ انداز میں اس عجیب جدائی کو بالکل اکیلے جھیلنا چاہتا تھا، چوں کہ وہ پڑھا لکھا تھا، اس لیے وہ اس بات سے خوفزدہ نہیں تھا کہ کون اس سے راستے میں ملنے والا ہو سکتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے تک چلا گیا اور وہ یہاں اوپر سے نیچے تک پھرتا رہا۔ اسے یہاں آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی کیوں کہ جب نائٹ ماسک کا لکڑی کا گانگ بجا اس وقت تک وہ وہیں تھا۔ وہ فوراً ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ چل بھی رہا تھا اور قدرے بھاگ

بھی رہا تھا کیوں کہ نائٹ ماسک تو ہم پرستی کا معاملہ نہیں تھا بل کہ یہ حقیقی تھے، وہ اپنی بدمستیوں کے لیے رات کا چناؤ کرتے تھے کیوں کہ چمگادڑوں کی طرح ان کی بدصورتی بھی عظیم تر تھی۔

جلدی میں اس کا پاؤں کسی چیز پر پڑ گیا جو ہلکے سے مائع دھماکے کے ساتھ اس کے پاؤں کے نیچے ٹوٹ گئی۔ وہ رکا اور اس نے نیچے جھک کر فٹ پاتھ پر دیکھا۔ ابھی تک چاند نمودار نہیں ہوا تھا لیکن آسمان پر ایک مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے انڈے کے اوپر سے گزرا تھا جو قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ کوئی ایسا شخص جسے بدقسمتی نے آگھیرا تھا، اس نے شام کے وقت اسے چوک میں بھینٹ کے طور پر رکھ دیا تھا اور اس کے اوپر اس کا پاؤں آ گیا تھا۔ وہاں پر اس کے اردگرد وہی عموی کم عمر ناڑ کے پودے تھے لیکن جولیئس نے اسے ایک مختلف انداز میں ایسے گھر کے طور پر دیکھا، جہاں وہ ڈراؤنا آرٹسٹ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس نے ریتیلے راستے پر اپنے جوتے کے تلے کو صاف کیا اور اپنے ذہن میں ایک اور طرح کی دھندلی سی فکر کو لیے تیزی سے آگے بڑھنے لگا، لیکن جلدی کرنا اب بے سود تھا کیوں کہ تیز قدم ماسک پہلے ہی آزاد ہو چکا تھا۔ وہ (ماسک) تیز چلنے پر شاید اس لیے مجبور تھا کہ چاند کے نمودار ہونے کا ڈر اس کے سر پر موجود تھا لیکن رات کی خاموش ہوا میں، اس کی صاف اور اونچی آواز تلوار کے مانند تھی۔ یہ ابھی کافی دوری پر تھا لیکن جولیئس جانتا تھا کہ فاصلے اس کے سامنے دم توڑ دیتے تھے، اس لیے اس نے سیدھا سڑک کے کنارے پر موجود ناریلوں کے فارم کا رخ کیا اور اس نے خود کو پیٹ کے بل گرا دیا، اس طرح اسے چوڑے پتوں کی آڑ مل گئی۔ اس نے بہ مشکل ہی ایسا کیا تھا کہ عین اسی وقت اس نے روح کے ساتھیوں کی گھڑگھڑاہٹ کو سنا اور ساتھ ہی اس نے اس کی پرشور جیسی مجرمانہ مسائل پر مبنی تقریر کو بھی سنا، وہ کانپ کر رہ گیا۔ آوازیں اس پر بوجھ ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کو تقریباً دبائے ہوئے نم زمین کے ساتھ لگا رہی تھیں اور اب وہ قدموں کی آواز کو سن سکتا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے بیس شیطان صفت لوگ اکٹھے بھاگ رہے تھے؛ وہ خوف سے پسینے میں نہا گیا اور تقریباً اٹھ کر بھاگنے ہی والا تھا۔ خوش قسمتی سے اس نے خود پر قابو پا لیا اور پلک جھپکنے میں زمین اور ہوا میں موجود یہ سارا فتنہ یعنی گھڑگھڑاہٹ اور موسلا دھار بارش، زلزلہ اور سیلاب گزر گیا اور سڑک کی دوسری طرف ایک فاصلے پر غائب ہو گیا۔

اگلی صبح، چیف کلرک کے دفتر میں زمین کے ایک بیٹے نے گزری شب کے سرکش نوجوان کے ذریعے برپا کیے جانے والے کیتک پا کے اشتعال دلانے والے مظاہرے کو تلخی سے بیان کیا۔ نوجوان

نے شور کر کے تیز قدم ماسک والا یہ مظاہرہ اپنے بڑوں کی مخالفت میں کیا تھا جن کا کہنا تھا کہ یوں کینک پا تیخ پا ہو جائے گا اور تب....... مصیبت یہ تھی کہ ان نافرمان نوجوانوں کو ابھی تک خود کینک پا کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ انھوں نے اس کے متعلق صرف سُن رکھا تھا لیکن وہ جلد ہی اس کے متعلق جان لیں گے۔

اس وقت جب جولیئس کھڑکی کے قریب خالی مارکیٹ کا جائزہ لے رہا تھا تو دوبارہ سے اس رات والے خوف نے اسے جکڑ لیا تھا، حالاں کہ ایسا صرف ایک ہفتہ پیشتر ہی ہوا تھا، لیکن پہلے ہی سے یہ ایک دوسری زندگی لگ رہی تھی جو کہ ایک وسیع خالی پن کے ذریعے موجود زندگی سے جدا کر دی گئی تھی۔ یہ خالی پن ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ اس طرف جولیئس کھڑا تھا اور دوسری طرف ماں اور جیٹ کھڑی تھیں، جنھیں اس دہشت زدہ کرنے والے آرٹسٹ نے سنوارا تھا۔

☆☆☆☆

پھان دو

پھول اور انسان

اس لمحے بھی اور جب کبھی بھی میں گملوں میں اگے پھولوں کو دیکھتا ہوں یا جب پھولوں کے آرٹ سے لطف اندوز ہونے کی بات ہوتی ہے تو مجھے اس بوڑھے شریف آدمی سکالر نگوین کا خیال ضرور آتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے میں اس وقت صحیح معنوں میں آشنا ہوا تھا، جب میں نے ذہنی پختگی حاصل کر لی تھی اور میں چیزوں کو زیادہ گہرائی میں دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا اور اب اس وقت میں پھولوں کے ساتھ دوستی کے معاملے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔

البتہ آج کل مجھے اس بوڑھے سکالر جیسا اہم آدمی نظر نہیں آتا، جو ہمارے گھر میں میرے والد کا اکثر مہمان بنتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی ہمارے گھر میں آتا تھا۔

مگر ایک چیز مجھے بہت متاثر کرتی تھی کہ میرے گھر والے اس بوڑھے سکالر کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے تھے۔ حالاں کہ دعوت عموماً بہت سادہ سی ہوتی تھی اور دوسرے آنے والے اعلیٰ پائے کے مہمانوں سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ لیکن اس سادگی میں بھی ایک خاص اہتمام پنہاں ہوتا تھا، جس کے ذریعے بڑے اور منفرد لوگوں کے لیے ایک گہری عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔

جب بھی یہ بوڑھا سکالر ہمارے گھر آتا، میرے والد خود اس کے لیے چائے بناتے، اس کے لیے خود شطرنج کے مہرے سجاتے اور اس کے لیے دوسری ضروری چیزوں اور ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ اس کے علاوہ ایسے موقع کے لیے میرے والد خاص خوشبو والی چائے کی پتی بچا کر رکھتے تھے۔ تب وہ دونوں بزرگ اکٹھے بیٹھ کر شطرنج کھیلتے، رائس برانڈی سے شغل کرتے، ایک دوسرے کو شاعری سناتے اور اردگرد پھیلی صندل کی خوشبو میں گھرے، وہ حالات حاضرہ پر بحث کیا کرتے تھے۔ شطرنج کی بازیاں بعض اوقات بہت طول پکڑ جاتیں اور سارا سارا دن تک چلتیں۔ بہر حال دونوں کھلاڑیوں کے درمیان کوئی بھی فتح مند نہیں ہوتا تھا۔ بازی برابر ہی رہتی تھی۔

میرے والد دو تین ماہ بعد ہی اپنے دوست کے گھر جاتے تھے۔ جب بھی میرے والد کے

پاس اچھی چائے کی پتی موجود ہوتی یا کوئی اوراعلیٰ پائے کی چیز ہوتی تو وہ مجھےاورمیرے بھائی کو یہ چیزیں اپنے دوست کو دینے کے لیےاس کے گھر بھیجتے تھے۔ایسی چیزیں میرے والد نے نوکر کے ہاتھ کبھی نہیں بھیجیں۔

اس طرح مجھے کئی باراس بوڑھے سکالر کے گھر جانے کا موقع ملا۔انھی مواقع کی نسبت سے میں نے بےانتہا غربت کے فلسفےاوراس بوڑھے شخص کی ذاتی نیک زندگی میں غور وفکر کرنا سیکھا تھا۔

اس کا گھر غریبوں کی بستی میں ایک چھوٹے سے باغ کے درمیان بنایا گیا تھااور یہ گھاس پھوس کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا۔اس باغ کے ساتھ ساتھ اس گھر نے میری روح میں بڑی خوب صورت اورشاعرانہ یادیں اتاردی تھیں۔

بوڑھے سکالر کا باغ مجھےایک پھول باغ لگتا تھا۔جب میں دروازے سےاندرداخل ہوتا تو میں محسوس کرتا تھا جیسے میں کسی درختوں سے بھرے جوبن پر آئے ہوئے جنگل میں حیران کھڑا ہوں۔ سارا باغ سورج کی روشنی میں جھلمل کرتی پھولوں کی رنگا رنگ پتیوں سے دمک رہا ہوتا تھا۔یہ باہر کی پرشور دنیا سے بہت مختلف ایک پرسکون جگہ تھی۔

میں بوڑھے سکالر سے،اس کے گھر سے زیادہ اس کے باغ میں اس سے ملاقات کیا کرتا تھا۔اس بوڑھے شخص کے سراورداڑھی کے بال سفید تھے۔اس کا ماتھا بہت خوب صورت تھااور چاندی کے فریم والےاس کے چشمے کے پیچھےاس کی مہربان آنکھیں ہوتی تھیں۔وہ تقریباً ہرموسم میں اپنے دبلے پتلے لمبے جسم کو، براؤن رنگ کے کپڑوں میں لپٹائے رکھتا تھا۔وہ باغ کے درمیان کھڑا اپنی پوتی کے ساتھ مجھے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملتا تھا۔میں اس بوڑھے شخص کی مسحورکن شخصیت کو شاید کبھی نہیں بھلاسکوں گا۔

میرے لیے اب بھی اس کی شخصیت کا پرتو ایک پاکیزہ، نیک اور مشاہدہ نفس کرنے والی زندگی کی علامت تھا۔میرے ذہن میں یہ تاثراس وقت ابھرتا تھا، جب انسانی خواہشات کی بےلگام لہریں ایک بامقصد زندگی کے یقین کو میرےاندر سے بہالے جانے پرتل جاتی تھیں۔

وہ بوڑھا سکالراس پرامن جگہ پراپنے نوکراور پوتی کے ساتھ رہتا تھا۔بل کہ اصل میں تو وہ اپنے پھولوں کے ہمراہ رہتا تھا۔اسے پھولوں کو اگانے،ان کی دیکھ بھال کرنے اوران کی نشو ونما کے سلسلے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پرغور کرنے میں بےپناہ خوشی حاصل ہوتی تھی اوراس طرح وہ دوسری

مصروفیتوں میں الجھنے سے بچا رہتا تھا۔

پہلے پہل میں نے اس مسرت بھری دنیا کو ایک عام آدمی کی نظر سے دیکھا تھا کیوں کہ پھولوں کو بڑے بڑے مٹی کے گملوں میں اگانا اس مقدس شہر کی روایت تھی۔ اس وقت صرف سولہ سال کی عمر میں میں نے اس خوشی اور مسرت کو محض ایک طرح کی پیچیدگی اور بوریت کے حوالے سے دیکھا تھا۔ مزید یہ کہ اس شریف بوڑھے آدمی کا روایتی انداز میرے لیے کوئی غیر معمولی چیز نہ تھا۔ اور اس طرح آغاز میں میرا اس کے گھر جانا رسمی سا تھا اور مجھے اس میں کوئی خاص خوشی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ، میں نے اس شخص کو ایک نوجوان روح کا مالک پایا۔ وہ نہایت سادہ اور خوش باش دل رکھتا تھا۔ جوں جوں میں اس کے گھر جاتا رہا' میرے دل میں اس کے لیے محبت اور عزت بڑھتی ہی رہی' اور یوں میرے اندر چھپے پرانے خدشات ہوا ہو گئے۔ بوڑھا سکالر مجھے اپنی پوتی بوئی لان کی طرح اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتا تھا۔

اس کا پھول باغ مجھے دوسری چیزوں سے زیادہ اپنی طرف کھینچتا تھا۔ باغ میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے' پھولوں کو پانی دینے میں اس کی مدد کرتے ہوئے' پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے ہوئے اور ادھر اُدھر کے کئی دوسرے کام کرتے ہوئے، مجھے ایک سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ ایسے کام سرانجام دیتے ہوئے بوڑھا سکالر مجھے اور بوئی لان کو بہت سمجھدار لوگ سمجھتے ہوئے گپ شپ کرتا تھا۔ وہ پھولوں اور ان کی مختلف قسموں اور ان کے مخصوص امتیازی اوصاف کے متعلق باتیں کرتا تھا اور ان کے متعلق بڑے خوش کن ریمارکس دیتا تھا۔ ان پھولوں کی چھاؤں میں کی جانے والی، ان باتوں کے ذریعے، جن کو میں اس وقت پوری طرح سمجھ نہیں پاتا تھا' میں نے یہ جانا تھا کہ بوڑھے کو پھول اگانے میں جو خوشی حاصل ہوتی تھی' اس کی نوعیت بہت غیر معمولی اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ یہ خودغرضانہ خوشی بالکل نہ تھی۔ اس کے باغ کے نہایت قیمتی پھولوں کے چند گملوں میں قسمت سے وابستہ ایک حادثے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ ان وقتوں میں بوڑھے سکالر کا ماضی اس کے لیے ایک مذہب کا درجہ رکھتا تھا۔ پھولوں کے مذہب کا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں گل داؤدی کے پودے ایک دوسری جگہ منتقل کر رہا تھا تو بوڑھے سکالر نے مجھے بتایا تھا:

''ہاں مجھے اب ان کی جگہ بدل دینی چاہیے، نہیں تو ان کی زندگی پرانی غاروں والی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔''

''جناب۔۔۔۔غاروں والی زندگی میں تبدیل ہونے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''
پھولوں کی دیکھ بھال کرنے کے فن سے آشنا شخص سے کیے گئے میرے نہایت معصومانہ سوال نے خوب صورت بوئی لان کو کھی کھی کر کے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔
بوڑھے شخص نے جواب دیا۔
''پودوں کے لیے غاروں والی زندگی میں واپسی کا مطلب، اس کے پتوں کا بالکل غائب ہو جانا ہوتا ہے۔اگر کوئی پودا پھولوں سے لدا پھندا بھی ہو، اور وہ غاروں والی زندگی میں واپس چلا جائے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔گل داؤدی کی اگائی میں یہی ایک سب سے بڑا ستم ہے۔لیکن اسے محض دوسرے گملے میں لگا دینا یا اس کی مٹی کو تبدیل کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔اس کا سب سے زیادہ انحصار مٹی کی خصوصیت اور اسے کھاد دینے کے طور طریقے پر ہوتا ہے۔
بوئی لان جو کہ جھکی ہوئی گملے میں مٹی ڈال رہی تھی، بڑی آہستگی سے بوڑھا سے مخاطب ہوئی:
''اصل چیز یہ ہے کہ یہاں بے شمار پھول ہیں اور اگر کوئی پودا، اس غاروں والی حالت میں پہنچ جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔۔۔۔دادا۔آپ کو ان کی کچھ زیادہ ہی فکر لگی رہتی ہے۔اسی لیے پھولوں کا کوئی گملا آپ کے لیے بیچنا بہت ہی مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔''
بوڑھے سکالر نے مسکراتے ہوئے اپنی پوتی سے کہا۔
''ہاں اور اس کے علاوہ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی پھول خریدتا نہیں کیوں کہ میں ان پھولوں کو کبھی بیچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔خوشی اور مسرت حاصل کرنے کے لیے جو پھول اگائے جاتے ہیں وہ انمول ہوتے ہیں۔امیر لوگ جو پھول خریدتے ہیں، ان میں ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کیوں کہ خوشی ان کے رنگوں اور خوشبوؤں سے حاصل نہیں ہوتی بل کہ ان کو پروان چڑھانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں ہوتی ہے۔ایک نوخیز کونپل جو پھوٹ نکلتی ہے، ایک پتا جو نمودار رہوتا ہے، یہ چیزیں آنکھوں کے اطمینان کے لیے کافی ہوتی ہیں' اور یہ پھولوں کو محض دیکھتے رہنے سے زیادہ بہتر خوشی حاصل کرنے کی چیزیں ہیں۔یہ ہماری دولت کی متمنی نہیں ہوتیں، انھیں صرف ہماری نگہداشت درکار ہوتی ہے۔
وہ لوگ جو دل و جان سے پھولوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، وہی ان کی خوب صورتی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ظاہری خوب صورتی سے، زیادہ ان کی اندرونی خوب صورتی زیادہ قابلِ قدر

ہوتی ہے' کیوں کہ پھولوں کی روح ہوتی ہے اور کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جو لوگ ان کے لیے محض پیسے خرچ کرتے ہیں' وہ ان چیزوں کو محسوس نہیں کر سکتے۔

اور جو توجہ بوڑھا سکالر ان کو دے سکتا تھا ایسا شاید اور نہیں کر سکتا تھا۔ پھولوں میں اسے آرکڈ بہت پسند تھے اور آرکڈ کی قسم میں سے ''بے داغ دل'' کی قسم زیادہ بھاتی تھی۔ بوئی لان نے مجھے اس کی اس پسند کے بارے میں بتایا تھا اور اس بوڑھے سکالر کے پسندیدہ آرکڈ پھولوں کے بارے میں مجھے بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

''میرے دادا تھوڑے وہمی قسم کے انسان ہیں۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ اپنے آرکڈ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ مجھے چھوٹے بچوں سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھ بھال کے لیے کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو پانی دینے کے لیے وہی پانی استعمال کیا جائے جو میں اپنا منہ دھونے کے لیے استعمال کرتی ہوں۔ ہر روز صبح کے وقت، مجھے ان کا ایک ایک پتا دھونا ہوتا ہے تا کہ آرکڈ اپنی پوری خوب صورتی اور جوبن کے ساتھ دکھائی دیں۔''

میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ''جس پانی سے تم اپنا منہ دھوتی ہو بھلا وہی پانی ان کے لیے کیوں ضروری ہوتا ہے؟''

''دادا کہتے ہیں۔۔۔ آرکڈ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ آرکڈ ایک خوب صورت مخلوق ہے۔ خاموش اور خوب صورت! تم بتاؤ۔ خوب صورت مخلوق سے ان کی کیا مراد ہے؟''

میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ خوب صورت مخلوق۔ ایک خوب صورت عورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تمھارے جیسی اچھی نوجوان لڑکی! اور خاموشی سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ وہ باتونی نہیں ہوتے۔۔۔ میرا خیال ہے اس طرح وہ تجویز پیش کر رہے تھے۔ کہ۔۔۔''

بوئی لان قہقہہ لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ الفاظ بغیر کسی خاص مقصد کے محض نوجوانی کی بھولپن میں کہہ دیے تھے۔

اور اسی لمحے مجھے خیال آیا تھا کہ بوئی لان تو واقعی باغ میں کھلے پھولوں کی طرح پیاری اور خوب صورت تھی۔ جب مجھے اس کی رفاقت میسر ہوتی تھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے میں اپنے سب سے

بہترین دوستوں میں ہوں ۔لیکن یہ باتیں مجھے اس وقت سمجھ میں آئیں جب میں ذہنی طور پر پختہ ہوگیا تھااور گزرے دنوں کی غمگین اور خوش کن یادوں کے پیچھے موجود احساسات کو جاننے اور ان کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوگیا تھا ۔اوراس وقت سے میں نے آرکڈ کے پھولوں میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی ۔میں نے ان کے متعلق زیادہ معلومات اکٹھی کرنی شروع کردیں، جب مجھے معلوم ہوا کہ بوئی لان خودان کی دیکھ بھال کرتی ہےاور خاص طور پراس وقت سے میری دلچسپی بڑھ گئی، جب مجھے معلوم ہوا کہ ان کواس پانی سے دھویا جاتا تھا، جوخود بوئی لان اپنا منہ دھونے کے لیے استعمال کرتی تھی ۔پھر مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہوا، جب مجھے بالائی لان نے اس واقع کے متعلق بتایا جو بوڑھے سکالر کو پھول خریدنے والے ایک شخص کے ساتھ پیش آیا تھا۔

''اس نے 'بے داغ دل والے'' آرکڈ پھولوں کے دو گملوں کے لیے پیاسٹروں (ویتنامی روپے) کی کئی گڈیاں پیش کی تھیں ۔لیکن میرے دادا انھیں بیچنے پر رضامند نہ ہوئے ۔میرے دادا نے کئی اور عذر پیش کیےاور یوں اس پھولوں کےاس خریدار سے چھٹکارا حاصل کیا۔''

آرکڈ کے پھولوں کےصرف دو گملوں کے لیے پیاسٹروں کی کئی گڈیاں ۔۔۔۔مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ان وقتوں میں محض ایک پیاسٹر کےعوض کوئی شخص ڈھیروں چاول خرید سکتا تھا،اور یہاں وہ صرف آرکڈ کے دو گملوں کے لیے کئی بنڈل پیاسٹروں کے دے رہا تھا۔اصل میں وہ خریدار صحیح معنوں میں پھولوں کا عاشق ہی ہو سکتا تھا۔میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے قریب ہی موجود باغ کے پودوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے ،ملازم نے اپنے کام کو بیچ میں روکتے ہوئے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''پیاسٹروں کی ایک گڈی ۔۔۔ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ۔۔۔!اگر اسے آرکڈ مل جانے کی امید ہوتی تو شاید وہ اس سے زیادہ کی پیش کش کرتا ۔وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ آرکڈ خریدنا چاہتا تھا، دراصل اسے ایسا شخص کہلانے کا شوق تھا، جواس باغ کے تمام آرکڈ پھولوں کا مالک کہلوانا چاہتا تھااوراپنے بھیجنے والے کوخوش کرنا چاہتا تھا۔اس کا بیٹا شاید اس علاقے کا سب سے زیادہ خود پسند شخص تھا۔لیکن اس بوڑھے سکالر کو،ان پھولوں کوخریدنے کی پیش کش کرنا اس کی حماقت تھی ۔اگر اس نے ان پھولوں کو ویسے ہی مانگ لیا ہوتا تو شاید وہ ان میں سے کچھ لینے میں کامیاب ہو جاتا اوراس طرح سے کوئی معاوضہ بھی نہ دینا پڑتا ۔بوڑھے سکالر کے ساتھ روپے پیسے کی اہمیت کی بات کرنا بہت بڑی بے وقوفی تھی ۔اس طرح تو

اس نے اس سے انکار ہی سننا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت اس نے یہ بات کی تو بوڑھا سکالر پیے ہوئے نہیں تھا، ورنہ چھری سے، اسے اتنی مار پڑتی کہ اس سے، اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔''

اس واقعے کو سننے کے بعد بوڑھے سکالر کی عزت میرے دل میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ تب میں نے سمجھ لیا کہ میرے والد اس شخص کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تھے اور اس کے لیے وہ اچھی سے اچھی دعوت کیوں ٹھکرا دیتے تھے۔ اور یہ دعوت کسی چینی عامل جیسے اہم شخص کی بھی ہو سکتی تھی۔ بوڑھا سکالر کئی چینی عاملوں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے والد کسی اور شخص کے ساتھ وقت گزارنے سے زیادہ بوڑھے سکالر کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بات کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا۔

بوڑھے سکالر کے لیے جوں جوں میرے دل میں عزت بڑھتی جارہی تھی، آرکڈ کے گملوں میں بھی میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ بوئی لان اور میں، ہم دونوں آرکڈ کے پودوں کو پانی دینے 'ان کے پتوں کو دھونے اور انھیں گملوں میں جمانے میں زیادہ انہماک سے لگے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں آرکڈ کے پودوں کے گیلے پتوں کی چمک سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان میں ہی نازک اور معصوم پھولوں کے درمیان ایک چہرہ، جس کے گرد سیاہ بالوں کا ایک ہار سا ہوتا تھا، مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ صبح کے سورج کی روشنی میں، ان پتوں پر چمکنے والی شبنم کے قطروں کی طرح، اس چہرے پر موجود فاختہ جیسی دو خوب صورت آنکھیں جھل مل کرتی تھیں۔ میرے ذہن میں اب بھی وہ ایسے دو نازک پتلے سے ہونٹ محفوظ ہیں، جو کسی وجہ سے اپنی مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش میں بھینچے ہوئے دکھائی دیتے تھے 'اور آرکڈ کے پتوں میں چھپا ان ہونٹوں نے ایک صبح مجھ سے کہا تھا۔

''دادا'' بے داغ دل والے' ان آرکڈ کے پھولوں کے گملوں کو اس لیے زیادہ پسند کرتے ہیں کہ یہ عین ٹیٹ تہوار کے موقع پر کھلنے والے ہیں۔ اس موقع کے لیے تب وہ ساری رات ان پھولوں سے کشید کی ہوئی مٹھاس بھری خوشبو میں لپی رائس برانڈی تیار کریں گے۔ اور تب دادا اس میں سے کچھ ہمیں بھی ان پھولوں کی دیکھ بھال کے عوض عطا کریں گے۔ ایک مہینہ اور گزر جانے دو پھر تم دیکھنا کہ یہ آرکڈ کی قسم ''سفید موتی'' سے زیادہ خوب صورت انداز میں ظاہر ہوں گے!''

اس وقت یہ فاختہ جیسی آنکھیں آرکڈ کے پتوں کو اتنی محبت سے دیکھ رہی تھیں جیسے کہ باغ کے پچھلے حصے میں پودوں کی گھنی چھاؤں تلے بیٹھ کر خوشبو دار چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بوڑھے سکالر کی آنکھیں دیکھتی تھیں اور نئے شگوفوں کے پھوٹنے کی مسرت محسوس کرتی تھیں۔

ایک سہ پہر کو میں بوڑھے سکالر کے گھر گیا۔ میں آرکڈ کے پھولوں کے ان گملوں کو دیکھنے آیا تھا، جن کی دیکھ بھال میں اور بوئی لان کافی دنوں سے کر رہے تھے۔ کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ اگر کوئی معمولی سی تبدیلی تھی بھی تو وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ اگر کبھی میں ایک دن نہ آتا تو اگلے دن بوئی لان مجھے ان پودوں میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور باریکیوں کو تفصیل سے بتاتی تھی۔ قریب ہی موجود بوڑھا سکالر، اس کی باتیں سن کر خاموشی سے مسکرائے جاتا تھا، جیسے ایک دادا، اپنی پوتی کے فخریہ کارناموں کی داد دے رہا ہو۔ اب چوں کہ میں دو دن کی غیر حاضری کے بعد آیا تھا تو مجھے توقع تھی کہ بوئی لان مجھے یقیناً نئی کونپلوں کے پھوٹنے' ایک پتے کے برآمد ہونے یا مرجھانے کے متعلق یا پھولوں پر منڈلانے والی تتلیوں کی حرکات وسکنات اور اس کے علاوہ بہت سی دوسری بہت سی' چھوٹی چھوٹی حقیقی مگر شاعرانہ قسم کی جزیات سے ضرور آگاہ کرے گی۔ میں بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو میرا دل ٹیٹ کے تہوار کے نزدیک آجانے اور جو تفصیلات مجھے بوئی لان سے ملنے والی تھیں ان کی وجہ سے سینے میں تیزی سے اچھل رہا تھا۔

لیکن جوں ہی میں کورٹ یارڈ میں داخل ہوا دنگ رہ گیا۔۔۔۔ میں رک کر دیکھنے لگا۔۔۔۔ بوئی لان داخلی دروازے کے قریب ایک ستون کے ساتھ لگی خلا میں گھورے جا رہی تھی۔ میں نے کبھی اس کا اتنا زرد چہرا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے دوپہر کے سورج میں جھلسے ہوئی ہائی بسکس پھول کی طرح لگ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے سانس لی۔

''بوئی لان! کیا بات ہے۔۔۔۔ کیا ہوا ہے؟''

بوئی لان سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور سیب کے ایک پودے کے ساتھ لگ کر نہایت غم زدہ لہجے میں اس نے کہا۔

''دادا نے بیچ دیے۔۔۔۔!''

''بیچ دیے۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔؟''

وہ تیزی سے پلکیں جھپکا رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی رو پڑے گی۔

میں نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

''بھئی بتاؤ بھی کہ دادا نے کیا بیچ دیا ہے؟''

"آرکڈ کے دونوں گملے۔"

حیران ہوتے ہوئے میں نے کہا: "یہ ناممکن ہے۔کیا تم پاگل ہوگئی ہو یا دادا نے تمھارے ساتھ کوئی مذاق کیا ہے۔وہ ان پھولوں کو کبھی نہیں بیچ سکتے۔اگر انھیں ان کو بیچنا ہی ہوتا تو اسی دن وہ انھیں بیچ دیتے۔۔۔۔لیکن اب انھوں نے ان کو کیوں بیچ دیا؟"

بوئی لان نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔دادا نے انھیں اس آدمی کے ہاتھ بیچ دیا، جو چند دن پیشتر انھیں خریدنے کے لیے آیا تھا۔اگر تمھیں میری بات پر یقین نہیں آیا تو باغ کی پچھلی طرف جا کر خود دیکھ لو۔"

میں تیزی سے اس طرف گیا۔گو کہ بوئی لان نے یہ بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہی تھی لیکن پھر بھی مجھے یقین نہیں آرہا تھا کیوں کہ میں بوڑھے سکالر کی ان پھولوں کے ساتھ بے پناہ محبت کو جانتا تھا۔اس جیسا شخص تو خواہ وہ روپے پیسے کی بہت زیادہ کمی کا شکار ہو جاتا، تب بھی وہ ان پھولوں کو بیچنے کو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔اس جیسا شخص مادی ضرورتوں سے مرغوب نہیں ہو سکتا تھا اور وہ زندگی کی داخلی قدر و قیمت اور فخر کو یوں نہیں کھو سکتا تھا۔

بوڑھے سکالر کے لیے پھول بیچنا بہت شرمناک بات تھی کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک شخص تھا، جن کے لیے پھول اگانا ایک مذہب کا درجہ رکھتا تھا۔اور اس کے باغ میں، جو پھول تھے وہ بہت ہی خوب صورت تھے۔اس نے اور اس کی پوتی نے ٹیٹ کے لیے اپنے پھولوں کی بہت زور شور سے تیاری کی ہوئی تھی۔وہ اس کام کو اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ کرتا تھا اور وہ پھولوں سے ایسی محبت کرتا تھا جیسی کوئی ماں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے ضمن میں کرتی ہے۔

حالاں کہ وہ کوئی امیر کبیر شخص نہیں تھا، بس غریبوں جیسا ہی تھا لیکن اس نے اپنی گھرداری کے حوالے سے اور دوسرے اخراجات کے سلسلے میں ایسا متوازن رویہ اپنا رکھا تھا کہ سوائے کسی شدید اور اہم ضرورت کے، شاید ہی اسے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آسکتی تھی۔اور پچھلے کچھ عرصے سے تو واقعی، اس کو کسی ایسی مالی پریشانی نے نہیں گھیرا تھا۔میرا خیال تھا بوئی لان کو کوئی غلط فہمی ہوگئی تھی یا پھر یہ کہ اس کا دادا اس سے کسی قسم کا کوئی مذاق کر رہا تھا۔

لیکن گھر کے پچھواڑے پہنچنے پر میری پریشانی اس وقت بڑھ گئی، جب میں نے اسے ایک اجنبی کے ساتھ محو گفتگو پایا۔وہ اجنبی شخص پچاس سال کا ایک فضول سے چہرے والا شخص تھا، جس کا منہ اند

رے کسی سور جیسا تھا۔اس نے ایک ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔جو اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔یہ لباس اس کے جسم پر اتنا تنگ تھا کہ لگتا تھا ابھی اس کے بخیے ادھڑ جائیں گے۔اس کی توند بڑھی ہوئی تھی اس کا چہرہ بھی خاصا چربیلا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے بھی خاصے بھاری تھے۔

''جناب اگر آپ نے انھیں پچھلی دفعہ میرے ہاتھ بیچ دیا ہوتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔آپ کو اچھے دام مل جاتے اور مجھے پھول۔یعنی سودا پکا ہو جاتا۔لیکن جناب ۔۔۔۔اب تو سچی بات یہ ہے کہ میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں کہ اب میں آپ کو اس دن والی قیمت تو نہیں دے سکتا''۔

بوڑھا سکالر بڑبڑایا۔

''اچھا تو اب تم مجھے ان کی کیا قیمت ادا کر سکتے ہو؟''

''ہاں جناب ۔۔۔۔ٹھیک ہے ۔۔۔۔دیکھیں ناں اب تو خود آپ نے مجھے بلایا ہے اور اصل میں مجھے اب پھولوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔کیوں کہ پچھلی دفعہ آپ نے انھیں بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔اور مجھے کہیں اور سے خریدنے پڑے تھے ۔۔۔۔جی ہاں ۔۔۔۔''

اس نے اپنے سانس کو بحال کیا اور کہنے لگا۔

''تو اب جناب ۔۔۔۔سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ انھیں سستے میں بیچیں گے تو میں مجبوراً انھیں خرید لوں گا ۔۔۔۔اور اگر آپ اسی پرانی قیمت پر اڑے رہیں گے تو پھر تو میں معذرت چاہوں گا۔''

یہ سب کچھ کہنے کے بعد اجنبی ہنسنے لگا اور یوں اس کے بے ترتیب دانت،جن پر سونے کے خول چڑھے تھے نظر آنے لگے۔اس کے دیکھنے کا انداز،اور جس طرح وہ گفتگو کر رہا تھا قابلِ نفرت تھا۔میں جانتا تھا کہ جب وہ ''جی جناب''یا جناب عالی'' کے الفاظ ادا کرتا تھا تو وہ محض عادتاً کرتا تھا کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا،جو اپنی مقصد براری کے لیے ہمیشہ چور دروازہ استعمال کرتے ہیں اور حقیقتاً اس کے نزدیک اس بوڑھے سکالر کی کوئی عزت نہیں تھی۔اس کے چہرے پر میں نے اطمینان کی ایک لہر دیکھی،حالاں کہ میں نوجوان تھا اور زندگی کا مجھے کوئی خاص تجربہ نہ تھا لیکن پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ بوڑھے سکالر کو ایسی تجاویز بھی پیش کر رہا تھا کہ جن کی بنا پر کل کلاں کو وہ اپنا مکان تک اس کے ہاتھ بیچنے کو تیار ہو جاتا۔مجھے ڈر تھا کہ بوڑھا سکالر،اس کے ساتھ بہت بری طرح سے پیش آئے گا۔لیکن بوڑھے کو غصہ تک نہ آیا اس نے اپنے آپ پر قابو پائے رکھا۔میں دیکھ رہا تھا کہ وہ

اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے چبا رہا تھا۔تب وہ آہستہ سے بولا۔
''ٹھیک ہے تم قیمت لگاؤ۔۔۔اگر میرے لیے ممکن ہوا تو میں انھیں تمھارے ہاتھ بیچ دوں گا۔''

اس آدمی نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور عجیب انداز سے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
دیکھئے جناب۔۔۔جناب عالی بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود ہی ان کی قیمت لگائیں۔میرے لیے کچھ کہنا ذرا مشکل ہوگا۔''
بوڑھے سکالر نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیریں اور آرکڈ کے پھولوں کے دونوں گملوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''میں پانچ پیاسٹر تک ان کی قیمت کو کم کرسکتا ہوں۔اور یہ بہت زیادہ رعایت ہوگی۔لیکن چوں کہ میرے کام کی نوعیت بہت اہم ہے اور مجھے۔۔۔ہاں البتہ۔۔۔''
خریدار ایک بار پھر دانت نکالتے ہوئے ہنس پڑا۔
''جی بالکل جناب۔۔۔یہ تو ہے۔۔۔آپ جیسے لوگ جو پھولوں سے اس قدر محبت کرتے ہیں وہ تو پھولوں کو بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔دیکھیں جناب۔۔۔میرے لیے تو یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو کوئی شدید ضرورت آن پڑی ہے۔۔۔اور جناب یہی تو وجہ ہے کہ آپ نے مجھے بلا بھیجا ہے۔۔۔لیکن جناب۔۔۔اصل میں بات یہ ہے کہ قیمت تو اب بھی بہت زیادہ ہے اور اگر میں آپ کے ساتھ سودابازی کروں گا تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔۔۔تو اس لیے جناب۔۔۔بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے اجازت ہی دیں تو بہتر ہے۔''
بوڑھا سکالر حیران و ششدر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔وہ کچھ شرمندہ ہوگیا تھا اور وہ اور زیادہ شدت سے نچلا ہونٹ چبانے لگا۔یوں لگتا تھا کہ اب وہ اس شخص سے مزید کچھ نہیں کہے گا۔لیکن جب اس شخص نے اس کے سامنے جھکتے ہوئے، جانے کی اجازت مانگی تو اس نے اپنی آواز کو واضح کرنے کے لیے خواہ مخواہ کھانستے ہوئے اس سے کہا۔
''ٹھیک ہے میں دس پیاسٹر تک قیمت کو کم کردیتا ہوں''
وہ آدمی رک گیا اور اس نے جواب دیا ''ٹھیک ہے جناب۔۔۔اگر آپ رضامند ہیں تو میں ان کے تیس پیاسٹر دے دوں گا۔''

بوڑھے سکالر کا چہرہ زردہ ہو گیا ۔اس کی عینک کے شیشوں کے پیچھے میں نے اس کی آنکھوں میں بے توقیری کی جھلک دیکھی ۔۔۔۔ساتھ ہی میں نے اس کے بوڑھے دل میں تھوڑا سا لالچ اور رنج محسوس کیا۔اس کے مخاطب کے نا مہذب اور نا قابلِ برداشت رویے نے،اس کی عزتِ نفس کو بہت زیادہ ٹھیس پہنچائی تھی ۔جب اپنے قریب پڑی،ماچس کو پکڑنے کے لیے،اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ کانپ رہا تھا۔

ایک لمبی سانس لیتے ہوئے میں نے اسے کہتے سنا:

''ٹھیک ہے۔۔۔۔تم پھول لے جا سکتے ہو۔''

میرے نزدیک کھڑے ملازم نے بے صبری کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''کتنا اعلیٰ قسم کا چور ہے یہ شخص۔۔۔۔اسے ان پھولوں کی اب بھی شدید ضرورت ہے۔ پچھلی مرتبہ وہ ان کو حاصل کرنے کے لیے پاؤں تک کو ہاتھ لگانے کو تیار تھا۔اب چوں کہ اس کا پلا بھاری تھا اس لیے وہ اکڑ رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ بوڑھا سکالر اسے اس سے کم قیمت پر پھول نہیں بیچے گا اس لیے اب اس نے قیمت اور کم کرنے پر اصرار نہیں کیا۔''

جب خریدار دونوں گملے لے کر چلا گیا تو بوڑھا سکالر ایک تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا ایک مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا ۔اس نے لکڑی کی ٹرے میں پڑے چند نوٹوں کی طرف دیکھا پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔اس نے ایک لمبی سانس لی۔میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم دہرا ہوا جا رہا تھا۔

بوئی لان ایک طرف سے بوڑھے سکالر کی طرف دوڑی ہوئی آئی ۔اس نے،اس کی طرف دیکھا پھر نوٹوں کو دیکھا اور آخر میں ادھر نگاہ کی،جہاں آرکڈ کے پھولوں کے گملے ہوا کرتے تھے۔

''ٹیٹ کا تہوار برباد ہو جائے گا۔۔۔۔ٹیٹ کے لیے اب آپ کے پاس کوئی آرکڈ نہیں ہوگا۔لیکن کیوں۔۔۔۔آپ نے انھیں کیوں بیچ دیا؟''

بوڑھے سکالر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی ۔''آگ نے سارے گاؤں میں قیامت برپا کر دی ہے کیوں۔۔۔۔کسی کا باپ نہیں رہا۔۔۔۔اور کسی نے اپنا خاوند کھو دیا ہے۔''

مکان جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔۔۔۔اس صورتِ حال میں پھولوں سے لطف اندوز ہونے کی کسے فرصت ہوگی! ہمارے ہمسایوں پر جو یہ افتاد آن پڑی ہے۔۔۔۔تو کوئی کس طرح پھولوں

میں مگن رہ سکتا ہے؟''

جب اس نے مجھے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا تو یہ تم ہو مسٹر نجاک! ٹھیک ہے تم میرے ساتھ آؤ! بوئی لان ۔ مجھے میری چھڑی دے دو۔۔۔۔اور دیکھو روؤ مت!

بوڑھے سکالر نے نوٹوں کو ایک رومال میں باندھا اور چھڑی ہاتھ میں لیتے ہوئے گھر سے باہر نکل پڑا۔

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ یہ سردیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ بارش تو نہیں ہو رہی تھی لیکن اس وقت بہت تند و تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ اس وقت میں سمجھا کیوں اس نے پھول بیچ دیے تھے۔ تین دن پہلے، آگ نے اس گاؤں کا کچھ حصہ تباہ کر دیا تھا۔ اس آگ میں دو آدمی جل مرے تھے اور چار یا پانچ خاندان اپنا گھر بار اور تمام اثاثہ کھو بیٹھے تھے۔

ادھر جاتے ہوئے مجھے بوڑھے سکالر نے بتایا۔

''بے چاری بوئی لان۔۔۔۔اس کا رونا بجا ہے۔۔۔۔لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔۔پھول یقیناً خوشی دیتے ہیں'ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں'ان کی خوشبو روح کو سیراب کرتی ہے لیکن کسی کو اتنا خودغرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ پھولوں کا مذہب رکھنے والے لوگ اپنے ہمسایوں سے بھی محبت کرنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھول کبھی خودغرض نہیں ہوئے۔ وہ مرجھانے سے پیشتر اپنا رنگ اور خوشبو اس دنیا کو دے جاتے ہیں۔ خالق نے زندگی کے اصل مفہوم کو ان پھولوں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ بندوں سے محبت کیے بغیر پھولوں سے محبت کرنا بکواس ہے۔''

بوڑھا آدمی راستے میں پڑی کانٹوں بھری شاخ کو اٹھانے کے لیے جھکا۔ اس نے اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

''آگ کا شکار ہونے والے ان بدنصیبوں کی وجہ سے، میں آج کل صحیح طرح سے سو نہیں سکا ہوں۔ ان پر ٹوٹنے والی قیامت نے مجھے دکھی کر دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو آج کل میرا ہاتھ تنگ تھا۔۔۔۔اگر میں آرکڈ کے پھولوں کے یہ دو گملے نہ بیچتا تو پھر میں وقت پر رقم کا بندوبست کہاں سے کر سکتا تھا؟

پھولوں کو بیچنا ایک شرمناک بات ہے۔۔۔۔اور وہ لوگ جو دوسروں کی ضرورت سے ناجائز

فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ اس سے بھی شرمناک بات ہے۔۔۔لیکن بعض اوقات ہمیں اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پھولوں کو بیچنا پڑ جاتا ہے۔مصیبت میں مبتلا لوگوں سے یہ تو جبی برتنا بہت آسان کام ہےلیکن اس طرح ایک بیوہ اور ایک یتیم کا پیٹ تو خالی رہے گا۔ان پھولوں کو بیچ دینے سے میرے دل کو بہت تکلیف پہنچی ہے'یوں لگتا ہے کہ میں نے اپنی کوئی بہت عزیز اور پیاری چیز کھو دی ہے۔بوئی لان کا رونا بجا ہے۔۔۔لیکن جب ہمارے آل دوالے میں لوگ مصیبت میں گھرے ہوں تو ہم کس طرح پھولوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں؟''

دس سال کا عرصہ پلک جھپکنے میں گزر گیا۔بوڑھا سکالر گوین دوسرے جہاں کو سدھار گیا۔اور بوئی لان وہ بھی۔۔۔وہ اپنی بہار کے اٹھارویں سال میں تھی کہ اس کی زندگی کی خوشبو بھری ٹہنی ٹوٹ گئی۔فوراً بعد ہی ان لوگوں کا ملازم بھی ان کے پیچھے چلا گیا۔

ایک لمبی غیر حاضری کے بعد میں نے جب ان پرانی جگہوں کو دوبارہ دیکھا تو ان پرانے دنوں کے ساتھیوں کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔وہ ایک دم سے غائب ہو گئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے انھوں نے ایک ساتھ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

گھاس پھونس کی بنی وہ پرانی کاٹیج اب ویسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔باغ جو کہ اب ویرانے میں تبدیل ہو چکا تھا، پہچاننے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔لیکن ان تبدیلیوں کے بیچ 'ان چیزوں کے درمیان کھڑا ہوا میں، جو کہ اب ماضی کا حصہ بن چکی تھیں اور ہمیشہ کے لیے منظر سے ہٹ گئی تھیں، اپنے اندر کسی ایسی چیز کو ضرور محسوس کرتا ہوں جو ہمیشہ رہے گی اور جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اور یہی ہمیشہ موجود رہنے والی چیز جو میرے اندر دھڑکتی رہتی ہے، مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں دیکھتا رہوں۔۔۔ساری رات یہیں رکا رہوں اور ماضی کے باغ میں موجود آرکڈ کے پھولوں کے، ان دوگملوں کے بارے میں کہانی لکھتا رہوں۔۔۔!

☆☆☆☆

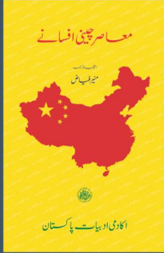
Selection From World Literature

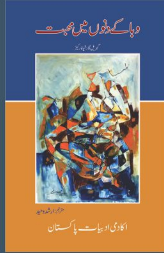
Short Stories

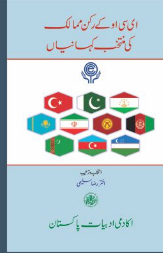
Selected & translated by

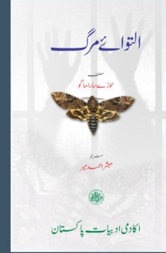
Mehmood Ahmed Qazi

اکادمی ادبیات کے دارالترجمہ کی مطبوعات

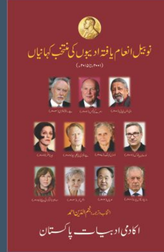


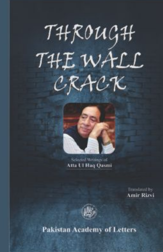


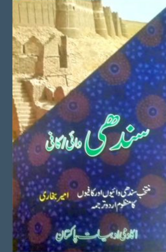












ISBN: 978-969-472-319-8

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: ar.saleemipal@gmail.com